اساسِ اسلام

www.KitaboSunnat.com

(اسلامیات لازمی)

برائے امتحان مقابلہ مرکزی C.S.S

غلام احمد حریری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ...عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے

کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

آل عمران - ۸۵

(اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا)

اساسِ اسلام

(اسلامیات لازمی)

برائے

طلبہ امتحان مقابلہ مرکزی (C.S.S.)

مطابق نصاب جدید برائے ۱۹۸۶ء و مابعد

از

غلام احمد حریری

ایم۔ اے عربی (I) ایم۔ اے علوم اسلامیہ (I) ایم۔ او۔ ایل عربی (I)

فاضل السنۂ شرقیہ — فاضل درس نظامی

(سابق) صدر شعبہ علوم اسلامیہ

زرعی یونیورسٹی فیصل آباد — اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

مندوب حکومت سعودیہ و ممبر مشاورتی بورڈ حکومت پاکستان

ناشر: پولیمر پبلیکیشنز اُردو بازار۔ لاہور فون: ۵۸۶۶۶

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جملہ حقوق بنام پروفیسر غلام احمد حریری محفوظ

نام کتاب ——— اساس اسلام

مؤلف ——— پروفیسر غلام احمد حریری

ناشر ——— ضیاء الحق قریشی (ایم اے)

تعداد اشاعت ——— ۵۰۰

کتابت ——— منشی علم الدین ۳-نزد مدینہ ٹاؤن فیصل آباد

طباعت ———

قیمت ——— ۳۵ روپے

——— دستیاب از ———

کتاب مرکز بھوانہ بازار فیصل آباد

ڈان بک ڈپو، صدر بازار راولپنڈی

محکم لائبریری مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نصاب جدید اسلامیات لازمی

کل نمبر ۱۰۰

برائے امتحان S-S-C سنہ ۱۹۸۶ء و مابعد

ایک پرچہ ۱۰۰ نمبر

باب اوّل: ۱۔ اسلام معنی و مفہوم: اسلام کے تصوّرِ دین کا تعارف اور اس کی امتیازی خصوصیات

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حلّ۔ علم کے ذرائع۔ وحی کی حقانیت اور بالادستی۔

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۴۔ اسلامی فلسفۂ حیات۔ تصوّرِ کائنات۔ تصوّرِ انسان۔ مقام انسانیت۔ انسان کا منصب خلافت۔

باب دوم: اسلام کے بنیادی عقائد:۔

(الف) توحید: وجود باری تعالیٰ۔ وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا استدلال۔ توحید کے دلائل۔ اسلام کا تصوّرِ اللہ۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی پر توحید کے اثرات۔ تعلّق باللہ اور اس کی بنیادیں

(ب) رسالت: انبیاء کی ضرورت۔ انبیاء کی بنیادی خصوصیات۔ بشریت۔ وہبیت۔ تعلیمات من جانب اللہ۔ عصمت۔ منصب ریاست۔ قابلِ اطاعت۔ شارح کتاب اللہ۔ معلّم و مُربّی۔ پیشوا اور نمونۂ تقلید۔ شارع و قانون ساز، محمد رسول اللہ سے ہمارے تعلّق کی بنیادیں۔ ایمان، اطاعت، اتّباع، محبّت۔ اسوۂ رسول اللہ۔

(ج) آخرت: اسلامی تصوّرِ آخرت۔ مادّہ پرستوں کا نقطۂ نظر اور اس کا علمی جائزہ۔ یہودیت، عیسائیت اور ہندومت کا تصوّرِ آخرت۔ اسلام کے تصوّرِ آخرت پر عقلی اور قرآنی دلائل۔ عقیدۂ آخرت کے اثرات انسانی زندگی پر۔

باب سوم: اسلام کا تصوّرِ عبادت اور اسلامی عبادات

(الف) صلوٰۃ: دین میں اس کا مقام مقصدِ حیات کی یاددہانی فرض شناسی،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تعمیرِ سیرت، ضبطِ نفس، تقویٰ، اجتماعی فوائد

(ب) زکوٰۃ : زکوٰۃ کا مقصد، تزکیہ نفس، امداد باہمی اور عدل اجتماعی۔ دین کی نصرت۔ زکوٰۃ کے مصارف اور اس کے اخلاقی و معاشی پہلو۔

(ج) صوم : روزے کا مقصد اور مقام۔ احساس بندگی۔ اطاعت امر۔ تعمیرِ سیرت۔ ضبطِ نفس۔ اجتماعی فوائد۔ تقویٰ اور پاکیزگی کی فضا۔ جماعتی احساس، امداد باہمی کی روح۔

(د) حج : حج کی اہمیت اور اس کا مقصد۔ حج کی شان جامعیت۔

باب چہارم : اسلامی نظام زندگی :۔

(۱) شریعت کے مآخذ۔ قرآن۔ سنتِ رسولؐ۔ حجیتِ حدیث و سنت۔

(۲) تہذیب اخلاق۔ تصورِ اخلاق۔ اخلاق و ایمان کا باہمی تعلق، تعمیرِ سیرت کے اسلامی اصول اور طریقے۔

(۳) تدبیرِ منزل : خاندان کا نظام۔ افرادِ خاندان کی ذمہ داری اور باہمی تعلق۔ نظامِ معاشرت۔ نظامِ قانون و عدل۔

(۴) تعلیم : تعلیم کی اہمیت۔ تعلیم کا مقصد، تعلیم کے اسلامی اصول و مسلمانوں کی تعلیمی روایات۔

باب پنجم

(۵) اسلام کے معاشی اصول : تصورِ معیشت۔ پیدائش اور صرف دولت کے اصول۔ کفالتِ عامہ۔ زکوٰۃ۔ سود۔ اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں۔

(۶) اُمتِ مسلمہ : ملت اسلامیہ کا مقصد اور منصب

(۷) اسلامی ریاست کی ضرورت : اسلام کے اصولِ حکمرانی۔ قیامِ پاکستان کے محرکات۔ تاریخ تحریک پاکستان۔ نظریۂ پاکستان اور اس کے تقاضے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فہرست مندرجات

مضمون	صفحات
افتتاحیہ	۱
باب اوّل	۳
۱۔ اسلام معنی و مفہوم	۴
تصوّرِ دین کا تعارف	۶
اسلام کی امتیازی خصوصیات	۹
۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل	۱۴
علم کے ذرائع	۱۵
آغازِ وحی	۱۸
حقیقتِ وحی	۱۹
انقطاعِ وحی	۲۰
وحی کی حقّانیّت	۲۱
زندگی بنیادی مسائل اور اسلام	۲۲
کائنات کی حقیقت	۲۳
۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام	۲۶
مذہب کی غرض و غایت	۲۷
مذہب کا ارتقاء	۳۰
مذہب کی اہمیّت	۳۱
فطری جذبہ	۳۲
مذہبی جذبہ کی ہمہ گیری	۳۳
مناظرِ قدرت میں تدبّر	۳۴
انسان و حیوان میں فرق و امتیاز	۳۵
مشترکہ خصوصیّات	۳۶
مذہبی جذبہ کی تسکین	۳۷
مذہب ایک ابدی صداقت ہے	۳۸
انسانی زندگی میں مذہب کا مقام	۳۹
۴۔ اسلامی فلسفۂ حیات	۴۱
تصوّرِ کائنات	۴۳
اسلامی تصوّر کی توضیح	۴۴
اسلام کا تصوّرِ انسان	۴۵
مقامِ انسانیّت	۴۸
انسان کی عظمت کے وجوہ	۴۹
عظمتِ انسان اور احادیثِ نبویہ	۵۰
انسان کا منصبِ خلافت	۵۲
اسلامی نظریہ کی افادیّت	۵۴
باب دوم	۵۶
اسلام کے بنیادی عقائد	۵۷
اسلامی عقائد عقل کی کسوٹی پر	۵۹
۱۔ توحید	۶۴
وجودِ باری تعالیٰ	۶۷
وجودِ باری تعالیٰ پر قرآن کا استدلال	۷۳
توحید کے دلائل	۷۷
اسلام کا تصوّرِ اللہ	۸۲
صفاتِ باری تعالیٰ	۸۵
عقیدۂ توحید کے تقاضے	۸۶
انفرادی زندگی پر توحید کے اثرات	۸۷
عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی	۹۰
۲۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں	۹۲
دیگر اہلِ مذاہب کا زاویۂ نگاہ	۹۳

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضمون	صفحات
تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں	۹۴
پہلی بنیاد ایمان	۹۴
دوسری بنیاد اطاعت	۹۶
تیسری بنیاد اخلاص و محبت	۹۷
۳۔ رسالت	۱۰۰
انبیاء کی ضرورت	۱۰۰
انبیاء کی بنیادی خصوصیات	۱۰۳
بشریت	۱۰۳
وھبیت	۱۰۴
تعلیمات من جانب اللہ	۱۰۵
عصمت	۱۰۶
ہر قوم کے لئے نبی	۱۰۷
منصب رسالت	۱۰۷
شارح کتاب اللہ	۱۰۹
معلم و مربی	۱۱۰
پیشوا و نمونۂ تقلید	۱۱۱
شارع اور قانون ساز	۱۱۲
قاضی اور حکم	〃
رسول اللہ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	۱۱۳
۱۔ ایمان	۱۱۴
۲۔ اطاعت	۱۱۵
۳۔ اتباع	۱۱۶
۴۔ محبت	۱۱۷
اسوۂ رسول اللہ	۱۱۸
۴۔ اسلامی تصورِ آخرت	۱۲۳
ہندو مت کا تصورِ آخرت	۱۲۷
یہود و نصاریٰ کا تصورِ آخرت	۱۲۹
اسلامی عقیدۂ آخرت	۱۳۰
قرآن کا طرزِ استدلال	۱۳۳
قرآنی دلائل	۱۳۵
عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات	۱۳۶
باب سوم	۱۴۱
اسلام کا تصورِ عبادت	۱۴۲
۱۔ صلوٰۃ	۱۴۷
تعمیرِ سیرت	۱۴۸
ضبطِ نفس اور تقویٰ	۱۴۹
اجتماعی فوائد	۱۵۰
نماز کے معاشرتی و اخلاقی حکم و مصالح	۱۵۲
طہارت و پاکیزگی	۱۵۳
سحر خیزی۔ تربیت جہاد	۱۵۴
نظم جماعت مساوات	۱۵۵
۲۔ زکوٰۃ	۱۵۷
زکوٰۃ کی اہمیت	۱۵۷
نصاب زکوٰۃ	۱۶۰
اسلام کا اقتصادی نظام اور زکوٰۃ	۱۶۱
اشتراکیت کا علاج	۱۶۳
اقتصادی فوائد	۱۶۴
زکوٰۃ معاشی نقطۂ نظر سے	۱۶۵
۳۔ صوم	۱۶۷
روزے کا مقصد	۱۶۷
تعمیرِ سیرت	۱۶۸
ضبطِ نفس	۱۶۹
انفرادی اثرات	۱۷۰
اجتماعی فوائد	۱۷۱
امدادِ باہمی کی روح	۱۷۲
۴۔ حج	
تاریخ کعبہ	۱۷۴
مناسکِ حج	۱۷۷
طواف۔ حجرِ اسود	۱۷۸
وقوفِ عرفہ	۱۷۹
حج کی حقیقت	۱۸۰

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضمون	صفحات
حجّ کی جامعیت	۱۸۱
روحانی و اخلاقی فوائد	۱۸۲
ارکانِ اسلام پر ایک نظر	۱۸۴
باب چہارم	
اسلامی نظامِ زندگی	۱۸۶
۱۔ شریعتِ اسلامی کے مآخذ	۱۸۷
شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری	۱۸۸
شریعتِ اسلامی کے مصادر	۱۹۱
ماخذِ اوّل الکتاب	۱۹۲
قرآن، موضوعات، مقصد اور اندازِ تخاطب	۱۹۴
تدوین، جمع و ترتیب اور حفاظت	۱۹۷
ماخذ دوم السنّہ	۲۰۱
حجیّتِ حدیث و سنّت	۲۰۲
اندرونی شہادت	۲۰۳
اطاعت	۲۰۷
خارجی شہادت	۲۰۹
کتابت، حفاظت	۲۱۲
۲۔ تہذیبِ اخلاق	۲۱۸
اسلام کا تصوّرِ اخلاق	۲۱۸
قوّتِ نافذہ محرّکات	۲۲۲
اخلاق و ایمان کا باہمی تعلّق	۲۲۳
اسلامی تصوّر کی امتیازی خصوصیات	۲۲۶
تعمیرِ سیرت کے اسلامی اصول اور طریقے	۲۲۹
رسول اکرمؐ بحیثیت معلّمِ اخلاق	۲۳۰
حضورؐ کی سیرت کے اثرات و نتائج	۲۳۳
صحابہ کرام کی ایمانی تربیت	۲۳۳
امانت و دیانت	۲۳۴
۳۔ تدبیرِ منزل	۲۳۶
معاشرتی زندگی	۲۳۶
خاندان کا نظام	۲۳۸
معاشرتی اصلاح	۲۴۰
نظامِ معاشرت کی بنیادیں	۲۴۱
رشتۂ نکاح	۲۴۳
افرادِ خاندان کی ذمّہ داری	۲۴۴
حدود و تعزیرات	۲۴۷
نظامِ قانون و عدل	۲۴۸
عدل و مساوات اور اسلام	۲۴۸
۴۔ تعلیم	۲۵۱
تعلیم کا تصوّر اور اسکی اہمیت	۲۵۱
مقصدِ تعلیم	۲۵۴
تعلیم کے اسلامی اصول	۲۵۶
انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن	۲۵۸
علم کی وحدت اور ہم آہنگی	
مسلمانوں کی تعلیمی روایات	۲۶۱
دورِ نبوی میں تعلیمی روایت	۲۶۱
ادوارِ مابعد	۲۶۲
برِّاعظم میں تعلیمی روایت کا ارتقاء	۲۶۴
باب پنجم	۲۷۱
۱۔ اسلام کے معاشی اصول	۲۷۲
تصوّرِ معیشت	۲۷۲
پیدائش اور صرف دولت کے معاشی اصول	۲۷۴
معاشی جدّوجہد اور اس کا مقصد و مقام	۲۷۵
حلال و حرام کی تمیز	۲۷۹
حرمتِ سود	۲۸۰
تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ	۲۸۱
باہمی رضامندی	۲۸۲

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مضمون	صفحات
اسراف کی بندش	۲۸۳
اِرتکازِ دولت کی مُمانعت	۲۸۳
قانون وراثت	۲۸۵
ملکیت وتصرّف کا حق	۲۸۶
۲-کفالت عامّہ	۲۸۸
اسلامی ریاست کی معاشی ذمّہ داریاں	۲۸۸
خلفاء کا طرزِ عمل	۲۹۰
مَعاشی ترقی کا اہتمام	۲۹۴
تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا	۲۹۶
۳-اُمّتِ مُسلمہ	۳۰۴
مِلّت اسلامیہ کا مقصد اور منصب	۳۰۴
شہادتِ حقّ	۳۰۶
قولی شہادت	۳۰۷
عَملی شہادت	۳۰۸
۴-اسلامی ریاست کی ضرورت	۳۱۰
اسلام کے اصُولِ حکمرانی	۳۱۸
اصولی اور نظریاتی ریاست	۳۱۸
شورائی اور جمہوری ریاست	۳۲۱
فلاحی ریاست	۳۲۷
مُعلّم اور داعی ریاست	۳۳۲
۵-قیامِ پاکستان کے محرّکات	۳۳۵
جِدّوجہدِ پاکستان کی غرض	۳۳۵
پاکستان کی اساس	۳۳۶
قراردادِ مقاصد	۳۳۷
نظریۂ پاکستان	۳۳۹
۶-تاریخِ تحریکِ پاکستان	۳۴۲
اسلامی معاشرے کا قیام	۳۴۲
راجہ داہر کے مظالم	۳۴۳
اِشاعتِ اسلام اور صوفیاء	۳۴۴
مسلمانوں کا سیاسی اِنحطاط	۳۴۵
مُجدّدِ الف ثانی کی تحریک	۳۴۶
اورنگ زیب عالمگیر کی تبلیغی مساعی	۳۴۷
شاہ ولی اللہ اور مسلم معاشرے کی تشکیلِ نَو	۳۴۸
حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار	۳۴۸
مُسلم اقتدار کا خاتمہ	۳۴۹
مُسلم ثقافت کی بربادی	۳۵۰
نظریۂ پاکستان اور اُس کے تقاضے	۳۵۱

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

افتتاحیہ

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جس کا مقصدِ وجود ہی اقامتِ دین ہے۔ مقامِ افسوس ہے کہ آغازِ قیام ہی سے اس مملکت کے اربابِ حل و عقد نے اس کی غایتِ تخلیق کو فراموش کئے رکھا۔ حتیٰ کہ چالیس سال کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود اس سمت ایک قدم بھی اُٹھنے نہ پایا۔ دین اور اسلامی تہذیب سے سرد مہری بڑھتے بڑھتے اب ایک ایسے مزمن مرض کی صورت کر چکی ہے کہ اگر اس کی تلافی جلد نہ کی گئی تو ملت کی بقاء دشوار ہے۔ نہ ایمان پاس رہے گا نہ ملک، اور حصولِ حکومت سے جو مادّی منافع بعض لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں وہ تو حباب آسا کچھ دیر کے ہی مہمان ثابت ہوں گے ملتوں میں عزم اور زندگی کی خواہش ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر مقصدِ حیات ہی ضائع ہو جائے اور اس کی جگہ مال و دولت کی ہوس لے لے تو پھر زندگی کے دن بھی لمبے نہیں ہوتے۔

پاکستان کی موجودہ حکومت کے سایۂ عاطفت میں اگرچہ کوئی قابلِ ذکر دینی و ملی کام نہیں ہوا تاہم یہی غنیمت ہے کہ اس کے دَور میں علوم اسلامیہ اور مطالعۂ پاکستان کے مضامین لازمی حیثیت سے ڈگری کی سطح پر منظور کئے گئے۔ اگر پڑھانے والا ان مضامین کے مندرجات کی صداقت کو قلب و ذہن سے تسلیم کرتا ہو اور اس کی شخصیت میں بھی اس کی جھلک نمایاں ہو تو اس کی زبان حق نشان سے نکلا ہوا تیر کبھی خطا نہیں جا سکتا۔ بنابریں یہ بات بھی حکومت اور بطور خاص پبلک سروس کمیشن کے اربابِ بست و کشاد کے فرائض میں شامل ہے کہ اسلامیات کے اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ پیش ہونے والا امیدوار ذہانت و فطانت اور معلوماتِ عامہ کے پہلو بہ پہلو اس مضمون کے مشتملات کو دل سے مانتا بھی ہے یا نہیں اور اس کی شخصیت کہاں تک اس مضمون کی آئینہ دار ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پاکستان میں بھی موجودہ بنگلہ دیش اور سابق مشرقی پاکستان کا طرزِ عمل دہرایا جا رہا ہے، جہاں ہندو اساتذہ اسلامیات کی تعلیم دیتے تھے۔

سنٹرل سپیریر سروسز آف پاکستان CENTRAL SUPERIOR SORVICES OF PAKISTAN کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امتحان میں بھی اسلامیات لازمی کا ایک پرچہ شامل ہے جس کے جدید نصاب کے مطابق یہ کتاب تالیف کی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے نوجوان آگے چل کر کلیدی آسامیوں پر فائز ہوں گے اور ملک کی عنانِ اقتدار انہی خوش نصیب اصحاب کو تفویض کی جانے والی ہے۔ لہٰذا ان اصحاب کا اگر عالم فاضل نہیں تو کم از کم دین اسلام کی مبادیات سے پوری طرح آگاہ و آشنا ہونا از بس ناگزیر ہے اور اگر اس ملک کی قسمت میں اقامتِ دین کا فریضہ مقدر ہو چکا ہے اور مستقبل قریب میں اس کی قسمت کا ستارہ جاگنے والا ہے تو پھر دین اسلام کے مبادیات اور عقائد و ارکان سے پوری واقفیت حاصل کئے بغیر ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں۔ بارہا مشاہدہ میں آچکا ہے کہ اس زمرہ کے بعض اصحاب ترقی کرتے کرتے انتہائی ذمہ دار مناصب پر فائز ہو جاتے ہیں، مگر جب دین کے بارے میں انہیں گفتگو کرنا پڑ جاتی ہے تو ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتے ہیں اور غلط تلفظ کے باعث شدید ندامت سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہماری سول سروس جس قدر دیندار صالح، امانت و دیانت، فرض شناسی اور اخلاق حسنہ کے اوصاف سے متصف ہوگی پبلک اسی قدر ان سے اچھا اثر قبول کرے گا۔ اگر "اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ" (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں) کا مقولہ صحیح ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی عوام اپنے حکام بالا کے رنگ میں نہ رنگے جائیں۔

یہ کتاب اسی مقصد کے پیش نظر تالیف کی جارہی ہے۔ اس میں تصنیف کم اور تالیف و تدوین و اخذ و اقتباس کا عنصر غالب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ طلبا کے ہاتھ میں ایک ایسی کتاب دے دی جائے جو مجوزہ نصاب کی جامع ہونے کے ساتھ ساتھ بھروسہ کے لائق ہو۔ جس کا مواد رطب و یابس اور ناقابل اعتماد ذرائع پر مبنی ہونے کے بجائے کتاب و سنت سے ماخوذ ہو کہ پڑھنے والا اس کی صحت پر پوری طرح اعتماد کر سکے۔ اکثر جگہ ماخذ کا نام تحریر کر دیا ہے۔ سلفی نظریہ حیات سے الترا استفادہ کیا جس کے لئے میں اس کے فاضل مرتب کا صمیم قلب سے سپاس گزار ہوں۔ بارگاہ ربانی میں دعا ہے کہ میں حقیر کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

ڈی-۶۱ پیپلز کالونی
فیصل آباد
فون نمبر ۴۵۸۸۹

غلام احمد حریری
یکم نومبر ۱۹۸۶ء

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

۱۔ اسلام معنی و مفہوم

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حلّ

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۴۔ اسلامی فلسفۂ حیات

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ اسلام

معنی و مفہوم

لفظِ اسلام عربی زبان میں مصدر ہے جس کے معنی حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اطاعت کرنا، جھکنا، سرِ تسلیم خم کرنا۔

۲۔ امن و آشتی اور سلامتی

۳۔ اپنے آپ کو کسی کی تحویل میں دے دینا۔

قرآن کریم اسلام کے بجائے "الاسلام" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد اللہ کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کرنا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا اور اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کر دینا ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا ضابطۂ زندگی پیش کرتا اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے۔ اس لئے کہ اللہ کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام اسلام ہے۔ اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کے نتیجہ میں زندگی کا جو نقشہ قائم ہوگا وہ امن اور سلامتی کی نعمتوں سے مالا مال ہوگا۔ اس میں قلب کو اطمینان ہوگا، اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حقیقی امن و سکون قائم ہوگا۔ نیز اس زندگی کے بعد بھی انسان کو اُس ابدی زندگی میں امن و سلامتی میسّر آئے گی۔

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لئے جس طریقِ فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو قبول کرے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل کو چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کرے۔ اسی چیز کو قرآن "الاسلام" سے تعبیر کرتا ہے۔ درحقیقت یہ کوئی جدید مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے چودہ سو سال پہلے عرب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو۔ بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز اللہ نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لئے صرف یہ "الاسلام" ہی ایک صحیح طرزِ عمل ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی اللہ کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے مامور ہوئے ہیں اُن سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی "الاسلام" کی طرف رہی ہے جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی طرف بالآخر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔

یہ اور بات ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے ایجاد کر لیا۔ اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف نظامات دوسرے ناموں سے بنائے ہوں لیکن حضرت موسیٰ و عیسیٰ اور دوسرے تمام انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آئے تھے وہ خالص اسلام تھا۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (آل عمران ۱۹)	(بے شک اللہ کے نزدیک تو اصل دین اسلام ہے)
"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" (آل عمران - ۸۵)	اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ:

نوعِ انسان کے لئے اللہ کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریق زندگی ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریق زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے جس پر چل کر وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر اُن کا کوئی حل واضح طور پر نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیئے جس پر وہ ان معلومات کو منظم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی تو ہے مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کا گھریلو زندگی کے لئے، خاندانی تعلقات کے لئے، معاشی معاملات کے لئے، ملکی انتظام کے لئے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لئے بھی ایک راہ درکار ہے جس پر وہ محض ایک شخص ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ اس کے مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ اُن تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کیا ہے۔

یہ ہے اس طریق زندگی یا نظام زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجتمند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اگر انسان اللہ کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے اس نوعیت کا ایک دین بنانا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین کو پیش کر رہے ہیں یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لئے انسان ایک دین کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافی، کسی کا طبقاتی، مگر ایسا کوئی دین نہیں جو تمام انسانی ضروریات کا کفیل ہو سکے۔

۲۔ اسلام کے تصورِ دین کا تعارف

دین کا لفظ عربی زبان میں چار بنیادی تصورات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے :-

(۱) کسی صاحبِ اقتدار کا غلبہ و تسلط۔

(۲) صاحبِ اقتدار کے آگے جھکنے والے کی اطاعت اور بندگی۔

(۳) قاعدہ و ضابطہ جس کی پابندی کی جائے۔

اہل عرب اس لفظ کو انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لئے اور کبھی دوسرے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے مناسب پا کر اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظامِ زندگی کی نمائندگی کرتا ہے جس کی ترکیب چار اجزاء سے ہوتی ہے :-

(۱) حاکمیت و اقتدارِ اعلیٰ (۲) حاکمیت کے مقابلہ میں تسلیم و اطاعت۔

(۳) وہ نظامِ فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیرِ اثر بنے (۴) جزا و سزا جو اقتدارِ اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی اطاعت کے صلے میں یا سرکشی کی پاداش میں دی جائے۔

قرآن کبھی دین کا اطلاق پہلے اور دوسرے معنی پر کرتا ہے، کبھی تیسرے اور چوتھے معنی پر۔ کہیں "الدین" بول کر یہ پورا نظام اپنے چاروں اجزاء سمیت مراد لیتا ہے۔

دین ایک جامع اصطلاح : یہاں تک تو قرآن اس لفظ کو قریب قریب انہی معانی میں استعمال کرتا ہے، جن میں یہ اہل عرب کے یہاں بولا جاتا تھا لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لفظ دین کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا اور اس سے ایک ایسا نظامِ زندگی مراد لیتا ہے، جس میں انسان کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کرے۔ اس کے احکام و قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اس کی اطاعت پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر سزا سے ڈرے۔ دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔

مندرجہ ذیل آیات میں دین سے پورا نظامِ زندگی اپنے تمام اعتقادی، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت مراد ہے :-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۱) هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔ (التوبہ ۳۳)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسولوں کی صحیح رہنمائی اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے۔

(۲) وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" (الانفال ۳۹)

اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین بالکلیہ اللہ ہی کا ہو جائے۔

دنیا میں اس وقت مذہب کے تین مختلف تصور پائے جاتے ہیں:

(ا) ایک تو یہ کہ دنیا انسان کے لئے حقیقتاً ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے، جب وہ اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے یعنی وہ دنیا کو چھوڑ کر بستیوں سے دُور ایک گوشے میں بیٹھ کر اللہ سے لو لگائے۔ اور دنیا جہان کے سارے بکھیڑوں سے آزاد ہو کر خدا کی جناب تک رسائی حاصل کرے۔ دین اور خدا پرستی کے اس نظریے کا نام "رہبانیت" یا "یوگ" ہے۔

(ب) دوسرے تصور کی رو سے انسان کو دنیا سے منہ موڑنے اور نفس کشی کی حاجت نہیں بلکہ اسے دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلّی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنا چاہیئے۔ جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے انسان صرف انفرادی زندگی میں دین کا پابند ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ خود مختار ہے کیونکہ "عبادت" فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ نیز دین انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ چنانچہ عام دنیاوی اور اجتماعی وسائل میں انسان آزاد ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے اور اسے "ادھوری دین داری" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(ج) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی اور نفس کشی دونوں غلط ہیں اور دین و بندگی کو صرف نجی اور انفرادی معاملہ تصور کرنا بھی بالکل غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں دین کا پابند اور بندگی کا محتاج ہے اسے جتنی قوتیں دی گئی ہیں وہ صرف بندگی کے لئے عطیہ ہیں۔ یعنی نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا جائے نہ ان کو کچلا جائے۔ صحیح دین داری اور خدا پرستی یہ ہے کہ انسان زندگی کا ہر لمحہ احکام الٰہی کے تحت گذارے اور دنیوی زندگی کا پورا نظام مالک حقیقی کا پسندیدہ ہو یہ اسلام کا تصور دین ہے۔

اسلام کا یہ تصور دین رہبانیت سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں کھاتا۔ انسان کے رب نے جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقی فرماں روا اور قانون ساز بھی ہے، پوری زندگی کے لئے احکام و قوانین مقرر کئے ہیں۔ اس کے بنیادی عقائد و اعمال مثلاً نماز، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لئے اجتماعیت کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اجتماعی فضا سے ہٹ کر بطور خود نماز روزے کی ادائیگی سے وہ تمام فوائد و مصالح ہرگز نہ حاصل ہو سکیں گے جو شریعت میں مقصود ہیں اور اسلام کے پورے احکام کی بجا آوری اجتماعیت کے بغیر ممکن نہ ہوگی۔ نیز قرآن و حدیث میں اس سے صاف برأت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ | (اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے)

ایک دوسری حدیث میں ہے "ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص دین ابراہیمی عطا فرمایا ہے"۔ اسی طرح قرآن میں ہے:

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ۔ (الحدید۔ ۲۷) | ("اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہم نے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔")

گویا نہ صرف اسلام میں بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح دین کا مزاج رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا اور اس کے بنیادی عقائد و اعمال اس کے مخالف ہیں، ٹھیک یہی حال اس کی تفصیلی تعلیمات کا بھی ہے اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس طرز عمل کی ممانعت فرمائی ہے جس میں رہبانیت کی بو بھی اور یا اس کی طرف لے جانے والا تھا۔ مثلاً نکاح سے بچنا، ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا، قوت گویائی معطل رکھنا، مسلسل شب بیداریاں یا وہ عبادت جس سے جسم آرام اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں وغیرہ

رہبانیت کی طرح دوسرا مذہبی تصور بھی، جسے ہم نے "ادھوری دین داری" سے موسوم کیا ہے، اسلام کے تصور سے بالکل مختلف ہے، کیوں کہ دین بندے اور خدا کا نجی معاملہ نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات انفرادی زندگی کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز روزے کا حکم اور اخلاقیات کی تلقین بس کافی تھی لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام کے نزدیک "دین" انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں ہادی اور واجب الاتباع ہے۔ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے اور ان کے کسی بھی حکم کو دین سے زائد نہیں خیال کیا جا سکتا۔ یوں بھی سوچیئے تو اس طرح کے خیال میں کوئی معقولیت نہ مل سکے گی۔ "اسلام" کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت ہے تو اس کے کسی حکم کو آخر دائرہ اطاعت سے کس طرح باہر رکھا جائے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غرض اسلام نہ تو رہبانیت کو درست قرار دیتا ہے اور نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے۔ بلکہ وہ تو ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے۔ اور ملّت اسلامیہ یا امت مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جس کا مسلک اسلام کے دیئے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کی پوری عمارت کی تعمیر ہے، یہ مسلک حیات فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالم گیر اور جہانی ہے، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے بلکہ اسلام دراصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے اور مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔

اب اس میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اسلام کا قبول کر لینا نجات اُخروی کا باعث ہے اور آخرت کی ساری فلاح و کامرانی ایک "مسلم" کے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

(البقرۃ - ۱۱۲)

ہاں جس نے اپنا رُخ اللہ کی طرف کر دیا (یعنی اسلام قبول کر لیا) اور وہ نیکو کار رہا تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا ثواب ہے۔ اور ان (اسلام قبول کر لینے والوں) کو نہ کوئی خوف ہی ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات

سابقہ ابواب کے مطالعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ "اسلام" دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز ہے۔ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے۔ سارے انسانوں کے لئے، اللہ کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لئے اس کی پیروی ضروری ہے۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ایسی جامع تھی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لئے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لئے کافی و شافی ہے۔

۱۔ عالمگیر رسالت :- سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ کسی زمین کے خاص خطّے یا کسی ایک قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لئے اور تمام انسانوں کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

قرآن کریم میں فرمایا:-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" (سبا - ۲۸) | (اے محمدؐ ہم نے تمہیں تمام لوگوں کیلئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔)

حضورؐ نے خود بھی بحکم خداوندی اس کا اعلان کیا تھا۔

"يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (الاعراف - ۱۵۸) | (لوگو! میں تم سب لوگوں کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔

یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ کے ساتھ خاص ہے۔ آپ سے پہلے جو انبیاء آئے تھے اُن میں سے کسی کی حیثیت یہ نہ تھی چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا:

۲۔ خاتم الانبیاء

"كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً" (صحیح بخاری و مسلم) | محمدؐ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کیلئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضورؐ کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اُسی طرح ہمیشہ کے لئے بھی ہے۔ آپؐ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا اور اب قیامت تک کوئی رسول نہ آئے گا۔

"وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" (الاحزاب - ۴۰) | (بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں)

خود حضورؐ کے اپنے الفاظ ہیں:۔

"خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ" (صحیح بخاری و مسلم) | (مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور میرے ذریعے رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا)

اس کے مقابلے میں دوسرے انبیاء کی رسالت کا معاملہ کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں۔

۳۔ تکمیل دین

پھر جیسا کہ قبل ازیں کہا گیا آپؐ جو دین و شریعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے۔ جب کہ پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ یہ شرف اللہ نے صرف اسلام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ "دین کامل" ہو۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدۃ - ۳) | لوگو! آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے اسلام کو پسند کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح و ہدایت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لئے مخصوص تھا اور جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر تھا لیکن جب اللہ کی حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے کے لئے ہو اور ہمیشہ کے لئے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں قرآن کی مذکورہ بالا آیت اس فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔

۴۔ محفوظ کتاب

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ جوں کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی، جس پر خود قرآن، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں۔ اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو زندہ ہے۔ کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ان صفات کی حامل ہو۔

امتیازی حیثیت کے تقاضے

رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں:۔

چنانچہ اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اور اب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (آل عمران۔ ۱۹) | (بے شک اللہ کے نزدیک مقبول دین تو صرف اسلام ہے)

۱۔ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں:

اس لئے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے ورنہ:

"وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ" (آل عمران۔ ۸۵) | اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

کیوں کہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لئے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ" (النساء۔ ۶۴) | (ہم نے جو رسول بھیجا صرف اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس لئے حضورؐ کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اس کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپؐ کے نہیں بلکہ اس حاکم حقیقی کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپؐ کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

۲۔ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے!

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی موجود ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک بھی صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اس کا بالکل منطقی یہ تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہود اور نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے کیوں کہ وہ خود صاحب کتاب تھے اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف آپؐ ان سے صرف یہ کہتے کہ محض تورات اور انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپؐ نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور اُن کے لئے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان مشرکوں کے لئے ضروری قرار دیا تھا۔

نہ صرف یہ کہ آپؐ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتکب قرار دیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ "بدترین کفر" اور انہیں صرف کافر ہی نہیں "پکا کافر" کہا گیا۔ قرآن میں فرمایا:۔

" جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض رسولوں کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوئی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (النساء۔ ۱۵۰-۱۵۱)

دعوتِ اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدتِ ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی اللہ ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے؟ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لئے کیوں ضروری ہوا؟ وہ اپنی جگہ حق ہے اور یہ اپنی جگہ حق ہے۔ لیکن ان کے اس فلسفے کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اُسے صاف طور سے "کفر" کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ اور انہیں "یہ بھی حق ہے وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) ٹھہراتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مُردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے ؟ یہ صورتِ حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہر شخص کے لئے اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی اور دین اللہ کے حضور منظور شدہ اور قابلِ قبول نہیں رہ گیا ہے تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نجات ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابلِ قبول ٹھہرا چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا ؟ چنانچہ "وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ" فرمانے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ

"وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" (اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا)
(آل عمران - ۸۵)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس فیصلۂ خداوندی کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا :-

"قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمّت (گروہِ انسانی) میں سے جس کسی بھی شخص تک (مثلاً یہودی یا نصرانی تک) میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ جہنّمی ہوگا۔" (صحیح مسلم)

اس فیصلۂ ربانی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں آتی ہیں۔ بلکہ ایک حیثیت سے دوسری قوموں اور ملّتوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن نے صاف و صریح لفظوں میں "اہلِ کتاب" کہا ہے۔ اور جن کو کسی نبی کا اُمّتی اور کسی آسمانی شریعت کا حامل قرار دیا ہے۔ اب اگر ایسی ملّتوں کے افراد کے لئے بھی رسالتِ محمدی کی پیروی شرطِ نجات ہے تو عقل کہتی ہے کہ ان قوموں اور ملّتوں کے لئے اس کا شرطِ نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا، جن کو قرآن نے صاحبِ کتاب و شریعت کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔

غرض جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دوٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لئے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو اور اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمّتِ مسلمہ کی ہے۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمان اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے سامنے اس حق کی شہادت دیں۔

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ انسانی زندگی کے بنیادی مسائل اور اس کے مختلف حلّ

انسان کی لوحِ ذہن پر چند بنیادی سوالات اُبھرتے ہیں جن کے حلّ پر انسانی زندگی کا مدار و انحصار ہے۔ وہ بنیادی سوالات یہ ہیں :-

(۱) اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے ؟

(۲) کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے ؟

(۳) اگر ہے تو کس قسم کی ہے اور اس کے لئے موجودہ زندگی میں کیا کرنا چاہیئے ؟

(۴) یہ کائنات بحیثیت مجموعی کیا ہے اور اس کو ایک خاص نظام کے مطابق چلانے والا کون ہے ؟

(۵) اُس ذات کی صفات کیا ہیں اور اس کا انسانوں کے ساتھ کیا تعلق ہے ؟

(۶) اس کائنات میں انسان کی حیثیت کیا ہے اور کیا وہ خود مختار ہے یا کسی کا ماتحت ؟

یہی سوالات ہیں جن کا جواب مذہب دیتا ہے۔ یہی پیاس ہے جس کے پانی کی تعبیر دین سے کی جاتی ہے، یہی بھوک ہے جس کی خوراک مذہب کے یہاں سے مل سکتی ہے۔ انہی سوالات کا حل کرنا مذہب کی اصلی غرض و غایت ہے۔ تاہم فلسفہ بھی انہی مسائل سے بحث کرتا ہے اور تمدن بھی انہی بنیادوں پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے۔ ان سوالات کا جواب دیئے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں، نہ تمدن کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ ہر تمدن خواہ کتنا ہی سطحی ہو ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور رکھتا ہے جو اس کی عمارت کے لئے بنیاد کا کام دیتا ہے۔ اسی سرچشمے سے اس کی زندگی کی ساری نہریں پھوٹتی ہیں اور اُن کے رُخ متعین ہوتے ہیں۔ سیاست ہو یا معاشرت، تہذیب و شائستگی ہو یا علم و فلسفہ غرض اندرونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اس بنیادی تصوّر کا عکس ہوتے ہیں۔

جہاں ان سوالات کا جواب دینا اہل فلسفہ اور عقلاء کا مشغلہ ہے وہاں ان کے حل سے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا ہر خاص و عام کے لئے ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص ان سوالات کے حلّ سے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرلے، اس کے لئے کوئی عمل ممکن نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ زندگی اور موت کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کریں اور اس کے باوجود آپ کے امتحان منطقی ربط اور عملی حکمت پر مشتمل ہوں۔ آپ اگر اپنی مرضی سے کوئی کام انجام دے رہے ہیں تو یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی مقصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگا۔ یہ مقصد یا تو اُخروی نجات ہوگا یا محض دنیوی فلاح و کامرانی۔ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ زندگی بعد از موت پر آپ کا ایمان ہو اور دوسری صورت میں اس کو لغو اور بے کار خیال کریں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ان مسائل کا ایک جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ یہی حال معاشرتی زندگی کے مختلف شعبہ جات کی بنیاد بنتا ہے۔ چنانچہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ فلاں معاشرے نے ان سوالات کا فلاں حل قبول کیا تو اُس معاشرے کے سیاسی، معاشی اور دیگر سماجی نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں یا اگر ہمیں اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی کارناموں کا علم ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مسائل کے حل میں فلاں پہلو اختیار کیا ہوگا۔ یہ اس لئے کہ کسی قوم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان مسائل کے حل کے سلسلے میں ایک پہلو پر ایمان رکھے اور عملی طور پر اس کا تمدن اس کے برعکس ہو۔

علم کے ذرائع ہم کو اس موقع پر دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل کے حل کے لئے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سوالات کو کس کس طرح حل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو اپنی قوتوں کا جائزہ لینا ہوگا جن سے بظاہر ہم ان مسائل کے حل میں مدد لے سکتے ہیں۔

۱۔ **حواس**: حواس سے مراد وہ پانچ مشہور قوتیں ہیں جنہیں باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامّہ اور ذائقہ کہا جاتا ہے۔ یہی حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں۔ دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بناء پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کر کے اپنے سائنسی علوم ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن حواس اپنی اس وسعت کے باوجود محدود ہیں۔ یہ ہمیں صرف ان اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہیں، جن کا محسوس کیا جانا ممکن ہے لیکن ہر موجود کے لئے ضروری نہیں کہ وہ محسوس بھی ہو۔ مثلاً زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک محض حواس سے ممکن نہیں۔ ہم زندگی کے مظاہر کا مشاہدہ کر کے زندگی کا قیاس تو کر سکتے ہیں، لیکن کسی دوسرے کی زندگی کو بلا واسطہ طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ حواس سے صرف مادی اشیاء کا علم ممکن ہے اور وہ بھی صرف ان اشیاء کے آثار اور خواص کی حد تک۔ مگر جن مسائل سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ سب مابعد الطبیعاتی ہیں۔ مثلاً زندگی کا مبدا اور منتہا ایسی چیزیں ہیں جو نہ ہماری آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہمارے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ اس لئے حواس کے ذریعے ہم ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتے۔

۲۔ **عقل**: عقل انسان کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ انسانی علوم میں ترتیب اور ربط اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا عقل زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کر سکتی ہے۔ تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حسول علم کے لئے تنہا کافی نہیں۔ اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کمتر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے کے لئے جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے جو اُس کو پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام عقلی علوم کا تجزیہ کیجئے اور عقل کا دلچسپ و طویل سفرنامہ سنیئے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لاعلمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں اس کا زادِ سفر حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے۔ پس جہاں حواس کام نہ کرتے ہوں وہاں عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جیسے طیارہ بغیر ہوا کے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیرِ بحث مسائل مابعد الطبیعاتی ہیں اور اس لحاظ سے حواس کی گرفت سے باہر ہیں اور جب حواس کی گرفت سے باہر ہیں تو عقل کی رسائی سے بھی ماورا ہیں۔ ؎

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

لیکن عقل کی اس نارسائی کے باوجود انسان نے اپنے تجسس اور خود فریبی کی بنا پر ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کاوش کے حاصل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ، خواہ مذہب کی مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اپنی اصلیت اور اساس کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ خدا کی حقیقت اس کی صفات، اخلاقی قوانین کا مقام وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں اور اس لئے واحد فیصلہ جو عقل ان سے متعلق صادر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت مدرکہ اشیاء سے مختلف ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ہر اس فلسفے کے نزدیک کہ جس نے ان مسائل کے حل تفصیلی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی، یہ اشیاء عام، مدرکہ اشیاء ہی کی مانند ہیں اور اس طرح یونانی فلسفہ اور علم کلام دونوں ہی تجسیمیت کا شکار ہو گئے۔

۳۔ **وجدان**: وجدان یا اشراق سے مراد وہ مفروضہ حق بینی ہے جو حواس اور عقل کی مدد کے بغیر عالم ثانی اور غیبی حقیقتوں کے علم کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو اس ذریعے کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اُن کے نزدیک حسی مشاہدہ اور عقلی استدلال اس نورِ باطن کے حق میں زہر قاتل ہے۔ صداقت کے یقینی حصول کے لئے شرط ہے کہ تزکیہ نفس کیا جائے اور ان کے تئیں تزکیہ نفس نام ہے ترکِ دنیا، نفس کشی، ریاضت اور مراقبہ کا۔

ہمارے نزدیک یہ بات تو صحیح ہو سکتی ہے کہ انسان کچھ ایسی مخفی قوتیں رکھتا ہے جن کو بیدار کر کے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کرلے جو حواس کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن یہ قوتیں بہرحال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و حواس کی طرح یہ بھی محدود اور خطا پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ اگر اشراق خطا پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

درحقیقت انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی کوئی بھی اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا، جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں کبھی یونانی و مصری اوہام کی تائید نظر آتی ہے اور کبھی فلسفۂ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر اگر اس حاسہ کی صحت پورے طور پر تسلیم بھی کر لی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حاسہ کے محسوسات کیا ہیں؟۔ اس سے کن چیزوں کا احساس ہوتا ہے؟ اہل کشف کہتے ہیں کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے، نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں، اور نہ ہی کائنات و انسان کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ گویا بنیادی سوالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اشراق نہ تو ان مسائل کا کوئی واضح جواب دے سکے اور نہ کوئی مفصل اور مثبت نظام زندگی پیش کر سکے۔ خود اپنی زندگی گذارنے کے لئے بھی انہیں اپنے ہی زمانے کے نظام کی اقدار مستعار لینی پڑیں۔ چنانچہ پراکلس اگر مصری رسوم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا تو جولین رومی بت پرستی کا۔ ویسے دونوں کا شمار اہل کشف میں کیا جاتا ہے۔

اس مختصر بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے حواس، اس کی عقل اور اس کا حاسۂ باطنی، اس کی زندگی کے اہم اور بنیادی سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان سوالات کے جواب کی کوئی راہ ہی نہیں۔ ان سوالات کا حل پیش کرنے کا دعوے دار ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو رسول اور نبی کہتا ہے اور اپنا ذریعۂ علم وحی بتاتا ہے۔ چنانچہ آیئے، وحی اور رسول کی روایات کو بھی پرکھ کر دیکھیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

۴ - وحی: وحی نام ہے اس علم کا جو خداوند تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت و معرفت کے لئے منکشف کرتا ہے۔ دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ چنانچہ وحی یا بہ الفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں خصوصی ہیں:۔

(ا) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عام طور پر ان اشیاء سے متعلق ہوتا ہے جو ظاہری حواس سے مخفی ہیں۔

(ب) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نہ ادراک حسی ہوتا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ استدلال منطقی۔ بلکہ ایک ناقابل بیان پیرائے میں نبی ایک بیک نئے حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں۔

(ج) الہامی علوم اشراقی علوم کی طرح بے معنی اور معاشرتی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لئے ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔

آیئے اب ان تینوں باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ غور کریں کہ ان میں سے کون سی خلاف عقل اور غیر منطقی ہے کیا وحی کا مورد مابعد الطبیعاتی اشیاء ہیں، جیسا کہ عقل عام اشارہ کرتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو، تو پھر ان سے متعلق علم بھی یقینی ہوگا۔ کیا وحی کا ایک خاص طریقہ پر وارد ہونا غیر منطقی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں ہر جانب انسان کی ضرورتوں اور آسائشوں کی تکمیل کا سامان بکھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور حقیر سے حقیر حاجت بھی ایسی نہیں جو اس دنیا میں پوری نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مہربان آقا نے انسان کی تمام ضروریات اس کائنات میں مہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن اس دنیا میں عام انسان کی سب سے اہم ضرورت ۔ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل ۔ بظاہر موجود نہیں عقل اشارہ کرتی ہے اور فہم مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مہربان آقا جس نے ہر ضرورت کا سامان تکمیل بخشا، یہ نہیں کر سکتا کہ اس عظیم ضرورت کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دے اور چونکہ ضرورت عام طریقہ سے پوری نہیں کی جا رہی ہے اس لئے یقیناً اس کے لئے کوئی خاص طریقہ مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ بات خلاف عقل ہے کہ الہامی علوم نظام زندگی کی بنیاد ہیں؟ جب وحی متعلق ہی ان اشیاء سے ہے، جو عین حیات ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وحی کا انکشاف کردہ علم بھی زندگی کی ہدایت و قیادت کے لئے ہوگا۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ الہامی علوم عملی طور پر بعض معاشروں کے نظامات زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

آغاز وحی

قرآن مجید وحی الٰہی ہے۔ وحی کے لغوی معنی "چھپا کر اطلاع دینا ہے"۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خالص غیبی طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کسی نبی تک کوئی بات پہنچاتا ہے اس میں کسی شخص کے غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو قطعاً کوئی دخل نہیں محض فضل الٰہی ہے، ذاتی محنت و کاوش سے یہ مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کرنے کے بعد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تنہا رہنے لگے تھے۔ غار حرا میں تشریف لے جاتے اور کئی کئی راتیں وہاں مقیم رہ کر عبادت میں مشغول رہتے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو گھر سے لے جاتے۔ اسی حالت میں ایک دن جبرائیلؑ آئے اور آپ سے کہا "اِقْرَاء" پڑھئے، آپ نے فرمایا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتے نے آپ کو زور سے دبایا پھر چھوڑ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا پڑھ! آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ فرشتے نے تیسری مرتبہ پکڑ کر دبایا اور چھوڑنے کے بعد کہا:

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" (سورۃ العلق) (پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا)

یہ پہلی وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی۔ اس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس تھی۔ زندگی کے اس نئے تجربہ سے آپ (صلی اللہ وسلم) ڈر گئے۔ گھر واپس لوٹے اور حضرت خدیجہؓ سے ماجرا بیان کیا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ کو اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ بن نوفل مذہبًا عیسائی اور تورات و انجیل کا ماہر تھا۔ اس نے ماجرا سن کر کہا یہ وہی فرشتہ ہے۔ جو اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد وحی کا آنا چند روز کے لئے بند ہو گیا۔ یہ فترتِ وحی (وحی کی رکاوٹ) کا زمانہ کہلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عرصہ میں بہت افسردہ رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اور یہ آیات نازل ہوئیں۔

یَا اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ (المدثر۔ ۱-۳) (اے کملی والے اُٹھ اور لوگوں کو خبردار کر اور اپنے رب کی عظمت بیان کر)

اس کے بعد وحی کا سلسلہ تا حیات جاری رہا۔

حقیقتِ وحی آیتوں کی تعداد کے لحاظ سے قرآن مجید سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر مختلف حیثیتوں سے نازل ہوتا رہا۔ کبھی پانچ دس آیات اور کبھی اس سے زیادہ یا کم آیتیں نازل ہوتیں۔ جس واقعہ یا ضرورت کے پیش نظر کوئی سورت یا آیت نازل ہوئی اس واقعہ کو مفسرین کی اصطلاح میں "شانِ نزول" کہتے ہیں۔ نزولِ وحی کے وقت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی، چہرۂ مبارک سُرخ ہو جاتا، سانس پھُول جاتا۔ شدید ترین سردی میں بھی پیشانی پسینہ سے شرابور ہو جاتی۔ آپ یوں محسوس فرماتے جیسے بھاری بوجھ تلے دبے ہوں، اگر آپ نزولِ وحی کے وقت کسی اونٹنی وغیرہ پر سوار ہوتے تو جانور بوجھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اس حالت میں آپ کو کلامِ الٰہی سنائی دیتا تھا۔

وحی کی صورتیں کوئی بشر اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ ربُّ العزت اس کے سامنے آکر اس سے کلام فرمائے اور وہ برداشت کر سکے۔ اس کے کسی انسان سے ہمکلام ہونے کی یہ تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت اللہ تعالیٰ فرشتے کے واسطہ سے کلام فرمائے مگر فرشتہ مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے۔ بلکہ براہِ راست نبی کے دل پر نزول کرے، اور نبی کو دل سے ہی فرشتے اور اس کی آواز کا ادراک ہو۔ اس طریقِ وحی میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پہلے ایک گھنٹی کی سی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سنائی دیتی اور پھر حضرت جبرائیلؑ وحی الٰہی کے ساتھ آپ کے قلب مبارک پر نزول فرماتے۔ یہ طریق وحی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احساس پر شدید گزرتا تھا اور بیشتر وحی قرآنی اسی صورت میں آتی تھی۔

دوسری صورت اللہ تعالیٰ بلا واسطہ نورانی پردے کے پیچھے سے کلام فرماتے۔ نبی کی قوت سامعہ کلام سے براہِ راست لذت اندوز ہوتی لیکن آنکھوں کے آگے تجلیات حائل رہتیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کوہ طور پر اسی انداز کی وحی میں کلام ہوا۔ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی معراج کی رات اسی انداز میں کلام ہوا۔ بلکہ آپ کے سامنے نور کے جلوے کے سوا اور کوئی پردہ نہ رہا تھا۔

تیسری صورت نزول وحی کی تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ مجسم ہو کر نبی کے سامنے آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائے۔ جیسے ایک آدمی دوسرے سے خطاب کرتا ہے۔ اس صورت میں آنکھیں فرشتے کو اس کی ظاہری صورت میں دیکھ سکتی تھیں۔ کان اس کی آواز کو سن سکتے تھے۔ بلکہ پاس بیٹھنے والے بھی گفتگو سن لیتے اور بات کو سمجھ سکتے تھے۔

وحی کی ان تینوں صورتوں میں سے دوسری صورت بہت نادر تھی اور صرف شب معراج میں پیش آئی تھی۔ قرآن کریم کا اکثر حصہ پہلی اور تیسری صورت کے مطابق نازل ہوتا رہا۔ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے کئی دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہایت سردی کے دن وحی اُترتی محسوس کی۔ جب اس کا دباؤ آپ سے اُترتا تھا تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ ٹپک رہا ہوتا تھا۔ (صحیح بخاری)

انقطاعِ وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً تیئس سال کے عرصہ میں اپنے مشن کی تکمیل کی۔ یہاں تک کہ حجۃ الوداع کا تاریخی دن آیا۔ عرفات کے میدان میں انسانوں کا موجیں مارتا ہوا سمندر پھیلا ہوا تھا۔ اسی موقع پر آیت کریمہ نازل ہوئی۔

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" (المائدہ۔۳)

(آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے اسلام کا دین ہونا پسند فرمایا ہے)

یہ آخری وحی تھی جو آپ پر نازل ہوئی اس کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

"قد انقطع الوحی وتم الدین" (مشکوٰۃ ص ۵۵۶) (وحی منقطع ہو گئی اور دین مکمل ہو گیا)

حضرت فاروق اعظمؓ نے بھی یہی اعلان فرمایا:

انّ الوحی قد انقطع (بخاری ج ۱ ص ۳۶) (بے شک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے)

ابن ماجہ ص ۱۱۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض اہل علم کے نزدیک سورۂ بقرہ کی یہ آیت آخری وحی تھی:۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (البقرہ۔ ۲۸۱) (اس دن سے ڈر جاؤ جب تمہیں اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا۔

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم باختلاف روایات اکیاسی یا اکیس یا سات دن زندہ رہے۔ اس طرح حراء سے جس داستانِ ہدایت کا آغاز ہوا تھا اس کا آخری باب مکمل ہوا۔

۳۔ وحی کی حقانیت اور بالادستی

اب جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ وحی کسی طور پر بھی خلاف عقل و دانش نہیں تو ایک عاقل و دانش مند کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ الہامی علوم کی اسی طرح پرکھ کرے جیسے دیگر روایتی علوم کی جاتی ہے اور اگر یہ علوم پرکھنے پر صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان لائے۔

جب کسی شخص کے قول کی تصدیق یا تکذیب کرنی مقصود ہوتی ہے تو ہمارے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک قول نقل کرنے والے کی شخصیت اور دوسرے قول کے معنی۔ آیئے انہی دو کسوٹیوں پر ہم رسول کے دیئے ہوئے علم کو بھی پرکھیں۔

کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص ہاتھی کو ہوا میں اڑتا اور چیل یا کبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرتا بتاتا ہے تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ لیکن نبی جو چیزیں بتاتا ہے، وہ یا تو مابعد الطبیعاتی ہیں، اور اس لحاظ سے تجربے اور مشاہدے کی قلمرو سے باہر ہیں، یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ میں کسی نبی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کہی گئیں۔

قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ایک گروہ کے افراد جو ایک ہی قسم کی اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہوں، ان کے اقوال آپس میں ٹکراتے نہ ہوں۔ انبیائے کرام کی تعلیمات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تضاد نہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصول و مبادی ایک ہی ہیں۔

قول کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ اس کو عملی زندگی میں اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ اگر یہ نتائج خوشگوار اور انسانیت کے حق میں مفید ہیں تو گمان غالب ہے کہ قول صادق ہوگا اور بصورت دیگر باطل۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انبیاء کی تعلیمات کو قبول حاصل ہوا یک ایک انسانی معاشرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی بیشتر خرابیاں دور ہوگئیں اور وہ بہت جلد عدل و انصاف کی نعمتوں سے ہم کنار ہوگیا۔

قول کو جانچ لینے کے بعد قول نقل کرنے والے کی باری آتی ہے۔ ان دیکھی چیز سے متعلق قول کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے لئے راوی کی شخصیت کی پرکھ اور بھی ضروری ہے۔ قول کی صداقت پر دو صورتوں میں اثر پڑ سکتا ہے ایک شعوری اور دوسرے لاشعوری۔ قول کو غیر معتبر سمجھے جانے کی ایک صورت وہ ہے کہ جب راوی بد دیانت اور بدکردار ہو۔ ایسا شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے یا تو اقوال گھڑ سکتا ہے۔ یا ان کو مسخ شدہ صورت میں پیش کر سکتا ہے، لیکن انبیاء کے بارے میں ان کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ وہ بلند کردار اور راست گو ہیں۔

قول کا مسخ ہو جانا لاشعوری طور پر بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ راوی کے حواس درست نہ ہوں لیکن انبیاء کے بارے میں یہ حقیقت بھی مسلم رہی ہے کہ وہ سلیم العقل، صحیح الدماغ اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

لاشعوری تنسیخ و تبدیلی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قول راوی کے زمانے کے تکنیکی علوم سے متاثر ہو۔ لیکن ہر نبی اگرچہ تمام اشیاء متعلق کما حقہٗ معلومات رکھتا ہے لیکن وہ تکنیکی اور ادبی علوم سے ناواقف ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے اپنے یا کسی دوسرے زمانے کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً کسی غیر معمولی ذریعے سے اس پر منکشف ہوئیں اور بغیر کسی تبدیلی کے اس کی زبان سے جاری ہوگئیں۔

زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام

سابقہ بیانات سے معلوم ہوا کہ محض حواس، عقل یا اشراق ایک مکمل اور متوازن معاشرہ قائم کرنے میں کس طرح ناکام رہے ہیں۔ آیئے اب معلوم کریں کہ وحی و الہام کس طور پر ایک ایسا معاشرہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عدل و انصاف سے معمور ہو۔ الہامی معاشرے کی اساس وہ حل ہوتا ہے جو انبیائے کرام زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ الہامی تمدن کے مطالعہ سے پیشتر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انبیائے کرام کی تعلیمات، جو قرآن پاک میں محفوظ ہیں، زندگی کے بنیادی مسائل کا مندرجہ ذیل حل پیش کرتی ہیں۔

(الف) انسان اور اس کی زندگی: انسان اور اس کی زندگی سے متعلق چار اہم نکات واضح کئے گئے ہیں۔

اوّل۔ انسان اللہ کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دوئم۔ وہ اشرف المخلوقات ہے، یعنی محض حیوان ناطق نہیں بلکہ دیگر مخلوقات پر اخلاقی برتری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکھتا ہے۔

سوئم، انسان کی زندگی خدا کی عبادت کے لئے ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو، خواہ یہ سجود و قیام ہو خواہ تجارت و سیاست۔

چہارم، انسان کی موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

پس جس نے ذرہ بھر بھلائی کی وہ دیکھ لیگا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی وہ بھی دیکھ لے گا۔

(ب) **کائنات کی حقیقت**: کائنات سے متعلق تین نکات قرآن پاک میں واضح کئے گئے ہیں۔

اوّل۔ انسان کی طرح ہر شے اللہ کی تخلیق کردہ ہے، دوئم۔ اس کائنات کا نظام اللہ کے تعین کردہ اصول (سنّت اللہ یا فطرت) کے مطابق چل رہا ہے۔ سوئم۔ یہ دنیا انسان کے استعمال اور تصرف کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح انسان کیلئے آزمائش کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

(ج) **اللہ اور اس کی صفات**: اللہ اور اس کی صفات سے متعلق قرآن پاک کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، جن کا احاطہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول: اللہ وہ ہستی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مدبر و آقا ہے، اللہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات۔ چونکہ اس کی مثال موجود نہیں اور اس کی ذات کا ادراک حواس کے لئے ممکن نہیں، اس لئے اللہ کا کوئی واضح تصوّر کوئی ذہن انسانی ترتیب نہیں دے سکتا۔

اللہ خالق و آقا ہونے کے ساتھ عادل و رحیم بھی ہے۔ اس کی صفات ربوبیت عدل اور رحم ہی کی بناء پر کائنات میں تنوع کے ساتھ ساتھ توازن و اعتدال ہے۔ وہ جس طرح جسمانی زندگی کا رب ہے، اسی طرح اخلاقی روحانی زندگی کا بھی رب ہے، اس لئے اس کی صفت ربوبیت کا اور صفت عدل کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو راہ ہدایت دکھاتا، چنانچہ اس نے وحی کے ذریعہ یہ راہ منکشف کی اور صفت عدل کی بناء پر یوم آخر میں اچھے اور برے کام کا بدلہ دے گا۔

اب ذرا اس الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کر کے دیکھیے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے اس عالم کے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو بے بادشاہ کی سلطنت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے اور نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت، بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے، جو اس کا خالق وصانع بھی ہے اور مدبر و حاکم بھی۔ اس کا سب سے پہلا اثر ذہن انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے قبائل اور اقوام کی تقسیم ظاہری اور سطحی معلوم ہونے لگتی ہے اور انسانیت کے ایک وحدت ہونے کا یقین راسخ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں زندگی کے بامقصد ہونے کا خیال اور آخرت کا احساس عمل کی اصلاح کا عظیم ذریعہ بنتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ عیش و تفریح میں وقت ضائع کرنا برا معلوم ہوتا ہے ظلم و ناانصافی سے طبیعت گھبراتی ہے۔ احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا قتل تو بہت بڑی چیز ہے معمولی ایذا رسانی ضمیر پر بار گزرتی ہے۔

خلافت اور نیابت کا تصور حاکم کو من مانی کارروائی سے باز رکھتا ہے، وہ اپنے کو مخلوق خدا کا مالک اور آقا نہیں بلکہ خدا کا امین اور بندوں کا خادم سمجھتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کے ملک میں ظلم و زیادتی راہ نہ پا جائیں۔ عدل و انصاف کے نفاذ کے لئے وہ ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ خلافت اور آخرت کے تصور سے جو احساس ذمہ داری انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی چند مثالیں الہامی تمدن کے دو ادوار سے پیش کی جاتی ہیں۔

ایک جلیل القدر خلیفہ، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے حکمران تھے، موٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سب مسلمان یہ کھاتے ہیں یا کھا سکتے ہیں؟ جب جواب نفی میں ملتا تو کھانا واپس کر دیتے۔

کسی گھوڑ دوڑ میں ایک مصری نے کہا "واللہ میرا گھوڑا آگے ہے"۔ قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا گھوڑا دوڑا رہا تھا، اس نے مصری کے یہ کہنے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا "لو ایک شریف زادے کا یہ طمانچہ"۔ اس مصری نے مدینہ پہنچ کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے بیٹے کو مدینہ طلب کیا۔ جب وہ آ گئے تو مصری کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور کہا "مار اس شریف زادے کو"۔ جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا "اب یہی کوڑا باپ کے سر پر گھما، اس لئے کہ اس لڑکے نے تجھ کو جو طمانچہ مارا تھا۔ وہ اسی کی وجہ سے مارا تھا۔" پھر آپ نے گورنر سے کہا "تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالاں کہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے"۔

ایک اور خلیفہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔

یہ ہے وہ مختصر سا خاکہ جس پر الہامی تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں نہ حسی تمدن کی اغراض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پسندی ہوتی ہے اور نہ اشتراکی تمدن کا ترک دنیا۔ نفع پرستی کے بجائے چند مستقل اخلاقی اصول ہیں جو وسیع تر انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مفید ہیں۔ اور جن کی پابندی ہر صورت میں ضروری ہے خواہ حالات سازگار ہوں یا ناسازگار۔ اس کی تعلیم یہ نہیں کہ

"زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز"

بلکہ یہ ہے کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز"

ترک دنیا اسلام کی نظر میں ایسا ہی بُرا ہے جیسا دنیا کی مصروفیات میں غرق ہو جانا اور خدا کو بھول جانا۔ اسلام معاشرتی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے، اس کی بیخ کنی نہیں۔ اس لئے اس نے صاف طور سے اعلان کیا کہ "لا رھبانیۃ فی الاسلام" (اسلام میں رہبانیت نہیں)۔ چناں چہ اسلامی معاشرہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہتا ہے جو نفس کشی اور آدم بیزاری کا لازمی ثمر ہیں۔

اوپر کی ساری بحث سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ :

(۱) عقلی تنقید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعے ممکن ہے اور :-

(۲) ان مسائل کے مختلف جوابات پر تمدن کی جو عمارات تعمیر ہوتی ہیں ان میں سب سے مستحکم اور صحت مند اور لیاقت بخش وہ تمدن ہے جس کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کا مقام

۱۔ مذہب کا مفہوم

مذہب کا لفظ عربی زبان میں اسم ظرف ہے اور ذھاب مصدر سے نکلا ہے۔ ذھاب کے معنی ہیں جانا۔ مذہب اس جگہ کو کہتے ہیں جس پر چلا جائے یعنی راستہ اور سڑک وغیرہ۔ ایک اصطلاح کی حیثیت سے مذہب اس راستے کو کہتے ہیں جس پر چل کر انسان اپنے مقصدِ حیات میں کمال حاصل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے دوسرے الفاظ میں مذہب قوانین کا وہ مجموعہ ہے جس پر عمل کر کے انسان معراج کمال تک پہنچ جائے۔ انسان اپنی زندگی کے نصب العین کو پہچان لے اور حیاتِ انسانی کے تاریک طوفانوں میں انسانیت کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ان قوانین پر عمل کر کے ساحل مراد پر پہنچا سکے۔

قرآن کریم نے مذہب کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا ہے۔

قرآن عزیز میں فرمایا:۔

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (آل عمران ۱۹) (دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے)

دوسری جگہ فرمایا:

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ" (المائدہ ۳) (آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا)

نیز فرمایا:

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ (الکافرون) (تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین)

۲۔ مذہب دین اور شریعت

مذہب کا لفظ قرآن میں کہیں بھی استعمال نہیں ہوا۔ مذہب کے مقابلہ میں دین کا لفظ وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ دین کے معنی ہیں "نظام زندگی" ضابطہ حیات اور زندگی کا وہ کامل و اکمل دستور جس پر چل کر انسان فلاح دارین حاصل کر سکے۔ اس ضمن میں شریعت کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے شریعت عربی میں پانی کی نالی کو کہتے ہیں۔ شریعتِ ہر نبی کا خصوصی طریقہ مراد ہے جس پر وہ اپنی زندگی میں گامزن رہا۔ آغاز انسانیت سے دین اسلام ایک ہی رہا مگر انبیاء کی شریعتیں بدلتی رہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دین اسلام کے مرکزی اور اساسی اصول و ضوابط بحال رہے مگر ہر نبی کی شریعت میں حسب زمان و مکان کچھ جزوی قسم کی تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ اس اعتبار سے دین کے مقابلہ میں شریعت کا لفظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی محدود ہے۔ شریعت کے لفظ کو انبیاء کی طرف منسوب کرکے شریعت موسوی اور شریعت عیسوی کہا جاتا ہے۔

۳۔ مذہب کی غرض و غایت

مذہب کا فائدہ اور مقصود یہ ہے کہ انسان اخلاق اور روحانیت کی منزل طے کرے۔ اخلاق کی عظمت معلوم کرے، حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھے اور ان کی ادائیگی کا خیال رکھے۔ اس میں سیرت کی پاکیزگی، بلند خیالی، احساس مسرت اور ہمدردی پیدا ہو جائے۔ اس کی زندگی حسن عمل کی زندہ مثال بن جائے۔ مختصر یہ کہ مذہب کے معنی سچی اور صحیح راہ عمل ہیں اور وہ فطرت انسانی کو ایسی روش پر چلنے کی ہدایت کرتا ہے جس سے انسان اپنے وجود کے حقیقی مقصد میں کمال حاصل کر سکے اور دنیا میں امن و سکون کی ایک عالمگیر فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

انسان کو اپنی زندگی کا مقصد مقرر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اسے یہ مقام حاصل نہیں کہ وہ اپنا مقصد حیات متعین کر سکے کیوں کہ اسے اپنی زندگی پر کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ وہ اپنی مرضی سے اس دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے جاتا ہے وہ ایک مخلوق ہے اور اپنے خالق کی مرضی کا تابع ہے جس خالق و مالک کے ہاتھ میں اس کی موت و حیات ہے وہی اس کی زندگی کا مقصد مدعا مقرر کر سکتا ہے۔ خالق کائنات نے تخلیق انسانی کا مقصد اپنی معرفت و عبادت قرار دیا۔

قرآن میں فرمایا:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" (الذاریات - ۵۶)

(میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

جن و انس کی غرض تخلیق یہی ہے۔ دنیا کے کسی مذہب کو اس سے اختلاف نہیں ہے اور دنیا کا ہر مذہب صحیح یا غلط طریقہ سے معبود حقیقی کا قرب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مقصد زندگی کا حصول مذہب کو اپنا کر ہوتا ہے یعنی مذہب اس کے حصول کے مختلف طریقے بیان کرتا اور ہر قسم کے نشیب و فراز سے آگاہ کر کے صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

۴۔ مذہب کی تعریف

انگریزی میں مذہب کے لئے (RELIGION) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو لاطینی سے ماخوذ ہے اور جس کے معنی عقیدے اور پوجا پاٹ کے ایک نظام کے ہیں۔ دنیا میں بے شمار مذاہب موجود ہیں۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خیال کے مطابق مذہب کی تعریف کی ہے۔ چند تعریفات ملاحظہ ہوں۔

میتھیو آرنلڈ لکھتے ہیں:۔

"مذہب سے مراد صداقت سے متاثر اخلاقی تعلیم ہے"۔

سر ای۔ بی۔ ٹیلر نے مذہب کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"مذہب روحانیت میں یقین رکھنے کا نام ہے۔"

فرید وجدی کہتے ہیں :-

"مذہب ان معقول خیالات کے مجموعہ کا نام ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ تمام افراد انسانی ایک رشتہ میں منسلک ہو جائیں اور وہ جسمانی فوائد سے اس طرح بہرہ یاب ہوں جس طرح قوتِ عقلیہ سے۔ مذہب نوعِ انسان کے لئے ایک ابدی چیز ہے۔"

شوپنہار لکھتا ہے :-

"مذہب موت کے تصور سے وابستہ ہے۔"

برونائٹ ہیڈ کہتا ہے :-

"مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔ بشرطیکہ اسے خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔"

کال وارٹن کا کہنا ہے کہ "انسان نے اس قوت کو مذہب کا نام دیا ہے جس کا مفہوم یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ وہ اس سے کائنات کو مسخر کرے گا۔" برگسان نے موت کو مذہب پیدا کرنے کا باعث قرار دیا ہے۔

الغرض مختلف علماء نے اپنے اپنے خیال میں مذہب کی تعریف کی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب قدیم ترین چیز ہے اور انسان نے تاریخ کے ہر دور میں اس کو اپنایا ہے۔

۵۔ مذہب کی ضرورت

مذہب کی ضرورت کے وجوہ و اسباب حسب ذیل ہیں :-

(الف) انسان ناقص العقل پیدا ہوا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ بندوں پر وحی کے ذریعہ احکام نازل کئے تاکہ انسان اپنی مشکلات کا ازالہ کر سکے اور عقل کی کوتاہی کی وجہ سے قعرِ ہلاکت میں نہ گر پڑے۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں نے عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کیا ہے۔ سقراط کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔"

جب انسان ناقص العقل ہے تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ جن پیچیدہ مسائل کو حل کرے گا وہ صحیح ہوں گے۔ فلسفۂ یونان کے جو بنیادی نظریات تھے وہ صدیوں تک دنیا میں قبول رہے۔ مگر آج جدید فلسفۂ یورپ نے ان کو بالکل باطل قرار دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے سائنسدان عقل کے زور سے جن نظریات کی عمارت تعمیر کر رہے ہیں وہ مستقبل میں بھی کھڑی رہے گی۔ لہٰذا ہدایت الٰہی یعنی مذہب زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ ہر قسم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلطیوں اور ٹھوکروں سے محفوظ رہ کر سیدھی راہ پر گامزن رہے۔

(ب) انسان فطرتاً اجتماعی (SOCIAL ANIMAL) کہا جاتا ہے اس کی فطرت اس بات کی مقتضی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے مل کر رہے۔ کیوں کہ وہ ان کی مدد کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ صنعت و حرفت تجارت و زراعت اور دیگر امور تنہا ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا اور یہ تمام چیزیں اس کی زندگی کا لازمی جزو ہیں۔ تاکہ وہ آرام و آسائش کی زندگی بسر کر سکے۔ ان تمام چیزوں کے حصول کے بعد بھی اسے کسی زبردست قوت کی ضرورت ہے جس کے ڈر سے لوگ اپنے اپنے کام بطریق احسن سرانجام دے سکیں۔ ایک دوسرے کے مفاد آپس میں نہ ٹکرائیں۔ وہ ایک دوسرے پر ظلم و تعدی نہ کر سکے پائیں۔ اور وہ سب مل جل کر اچھی زندگی گذار سکیں۔ ایسی قوت بادشاہت میں ہو سکتی ہے۔

چونکہ مذہب میں انسان اپنے معبود حقیقی کو مطلق العنان شہنشاہ سمجھتا ہے۔ اس لئے اسکو ماننا اور اس کی اطاعت کرنا انتہائی ضروری ہے اور یہ راہ صرف مذہب ہی دکھاتا ہے۔ دنیاوی بادشاہت انسانوں کے جسم پر کنٹرول کرتی ہے لیکن حقیقی بادشاہت روحانیت کا درس دیتی ہے جب تک روح و جسم پاکیزہ نہ ہوں انسانی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب زندگی گذارنا مذہب کے بغیر ناممکن ہے۔

(ج) مذہب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ قدرت نے انسان کو ایک ایسی قوت عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی ضروریات مہیا کرتا ہے اور طرح طرح کی مشکلات کا حل سوچتا ہے۔ اسے عقل کہا جاتا ہے۔ انسان اس کے ذریعہ نیکی و بدی میں تمیز کرتا ہے۔ لیکن بعض اوقات عقل انسانی پر خواہشات نفسانی کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ بالکل بیکار ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان اپنے معاشرہ کے لئے انتہائی طور پر خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

حرص و طمع اس کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ اپنے بیگانے اور دوست دشمن سب کے مال پر قبضہ کر لے اور ساری دنیا کا عیش و آرام اپنے ہی لئے مخصوص کر لے۔ تمام دنیا کی گردنیں اس کے سامنے جھک جائیں۔ ایسے موقع پر ایک روحانی جذبہ انسان کو صحیح راستہ دکھاتا ہے۔ یہی پاکیزہ جذبہ ضمیر کی آواز ہوتا ہے جو نور ایمان ہے یہی مذہبی جذبہ ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس لئے انسان کسی نہ کسی طرح مذہب کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔

۶۔ مذہب کا آغاز

مذہب بھی انسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ جب سے انسان وجود میں آیا اسی وقت سے مذہب بھی عالم ہستی میں جلوہ گر ہے کیوں کہ وہ ایک فطری لازمہ ہے۔ جس طرح فطری جذبات انسان سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتے اسی طرح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب کا یقین و اعتقاد بھی اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم میں فرمایا:

"رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی" (سورہ طٰہٰ - ۵۰) (ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو ایک خاص فطرت پر پیدا کیا اور پھر اس کو راستہ دکھایا)

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کر کے ساتھ ہی حقیقی راہِ عمل بھی بتادی۔ "ھدیٰ" سے قانونِ حیات یا قوانین فطرت مراد ہیں۔ کائنات کی کوئی چیز اس قانون سے انحراف نہیں کر سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہم دن رات کرتے ہیں۔ چاند سورج ستاروں اور سیاروں کے لئے جو راستہ مقرر کیا گیا ہے وہ اس کے خلاف کبھی نہیں چلتے۔ پہاڑوں کو ساکن رہنے کا حکم دیا گیا ہے کبھی یہ نہیں دیکھا گیا کہ ایک ملک کے پہاڑ چل کر دوسرے ملک میں آ گئے ہوں یا بہتے ہوئے دریا جم جائیں اور ان میں بہنے کی خاصیت باقی نہ رہے۔

دنیا کی ہر چیز ایک خاص قانون کی پابند ہے۔ اسی طرح انسان کی پیدائش بھی تخلیق کائنات کے ساتھ ہوئی جس طرح سے کائنات کے ذرّے ذرّے کو ایک خاص ڈیوٹی سونپ دی گئی۔ اسی طرح سے انسان کو بھی فطری طور پر یہ شعور دیا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچاننے کی کوشش کرے۔ لیکن وہ اس راہ پر قائم رہتا ہے اور کبھی اس سے بھٹک جاتا ہے۔ ذہن انسانی کے ساتھ ساتھ مذہب بھی مختلف منازل سے گزرا علماء اس ضمن میں مختلف الخیال ہیں۔ ہم ان کے خیالات کے مطابق ارتقاء مذہب سے بحث کرتے ہیں۔

۷۔ مذہب کا ارتقاء

قدیم انسانی زندگی کی بود و باش جنگلوں تک محدود تھی۔ اس کی ضروریات و حاجات بھی بہت کم تھیں۔ قدرت کے عطا کردہ بیش بہا ثمرات اس کی کفالت کرتے رہے۔ البتہ ایک خوف اس کے دل میں ہر وقت موجزن رہتا تھا کہ فطرت کی بڑی بڑی طاقتیں کہیں اس کو فائدہ دینا بند نہ کر دیں۔ یا وہ خوفناک مخلوق جو اس دنیا میں اس کے ساتھ ساتھ موجود ہے اسے نقصان نہ پہنچائے پہلے مرحلہ پر اس نے ان کا گرویدہ بننے کے لئے ان کی پرستش شروع کر دی۔ وہ چاند تاروں اور سورج کو اس لئے پوجتا کہ وہ بے شمار منافع جو ان کے وجود سے حاصل ہیں کہیں سلب نہ کر لئے جائیں۔ دریاؤں سمندروں اور بادلوں کی اس لئے پرستش کرتا کہ کہیں وہ بے قابو ہو کر اسے ملیامیٹ نہ کر دیں۔ شیر سانپ اور اسی قسم کے دیگر جانور درندے جو اسے ہر وقت خوف زدہ رکھتے ہیں۔ اس نے ان کی بھی پوجا شروع کی تاکہ وہ اس سے خوش رہیں اور اسے تکلیف نہ دیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے بعد جب انسانی شعور میں مزید بیداری پیدا ہوئی تو اس نے یہ سوچا کہ فطرت کی یہ طاقتیں کسی کے تابع ہیں۔ اس نے پھر ان طاقتوں کے بُت بنائے اور ان کی پرستش کرنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ امن و سکون کی زندگی بسر کرے۔ لیکن اس کے بعد بھی بجلیاں اس پر گرتی رہیں۔ دریاؤں کا سیلاب اسے نقصان پہنچاتا رہا۔ زہریلے ناگ اسے ڈستے رہے۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ تمام چیزیں ضرور کسی کے کنٹرول میں ہیں۔ اب اس کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھرا کیا طرح طرح کی ریاضتیں کیں۔ اس طرح اسے معبودِ حقیقی کا نشان ملا۔ ایسے لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغامِ ہدایت حاصل کر کے پوری دنیا میں پہنچایا۔ اس طرح پوری دنیا مذہب اور اس کی حقیقت سے آشنا ہوئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا میں تخلیق انسانی کے ساتھ ہی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی بھی کی گئی کچھ لوگوں نے اسے اپنایا۔ کچھ نے جھٹلایا۔ یہاں تک کہ مذہب ایک گورکھ دھندہ بن کے رہ گیا۔ کسی نے درختوں کی پوجا کی اور کسی نے آگ کی۔ کسی نے بتوں کی پرستش کی اور کسی نے فطرت کی طاقتوں کی۔ بہر حال کسی نہ کسی مذہب کو اپنایا۔ اس سے مقصد صرف یہ تھا کہ وہ اپنے معبود کی خوشنودی حاصل کرے۔ خدا کی مخلوق اس طرح حقیقت سے دُور ہوتی چلی گئی۔ جب کسی جگہ ضلالت و جہالت کے آثار نمودار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے وہاں فوراً کوئی نہ کوئی ہادی و رہنما بھیجا تاکہ لوگ راہِ راست پر آجائیں اور ان کی زندگی عیش و مسرت سے گزرنے لگے۔ جن لوگوں نے پیشواؤں کی پیروی کی وہ بلند اخلاق ثابت ہوئے اور ہر لحاظ سے کامیاب و کامران رہے۔

۸۔ مذہب کی اہمیت

انسانی زندگی کے لئے مذہب کا ہونا انتہائی ضروری ہے۔ انسانی زندگی سے مذہب کا تعلق بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ موٹر کا تعلق اپنے ڈرائیور سے۔ اگر ڈرائیور اسے صحیح سمت کی طرف لے جائیگا تو وہ منزل پر پہنچ جائے گی۔ اور اگر وہ ذرا سی لاپرواہی سے بھی کام لیتا ہے تو اس کی معمولی لغزش موٹر کو تباہ و برباد کر سکتی ہے۔ مذہب چونکہ ایک فطری چیز ہے اس لئے صحیح مذہب انسان کو اعلیٰ زندگی گذارنے کے طریقوں سے آشنا کرتا ہے۔

مذہب ان وسائل و ذرائع کی طرف رہنمائی کرتا ہے جن سے خالق کا قرب حاصل ہوتا ہے اور اس کی جان پہچان ہوتی ہے۔ اس کی راہ میں جس قدر رکاوٹیں اور حجاب ہوتے ہیں، مذہب ان کو دُور کرتا ہے۔ جس سے انسان اپنی زندگی کے مقصد کو آسانی سے پا سکتا ہے۔ مذہب نجات کے لئے فطرتِ صحیحہ کے مطابق تعلیم دیتا ہے۔ مذہب کی اوّلین غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسان خدا کا قرب حاصل کرے۔ پھر یہ کہ اسے زندگی میں راحت و سکون میسّر آئے اور حوادث و آلام سے نجات ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مذہب مکمل اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ نیک اخلاق اختیار کرنے اور برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اخلاق حسنہ و ذمیمہ کا معیار مقرر کرتا ہے۔ نہ صرف برائیوں اور گناہوں کے نقصانات سے روشناس کراتا ہے۔ بلکہ ان کی جڑ کاٹتا اور ان کے ذرائع کو مسدود کرتا ہے۔ تاکہ انسانی زندگی کامیاب سے کامیاب تر ہو۔ اخلاق کو انسانی زندگی میں بہت اہمیت حاصل ہے اور یہ مذہب کا جزو اعظم ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجنے کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے کہ آپ لوگوں کے اخلاق درست کریں۔ جس قوم و معاشرہ کے لوگ اخلاق حسنہ پر عامل ہوں گے وہ ہمیشہ کامیاب و کامران ہوں گے۔ یہ قانونِ قدرت اور فطرت انسانی ہے۔ لہٰذا بہترین زندگی گذارنے کے لئے صحیح ترین مذہب کو اپنانا ضروری ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار مذہب پر ہے۔ اسی سے تمدن و معاشرت سنورتے ہیں۔ اگر اس میں نقص پایا جائے تو اس کی بناء پر قوموں کی بربادی اور افراد انسانی کی ہلاکت ظہور میں آتی ہے اس لئے صحیح مذہب کو اپنانا ملک و قوم کی معراج ہے۔

۹۔ فطری جذبہ

قرآن کریم میں فرمایا:

"فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الروم-۳۰)

اپنا منہ سب کی طرف سے موڑ کر دین کی طرف کرو یہ خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی ٹھیک دین ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

مذکورہ صدر آیت کریمہ اس درخشاں حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے یعنی جس طرح انسان میں ہمدردی محبت نفرت و عداوت یا شجاعت و سخاوت کے قدرتی جذبات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح مذہبی رُجحان و میلان بھی ایک قدرتی اور فطرتی چیز ہے۔ جس طرح دیگر قدرتی جذبات انسان میں یکساں نہیں پائے جاتے۔ بلکہ کسی شخص میں کم اور کسی میں زیادہ ہوتے ہیں۔ مذہبی جذبہ کا بھی یہی حال ہے۔ خداوند کریم نے اس آیت میں مذہبی رُجحان کو ایک ناقابل تبدیل فطرت قرار دیا ہے جو کسی زمانہ میں تبدیل نہیں ہوتی۔ رنگ و نسل یا جغرافیائی حدود و قیود بھی اس پر انداز نہیں ہو سکتیں۔ ملحد سے ملحد انسان کے دل کے کسی گوشہ میں بھی غیر شعوری طور پر مذہبی احساس ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی حدیث کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث

"مَامِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ" (بخاری و مسلم) (ہر بچہ فطری مذہب پر پیدا ہوتا ہے)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں بیان فرمایا۔ یہ حدیث مذکورہ آیت کی توضیح کرتی ہے۔

جب کائناتِ ارضی کے محسنِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ظلمت کدۂ خاکی کو اپنی سراپا نور و ہدایت ہستی سے زینت بخشی تو وہ قوم جس میں آپ تشریف لائے ہر طرح کے عیوب و نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بھرپور معمور تھی۔ شراب نوشی۔ بدکاری جوا بازی لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا۔ غارت گری اور خون ریزی ان کے محبوب مشاغل تھے۔ شائد اس خطۂ ارضی کی کوئی قوم ان سے زیادہ درماندہ و پسماندہ نہ تھی مگر گمراہ ہونے کے باوجود مذہبی جذبہ سے بالکل عاری نہ تھے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

"وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ" (العنکبوت - ۶۱)

(اور اگر آپ ان (اہل عرب) سے دریافت کریں کہ آسمان و زمین کس نے پیدا کئے اور آفتاب و ماہتاب کو کس نے تابع کیا تو وہ (عرب) کہیں گے اللہ نے)

اس آیت سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ عرب کے رہنے والے لاکھ جاہل و بے دین سہی مگر وہ خدا کی ذات کو جانتے اور مانتے تھے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ عرب جن کو اُمّی کہا جاتا ہے۔ جب کشتی پر سوار ہوتے اور بادِ مخالف کے تھپیڑوں سے کشتی ہچکولے کھانے لگتی تو وہ لات و منات کو بھول جاتے اور بارگاہِ ربّانی میں دست بدعا ہوتے کہ اگر اب کے تو نے ہمیں نجات سے ہمکنار کر دیا تو ہم خالص موحّد بن جائیں گے۔ (العنکبوت - ۶۵)

مشہور مؤرخ مسعودی لکھتے ہیں:۔

"عرب میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو اللہ تعالیٰ کو خالق مانتے تھے اور حشر و نشر کے بھی قائل تھے وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اجر اور گنہگاروں کو سزا دے گا ان میں سے جو لوگ بتوں کے پرستار تھے وہ برملا یہ کہتے تھے کہ

"مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى" (الزمر - ۳)

(ہم تو ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں)

اگرچہ عربوں میں ملحد اور دہریہ قسم کے لوگ بھی تھے مگر صحیح العقیدہ لوگوں کی کمی نہ تھی۔

(مروج الذہب للمسعودی)

۱۰۔ مذہبی جذبہ کی ہمہ گیری

مذہب کی ضرورت انسانی تاریخ کے ہر دور میں مسلّم رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ مختلف زمانوں میں نوعِ انسان نے مختلف مذاہب اختیار کئے مگر بحیثیت مجموعی انسانوں نے مذہب کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ اس سے یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ مذہبی جذبہ ایک ہمہ گیر ازلی اور فطری جذبہ ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ وہ خطّہ ہائے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارضی جن کو ہم ماضی اور دورِ حاضر میں حدّ درجہ پسماندہ غیر مہذّب اور ناشائستہ مانتے چلے آئے ہیں وہاں بھی کسی نہ کسی مذہب کا سکّہ جاری ہے۔ افریقہ کے وحشی انسانوں سے لے کر نام نہاد سفید فام مہذّب اقوام تک کسی نہ کسی مذہب کے قائل ضرور ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اس کائنات ارضی پر اَن گنت اور غیر محدود نعمتوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ ان کو دیکھ کر ایک حدّ درجہ ناشکرا انسان بھی حمد باری کے ترانے الاپنے لگتا ہے اور اس کے جسم کا ہر رگ وریشہ مجسم حمد بن جاتا ہے تشکر و امتنان کا یہی جذبہ مذہب کے احساس کو جنم دیتا ہے۔

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ مذہب دیگر انسانی جذبات کی طرح ایک جذبہ ہے اور ہر انسان دانستہ یا نادانستہ بخوشی یا ناخوشی کسی مذہب کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے بعض لوگ بظاہر مذہب کے منکر کہلاتے ہیں مگر بعض چیزوں کو مافوق الفطرت مانتے ہیں۔ گویا وہ اس چیز کو وہی درجہ دیتے ہیں جو مذہب خدا کو دیتا ہے۔ اس طرح وہ لامذہب ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود غیر شعوری طور پر ایک مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں۔

۱۱۔ مناظرِ قدرت میں تدبّر و تفکّر

مذہبی جذبہ کو قبول عام کی جو سند ملی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان جب گرد و پیش پر غور و فکر کرتا ہے تو بڑی آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ کائناتِ عالم کا یہ طویل و عریض سلسلہ کسی خالق و صانع کے بغیر عالم وجود میں نہیں آگیا۔ جب چھوٹی سی چیز اپنے وجود کے لئے کسی صناع کی صنعت گری کی مرہونِ منّت ہے تو اتنی بڑی کائنات از خود کیوں کر صفحۂ ہستی پر جلوہ گر ہو گئی۔ اس کے پہلو بہ پہلو یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ کارخانۂ قدرت خود بخود قائم نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اپنی بقا کے لئے ایک قیّوم (قائم رکھنے والا) کا محتاج ہے۔ یہی اندازِ شکر انسان میں مذہب کے اساس کے جنم دیتا ہے۔ فلسفہ بھی اسی کی پیداوار ہے۔

قرآن کریم اسی نقطۂ نظر پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتا ہے:۔

"بے شک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور شب و روز کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو دریاؤں میں چلتی ہیں لوگوں کے کام کی چیزیں لے کر اور پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے اُتارا۔ پھر زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کیا اور اس میں سب قسم کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو زمین اور آسمان کے درمیان اس کے حکم کا تابع ہے۔ ان سب چیزوں میں عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں۔

(البقرہ ۔۔ ۱۶۶)

اس آیت کریمہ میں مناظرِ قدرت کو ہستی باری تعالیٰ کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ طویل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وعریض کائناتِ ارضی جو دنیا کے ہر طلسم سے بڑھ کر حیرت انگیز اور سائنس کے ہر شعبہ سے عجیب تر ہے۔ نہ اپنے آپ وجود میں آسکتی ہے۔ نہ خود بخود قائم رہ سکتی ہے۔ جب تک کوئی صاحب شعور صاحب ارادہ قادرِ مطلق ہستی اس کی صانع و خالق نہ ہو۔ ان سارے مظاہرِ قدرت کا تسلسل و استمرار ان کی یک رنگی و ہم آہنگی ان کا نظم و ضبط ہر صاحبِ عقلِ سلیم کو یہ ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ کہ ان کے پیچھے ایک صاحبِ اختیار خدا کا ہاتھ کارفرما ہے کسی شاعر کا قول ہے:

وَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَہٗ آیَۃٌ ۔ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّہٗ وَاحِدٌ

(ہر چیز میں اللہ (خدا و تعالیٰ) کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے)

ظاہر ہے کہ مذہب کا منکر ان مظاہرِ قدرت کو دیکھتے ہوئے ان کے خالق و صانع سے انکار کر کے کس قدر بے بہا صداقت سے روگردانی اختیار کرتا اور کتنی بڑی جسارت کا ثبوت دیتا ہے۔

۱۲۔ انسان و حیوان میں فرق و امتیاز

انسان و حیوان کو اگر تقابل کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حیوان اپنی ضروریات کا سامان اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ان کا لباس ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے پنجے اور ناخن جیسے ہتھیار ان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کا یہ حال ہے کہ جب پیدا ہوتا ہے تو کسی قسم کا سامان اس کے پاس نہیں ہوتا۔ دشمن سے حفاظت کے لئے سینگ یا پنجے نہیں ہوتے۔ ہاتھ پاؤں کمزور ہوتے ہیں۔ جسم پر کوئی لباس نہیں ہوتا۔ اس کے آس پاس جتنی چیزیں ہیں سب اس کی دشمن نظر آتی ہیں۔ آفتاب کی گرمی جاڑوں کی سردی بادل کی جھڑی ہر چیز اس کی دشمن ہے۔

ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے قدرت نے انسان کو کوئی جسمانی ہتھیار نہیں دیا۔ قدرت نے اس کو ان ہتھیاروں کے عوض ایک ایسی عام قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے اس نے ہر قسم کے دشمنوں کے مقابلہ کے لئے ہر قسم کے لباس اور مکانات بنائے۔ جانوروں کے مقابلہ کے لئے تیغ و خنجر اور ریوالور تیار کی۔ دریاؤں پر پل باندھے۔ پہاڑ تراشے اور اس طرح پوری کائنات کو اپنے پنجۂ اقتدار میں لے لیا۔

اس قوت کا نام عقلِ انسانی ہے۔ چونکہ قدرت کو یہ منظور تھا کہ انسان ہمیشہ ترقی پذیر رہے اور کسی مرحلہ پر بھی آکر اس کی ترقی رکنے نہ پائے اس لئے قدرت اس کے مخالفوں کو نت نئے ہتھیار دیتی جاتی ہے۔ جس سے انسان پر نئے نئے حملے کئے جاتے ہیں۔ جن بیماریوں کا علاج معلوم ہو جاتا ہے ان کے علاوہ نئے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کا جغرافیہ جس قدر معلوم ہو چکا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے علاوہ نئی آبادیوں کا پتہ لگتا ہے اور وہاں نئی نئی ضروریات پیش آتی ہیں۔ آرام آسائش کے جو سامان مہیا ہو چکے تھے راحت طلبی کا مادّہ بڑھ کر وہ سامان بے کار ہو جاتے ہیں۔ مجبوراً انسان ان نئے مخالفوں کے مقابلہ کے لئے نئی نئی تیاریاں کرتا ہے اور ترقی کی جس حد تک پہنچ چکا تھا اس سے آگے نکل جاتا ہے۔ کائنات اور انسان کی یہ باہمی کش مکش ہی وہ چیز ہے جو انسان کی تمام ترقیوں کی جڑ ہے جس کی بدولت آج ہزاروں ایجادات ہو رہی ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

لیکن ان بیرونی دشمنوں سے زیادہ سخت اور خطرناک دشمنوں کا ایک گروہ ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے اور جس سے انسان ہمیشہ برسرپیکار رہتا ہے۔ دشمنوں کا وہ گروہ اخلاق قبیحہ ہیں جو ہر لحظہ انسان کو گھیرے رہتے ہیں۔ حرص و آز کینہ پروری جاہ طلبی اور اس قسم کے بے شمار دشمن انسان کے درپے آزار رہتے ہیں۔ ان دشمنوں سے بچانے کے لئے عقل بڑی حد تک کام کرتی ہے، وہ بتاتی ہے کہ اگر تم کسی کی آبرو کا قصد کرو گے تو وہ بھی تمہیں ذلیل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر تم دوسروں کی عزت نہیں کرو گے تو وہ تمہاری عزت نہیں کریں گے۔ مگر اس درجہ کی عقل خاص خاص تعلیم یافتہ اشخاص میں ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے مواقع پیش آتے ہیں۔ جہاں اس قسم کے انتقام کا مطلق اندیشہ نہیں ہوتا۔ حکومت کا خوف جاسوسی کا ڈر بدنامی کا احتمال انتقام کا خطرہ بالکل نہیں ہوتا ایسے مواقع پر عقل ان دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ بلکہ ایک دوسری قوت انسان ان دشمنوں کے حملوں سے بچاتی ہے۔ اس قوت کا نام نورِ ایمان ضمیر یا اخلاق ہے۔ یہی چیز مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ قوت انسان کی اصلی فطرت میں داخل ہے۔ عالم و جاہل شاہ و گدا اعلیٰ و ادنیٰ سب اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ انسان و حیوان کے مابین جو چیز حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ وہ مذہب اور صرف مذہب ہے۔ جب انسان مذہبی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے تو اس میں اور حیوانات میں کچھ فرق و امتیاز باقی نہیں رہتا۔

۱۳۔ مشترکہ خصوصیت

کائناتِ ارضی میں بسنے والے انسانوں میں مختلف قسم کے امتیازات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ و نسل، زبان تہذیب اور شکل و صورت کے اعتبار سے اقوام عالم میں خاصا فرق پایا جاتا ہے مگر ان میں بعض باتیں مشترک بھی ہیں۔ مثلاً اولاد کی محبت۔ دشمن سے نفرت، جذبۂ انتقام۔ کمال کی قدردانی۔ ان اوصاف کو اس لئے فطری سمجھا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے تمام انسانوں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔

نظر بریں جب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہر نسل ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے تو اس سے یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ مذہب فطری چیز ہے۔ علاوہ ازیں مذہب کے اصول عموماً تمام مذاہب میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا کی ہستی کا اقرار۔ اس کی عبادت کا تصور، اعمال کی جزا و سزا، راستی (سچ گوئی)، صداقت بیانی کا قابل تعریف ہونا اور جھوٹ، بدکاری اور چوری وغیرہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنا سب مذاہب کی اصل و اساس ہے۔

خالق کائنات نے افراد انسانی میں بے انتہا فرق مراتب رکھا ہے۔ دولت و مال۔ جاہ و حشم فضل و کمال۔ ذہانت و فطانت کے عطا کرنے میں ایک طرف تو یہ فیاضی ہے کہ اس سے زیادہ ممکن نہیں۔ رازیؒ و غزالیؒ، ابن تیمیہؒ اور ابن رشدؒ اسی فیاضی کے نمونے ہیں۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ انسان اور بندر میں بہت کم فرق باقی رہتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ ڈارون جیسے سائنسدان کو یہ فرق نظر تک نہیں آتا۔ اس کے باوجود جن چیزوں پر انسانی زندگی کا مدار و انحصار ہے۔ وہ سب انسانوں کو پوری فیاضی کے ساتھ عطا کی ہیں افریقہ کا جاہل سے جاہل وحشی بھی اسی طرح چلتا پھرتا، کھاتا پیتا، سوتا جاگتا اور بولتا چلتا ہے۔ جس طرح بڑے سے بڑا فلسفی اور عاقل ان ضروریات کو انجام دیتا ہے۔

اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مذہب کا اس قدر حصہ جو تمام قوموں میں مشترک ہے لازمہ انسانی ہے اور اسی لئے قدرت نے ان تمام موقعوں کو یکساں عطا کیا۔ فلاسفہ یونان بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ تک پہنچے کہ سچائی دیانتداری، پاکدامنی اور علم اچھی چیزیں ہیں لیکن افریقہ کا ایک وحشی کسی دلیل و برہان کے بغیر خود بخود ان چیزوں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

۱۴۔ مذہبی جذبہ کی تسکین

اس میں شبہ نہیں کہ مذہب ایک جذبہ ہے مگر اس میں اور دیگر جذبات میں گہرا فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔

جس طرح خالق کائنات نے انسان کے تمام جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے اسی طرح اس نے مذہبی جذبہ کی تسکین کا بھی اہتمام کیا ہے۔ قرآن کریم اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں انبیائے کرام تشریف لاکر انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ اس کائنات ارضی پر انبیاء کا ورود مسعود اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان طلب حق کے لئے کس قدر بیتاب ہے۔ انبیاء کو مبعوث کیا۔ اگر اس خاکدان ارضی پر انبیاء تشریف نہ لاتے تو بنی آدم زیور آدمیت سے عاری رہتے۔ پیغمبروں نے انسان کو شرف انسانیت بخشا۔ اس کی ہستی کی تکمیل کی اور ان کو مذاہب سے آگاہ و آشنا کیا۔

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت پر روشنی ڈالتا ہے کہ انسان میں طلب حق کا جو جذبہ موجزن تھا اس کی تسکین کے لئے خداوند عالم نے انبیائے عظام کے ذریعے جو ہدایت بھیجی اس کا نام مذہب ہے۔ مذہب انسان کو ایک ہمہ گیر زاویۂ نگاہ دیتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوتا ہے کہ اس کائناتِ ارضی کی ہر چھوٹی بڑی چیز انسان کے لئے مظہرِ ربوبیت بن جاتی ہے اور وہ ہر چیز میں خداوندی جلالی و جمالی کا نظارہ کرنے لگتا ہے۔ اس نقطۂ نگاہ کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ مثلاً سیاست و معاشرت ہو یا معیشت صلح و جنگ ہو یا الفت و عداوت ان تمام شعبہ ہائے حیات پر اسی نظریہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔

۱۵۔ مذہب ایک ابدی صداقت ہے

یہ حقیقت ہے کہ منکرین مذہب کا ایطلان ثابت نہیں کر سکے منکرین مذہب یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا کا تصور پیدا نہیں ہوتا۔ اہلِ یورپ نے مذہب کے خلاف جو جدید فلسفہ ایجاد کیا تھا۔ حق یہ ہے کہ وہ مذہب کی تردید نہ کر سکا۔ بخلاف ازیں جدید دور کے تقریباً ہر چھوٹے بڑے فلسفی نے اپنی اپنی دانست میں خدا کے وجود اور مذہب کی ضرورت پر دلائل فراہم کئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مفکرین مذہب کی ضرورت کے قائل ہیں۔

مندرجہ صدر حقائق اس بات کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ مذہب کی ضرورت و اہمیت تاریخ انسانی کے ہر دور میں مسلم رہی ہے مغرب کے جو علماء مذہب کی مخالفت کرتے ہیں، ان کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ مذہب علم و عقل کا مخالف ہے۔ چنانچہ فرانس کا مشہور عالم ہجمن کانستان لکھتا ہے:۔

"مذہب جن بنیادوں پر قائم ہوا ہے وہ علم کے مخالف ہیں۔ اس لئے یہ قطعی بات ہے کہ تمام مذاہب کو ختم کر دینا چاہیئے"

مگر جو دین (دین اسلام) دنیا میں علم و عقل کا علمبردار ہو کر آیا ہو اور جس کا مقصدِ وجود ہی یہ ہو کہ دنیا میں علم کی ہر ممکن اشاعت کی جائے۔ جو ہر قدم پر عقل و فکر سے کام لینے کی تاکید کرتا ہو۔ اس کی صداقت و حقانیت سے کس کو مجالِ انکار ہو سکتی ہے؟ دین اسلام تو وہ ہے جس نے رسالت و نبوت کے قافلہ سالار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر مناصبِ جلیلہ کے ساتھ ساتھ معلمِ اعظم کا منصب عطا کیا۔ ان کی پیروی میں مسلمانوں نے اس ظلمت کدۂ ارضی کو علم و عقل کی روشنی سے بقعۂ نور بنا دیا اور امام غزالی، رازی، ابن تیمیہ، ابن سینا اور ابن رشد جیسے لوگ پیدا کئے۔ ایسا مذہب علم و عقل کا دشمن کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر عقل کے اندھوں کو یہ روشنی نظر نہ آئے تو اس میں اسلام کا کیا قصور ہے شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

؎ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ۔ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

ایک دوسرے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکھ والا تیری قدرت کا تماشا دیکھے ۔ چشمِ بے نور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۶۔ انسانی زندگی میں مذہب کا مقام

سابقہ بیانات میں ہم علم و عقل کی روشنی میں دیکھ چکے ہیں کہ مذہب انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انفرادی زندگی پراگندہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مذہب انسانی زندگی کے کن کن گوشوں کو متاثر کرتا ہے؟ یہ اثرات کس طرز و انداز کے ہوتے ہیں اور ان میں کس حد تک پائیداری پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ مذاہب عالم میں کچھ حقائق مشترک حیثیت رکھتے ہیں مثلاً جملہ مذاہب میں سچائی۔ دیانتداری۔ راست بازی رحم و کرم اور اس قسم کے دیگر اخلاقی جلیلہ و جمیلہ کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی مذہب ایسا نہیں جو چوری۔ سینہ زوری اور بدکاری و ناہنجاری کو پسند کرتا ہو۔ اسی طرح چند ایک مذاہب کو چھوڑ کر توحید کے مسئلہ میں بھی تقریباً سب مذاہب متفق ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مذاہب عالم کے یہ متفقہ و مشترک حقائق انسان پر خوشگوار اور پائدار اثر ڈالتے ہیں کسی مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص اپنی عملی زندگی میں اس حد تک آزاد شخص کی طرح لاپرواہ نہیں ہو سکتا جو سرے سے کسی مذہب کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو۔ الا مذہب اشخاص صرف مذہب ہی سے عاری نہیں ہوتے بلکہ وہ ہر قسم کی اخلاقی حدود و قیود سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔

اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اسلام کے سوا دیگر مذاہب میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن پر اپنے مذہب کی گہری چھاپ ہوتی ہے اور وہ سیرت و کردار اور اخلاق و معاملات کے اعتبار سے بڑے پایہ کے لوگ ہوتے ہیں تقسیم ملک سے پہلے ہم نے ہندوؤں اور سکھوں میں اس کی نظیریں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ جب مشرقی پنجاب کے مسلمان اپنا وطن عزیز زندگی کا بیش قیمت سرمایہ اور اثاثہ تو چھوڑ ہی رہے تھے اپنی آبرو اور ناموس کو بھی خطرہ میں دیکھتے تھے۔ اس وقت بعض نیک نہاد سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی بلند اخلاقی اور انسان دوستی کا جو عملی ثبوت بہم پہنچایا وہ مشرقی پنجاب سے آنے والے مسلمانوں کو ابھی تک نہیں بھولا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو بحفاظت تمام پاکستان کی سرحد تک پہنچایا بلکہ مسلم خواتین کو اپنی بہو بیٹیوں کی طرح عزیز رکھا اور انہیں پاکستان کی حدود میں داخل کر کے واپس لوٹے۔ اس کا عملی مشاہدہ ہم کر چکے ہیں۔

قرآن حکیم نے غیر مذاہب کے پاکیزہ خصال نیک نہاد اور مذہب دوست اشرفاء کی مدح و ستائش میں بخل سے کام نہیں لیا۔ بلکہ بڑی کشادہ دلی سے ان پر تعریف و توصیف کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ قرآن کریم میں یہود و نصاریٰ کے اعمال قبیحہ و افعال شنیعہ کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ قابل توصیف لوگوں کے حق میں کلمات تحسین بھی وارد ہوئے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ارشاد فرمایا:

" سب اہل کتاب برابر نہیں ہیں۔ ان میں ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود ہے جو راتوں کو خدا کی آیات پڑھتے اور بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے، اچھی باتوں کا حکم دیتے، بُرے کاموں سے روکتے اور نیک کاموں میں عجلت سے کام لیتے ہیں۔ اور یہی لوگ نیک نصیب ہیں۔ ایسے لوگ جو نیک کام بھی کریں گے۔ اس کی ہرگز ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اللہ پرہیزگاروں کو جانتا ہے۔" (آل عمران — ۱۱۳)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ اسلامی فلسفۂ حیات

سابقہ ابواب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت مذہب ہے۔ اس کے بغیر انفرادی زندگی پراگندہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ مختلف مذاہب اور اجتماعی تحریکات کا جائزہ لے کر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آج کے مسائل کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اب ہم اسلام کے فلسفۂ زندگی کو اس کے دلائل کے ساتھ پیش کریں گے۔ آگے کی بحث کو سمجھنے کے لئے چند باتیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔

۱۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب اُس وقت رونما ہوتی ہے جب اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ ایک مستقل سیرت کے بغیر انسان کی زندگی پر انتشار اور پراگندگی کا غلبہ رہتا ہے اور وہ اپنا کوئی مستقل رنگ پیدا نہیں کر پاتا بلکہ مرغِ بادنما کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنا رُخ بھی بدل لیتا ہے۔

۲۔ جس طرح فردِ واحد کی زندگی کو پراگندگی سے بچانے اور اس میں ضبط اور نظم پیدا کرنے کے لئے ایک مستقل سیرت کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص اور ایک معاشرہ کو انتشار اور تفرقہ سے بچانے اور اسے ایک منظم اور متحد جمعیت بنا دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اساس مشترک اقدار پر ہو، اس پر ایک ہی رنگ غالب ہو اور ایک ہی رشتۂ اتحاد میں سب جڑے ہوئے ہوں۔

۳۔ انفرادی اور اجتماعی سیرت کی بنیاد ان تصورات پر قائم ہوتی ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں۔ اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہی کے زیرِ اثر رہ کر کام کریں۔ اس رسوخ کا اصطلاحی نام "ایمان" ہے اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو "ایمانیات" یا "عقاید" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی ذہنی بنیاد کا نام "ایمان" ہے۔ ایمان کا لفظ "امن" سے نکلا ہے۔ "امن" کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔ اسی سے "امانت" ہے جو ضد ہے "خیانت" کی، یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل کو اطمینان اور وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہیں کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اُس کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آمون کہتے ہیں کیوں کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اس مادّے کا باب افعال "ایمان" ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جما لی جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کا کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا، اُس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوتی ہے۔ اور اسی سے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کے برعکس ہے مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس اور یقینی بنیادوں پر قائم ہو گئی، اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک ٹھیک اس تخیل کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے اور جس سے سیرت کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

۴۔ اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقاید و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی سیرتیں مختلف اور متضاد بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہو گی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیئے گئے اور ایک مضبوط دیوار قائم ہو گئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائے گا، جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں یک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہو گا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہو گی، ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت، نئے خیالات اور نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور تہذیب کا قصر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی۔

۵۔ جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں اور جس کے ایمانیات محض دنیوی امور پر مشتمل ہوں اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہوتی ہے۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا۔

۶۔ تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لیکر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا ساتھ دے سکیں، اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجہ کا دیندار بھی ہو اور دنیادار بھی، بلکہ اس کی دنیاداری میں دینداری ہو اور دین داری میں دنیاداری۔

۷۔ جس قوم کا مذہب اور تہذیب ایک ہوں اس کا ایمان محض مذہبی ایمان نہیں ہوتا بلکہ بعینہٖ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اسکی تہذیب دونوں کے لئے غارت گر ہے اور اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کیلئے تباہ کن ہے۔

۱۔ تصورِ کائنات

کائنات سے متعلق انسان کے نظریات میں عظیم تضاد رہا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ محض ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو تنظیم یا ترتیب نظر آتی ہے وہ بھی اتفاقی ہے۔ ورنہ بحیثیت کل نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ اس میں ہمہ گیر نظم پایا جاتا ہے۔ انسان خود بھی ایسے ہی ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے، اس کا بھی کوئی مقصد نہیں، اس کی زندگی میں بھی ترتیب اور اخلاقی نظم کی حاجت نہیں۔ لہٰذا وہ تعلق جو کائنات اور انسان کے مابین قائم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان چند طبعی خواہشات رکھتا ہے اور کائنات ان خواہشات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتی ہے، اور اس طرح حیات طبعی کے قیام میں مدد دیتی ہے۔ پھر چونکہ کائنات مکمل نظم و انتظام سے عاری ہے اس لئے کبھی زندگی کے قیام کے بجائے زندگی کے اختتام کا سبب بنتی ہے۔ چناں چہ کبھی وہ طوفانوں کے ذریعہ انسانی بستیوں کو تباہ کرتی ہے، کبھی زلزلوں کے ذریعہ زندگی کو نیست و نابود کرتی ہے اور کبھی آتش فشانی کے ذریعہ انسانی آبادیوں کو خاکستر کرتی ہے۔

کسی کے نزدیک یہ کائنات محض ایک وجود کی مظہر ہے۔ درخت، دریا، پہاڑ، چاند، سورج اور خود انسان اُسی ایک واحد الوجود کے جلوہ نما ہیں۔ ان کا اپنا نہ کوئی وجود ہے اور نہ کوئی حیثیت، ان کا عمل خدا کا عمل، ان کی حرکت خدا کی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے۔ چونکہ حقیقتاً یہ سب ایک ہی وجود کے مظاہر ہیں اس لئے کسی ترتیب یا نظم کے ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کہ ترتیب ایک سے زائد اشیاء ہی میں ہو سکتی ہے۔ پھر چونکہ انسان بذات خود کوئی ارادہ نہیں رکھتا اس لئے جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود نہیں۔ اور چونکہ اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں اس لئے اس کے اور کائنات کے درمیان کسی مستقل رشتہ کا تعین ممکن نہیں۔ انسان کائنات میں اپنی منفعت کی خاطر تصرف کرتا ہے تو، اس کو خواہ مخواہ تباہ کرتا ہے تو، اس سے بلا وجہ اجتناب کرتا ہے تو اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو خواہ مخواہ تباہ کرتا ہے تو، اس سے بلاوجہ اجتناب کرتا ہے تو، یا خود اس کا شکار ہوتا ہے تو سب ٹھیک ہے اس لئے کہ جس وقت جو کچھ بھی ہوا، اسی واحد الوجود کے ارادے اور رضا سے ہوا۔ کسی اور کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک آلہ ہے جو کسی قوت کی حامل یا کسی منفعت کا سبب ہے۔ چنانچہ دریا اگر بہالے جانے کی قوت رکھتا ہے تو معبود ہے، آگ اگر جلا سکتی ہے تو پرستش کے قابل ہے، سانپ اگر ڈس لیتا ہے تو لائق تعظیم و معبودیت ہے۔ غرض کائنات کی ہر ہر شے مخدوم اور انسان ان کا خادم ہے۔

ان کے علاوہ بھی کائنات اور انسان سے متعلق کچھ نظریات ہیں لیکن انتہا پسندی اور کجروی ان سب کا خاصہ ہے۔ اسلام ہی ایک ایسا نظام فکر و عمل ہے جو کائنات و انسان سے متعلق ایک متوازن و معقول نظریہ ہے۔

۲۔ اسلامی تصور کی توضیح

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں، بلکہ منضبط، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اس کو بنایا، وہی اس کا مالک اور وہی اس کا حاکم ہے۔ یہ ایک نظام کلی ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں اسی کے زیر حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اس ہمہ گیر نظام میں کسی کی خود مختاری اور غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور نہ فطرتاً ہو سکتی ہے۔

پھر بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے اور نہ اس کے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک طرح کی خود مختاری انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ جس طرح چاہے کام کرے، مالک کی روش کی بھی انتظار کر سکتا ہے اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتا ہے۔ ہر صورت میں اس کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور وہ مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے مدارج طے کر سکے، اس نے اس کو سمجھ بوجھ، انتخاب کی آزادی اور ایک طرح کی خود مختاری عطا کر کے چھوڑ دیا ہے۔

یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اس لئے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب نہیں ہو سکتے، اور اگر وہ مرتب ہو سکتے ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو صرف اس حد تک جس حد تک قوانین طبیعی ان کو مرتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لئے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کا اخلاقی نتیجہ مرتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اس کا سراغ لگنے اور اس پر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مرتب ہی نہ ہوگا اور اگر وہ سازگار بھی ہو لیں تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکیں گے کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا ارتکاب اس نے کیا تھا۔ اس لئے یہ دنیا دار الجزا نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عمل نیک کا انعام ہی ہو۔ وہ اس بات کی علامت نہیں کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کر کے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکالیف، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی لازماً کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں، بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کر کے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ چوٹ لگتی ہے۔ بہرحال یہ دنیا دار الجزا نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔

۳۔ اسلام کا تصورِ انسان

انسان کو ابتداء سے ہی کائنات کی طرح اپنے متعلق بھی بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی جاری ہے۔ کبھی وہ افراط پر اترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند ہستی سمجھ لیتا ہے، غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں پھر جاتی ہے، کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا اپنے مدِ مقابل بھی نہیں سمجھتا، اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ کبھی تفریط کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، ہوا، آگ، بادل، بجلی، بھالا، سورج، تارے، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا منفعت نظر آتی ہے۔ اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی [illegible] دیکھتا ہے تو ان کو [illegible] معبود اور حاکم مطلق [illegible] بنا لیتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے :

يَاأَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ (الانفطار)

(اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا، تیرے اعضاء درست کئے تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی)

اس اور اسی قسم کی دوسری آیات میں انسان کے غرور و تکبر کے بتوں کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ! خدا تجھے کن حقیر اجزاء سے پیدا کرتا ہے۔ پہلے رحم مادر میں ایک گوشت کا لوتھڑا بناتا ہے، پھر اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس کو اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوتی۔ خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے۔ جوان ہوتا ہے، طاقت ور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں، تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں، تیرا علم نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ مال املاک، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصۂ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں۔

تجھ سے بالاتر ایک اور قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادۂ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کرلے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سامان مہیا کرلے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب دھری کی دھری رہ جاتی رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوتے پر اکڑتا ہے، پھولا نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نمرودیت کا دم بھرتا ہے۔ جبار و قہار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

اس تکبر شکنی کے بعد اسلام وہ اعلیٰ مقام بھی متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے، وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل - ۷)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ۔ (الحج - ۹)

اے انسان! کیا تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تیرے لئے مسلم بنا دیا ہے۔

ان آیات میں اور ایسی ہی بہت سی دوسری آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تمہارے فائدے اور خدمت کے لئے مسخر کردی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور یہ روشنی، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو تم دیکھ رہے ہو تمہاری خادم ہیں اور دراصل تمہاری منفعت کے لئے ہیں۔ تمہارے لئے انہیں کارآمد بنایا گیا ہے۔ تم ان سب پر فضیلت رکھتے ہو۔ تم کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے تم کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تم اپنے خادموں کے آگے سر جھکاتے ہو؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتے ہو؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتے ہو؟ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہو؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتے ہو؟ اس طرح تو تم اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو، آپ اپنا مرتبہ گراتے ہو، خادموں کے خادم، غلاموں کے غلام خود بنتے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزعم خود اپنے آپ کو سمجھتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟

مقامِ انسانیت

اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے۔

"اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا، کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خوں ریزیاں کرے گا، حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا، میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے، اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے، پھر اُن کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا، اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ، انہوں نے کہا، پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک۔

خدا نے کہا، اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ، پس جب آدم نے ان کو اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا، کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں، اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم سے کہا کہ، اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو بہ فراغت کھاؤ۔ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے ان کو وہاں سے نکلوا دیا۔" (البقرہ - ۴)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا، اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں، فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا اور اس طرح ملکوتیت، اس کے آگے جھک گئی مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح ملکوتیت کے آگے نہ جھکا۔ حقیقت میں [illegible] حقیر پیدا تھا مگر خدا نے اس میں جوہر [illegible] تھا اور اس کو جو علم [illegible] اس نے اس کو دنیا میں خدا کی [illegible] بنا دیا۔ [illegible]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اس کے آگے جھک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا، اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانہ ہوگا۔

۵۔ انسان کی عظمت کے وجوہ

انسان کی عظمت کو ثابت کرنے کے لئے اسلام نے بڑا عقلی انداز اختیار کیا ہے۔ قرآن نے تین اہم سوالات اُٹھا کر انسانی عظمت کا اثبات کیا ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں:

۱۔ کائنات کیا ہے؟ ۲۔ کائنات کا بنانے والا کون ہے؟

۳۔ انسان کو کیا حیثیت حاصل ہے؟

اسلام نے ان تینوں سوالات کا تفصیلی جواب دیا ہے چونکہ ہمارے موضوع کا تعلق صرف آخری سوال سے ہے۔ اس لئے ہم اس پر تفصیلی روشنی ڈالیں گے۔

۶۔ انسان اور کائنات

مختلف مذاہب میں مظاہر فطرت کی پرستش کا سبب ہی یہ ہے کہ انسان اور کائنات کے رشتہ کو نہیں سمجھا گیا۔ انسان کائنات کی مختلف پُرشکوہ چیزیں دیکھ کر ان کے سامنے جھکنے لگتا ہے حالانکہ اس کے لئے ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات کی مختلف اشیاء انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ وہ انسان کی خدمت کے لئے مامور ہیں اور وہ ان سے کام لے سکتا ہے۔ اسے ان کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی ضرورت نہیں۔ قرآن پاک میں اسے بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

"خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" (البقرہ - ۲۹)

جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے اس نے سب کا سب تمہارے فائدے کیلئے پیدا کیا ہے۔

"وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ" (النحل - ۱۲)

اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر بنایا اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں۔

قرآن پاک اشیاء کائنات کو انسان کے لئے نافع اور مفید خدمت گزار اور مسخر قرار دیتا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ان کے سامنے سربسجود ہونا اور ان سے حاجت روائی کی دعا کرنا اس کی کم فہمی اور ناعاقبت اندیشی ہے۔ دنیا میں اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کو اشرف المخلوقات قرار دیا اور اس کو پوری کائنات پر فضیلت و برتری عطا فرمائی۔

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا" (بنی اسرائیل۔ ۷۰)

اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا کی اور خشکی و تری کی طاقتیں اس کے تابع کر دیں جو اس کو اٹھائے پھرتی ہیں اور پاکیزہ چیزیں اس کے کھانے کو دیں اور بہت سی مخلوقات پر ہم نے اس کو فضیلت و برتری دی۔

زمین، آسمان، چاند، سورج، دریا، سمندر، خشکی و تری، سب انسان کے انتفاع کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اس کی عبادت و پرستش کے لئے نہیں۔ اقبال نے بہت خوب کہا ہے

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے — جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ فضائیں — تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینہ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

قرآن کریم میں فرمایا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین۔۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا۔

عظمتِ انسان اور احادیث نبویہ

متعدد احادیث نبویہ سے عظمتِ انسان کا اثبات ہوتا ہے حضورؐ نے فرمایا:

۱۔ خَلَقَ اللّٰهُ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (مشکوٰۃ ص ۳۹۴) — اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔

۲۔ اِذَا ضَرَبَ اَحَدُكُمْ خَادِمَهٗ فَلْيَتَّقِ الْوَجْهَ۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۸۵۳ مطبوعہ مصر) — جب تم میں سے کوئی اپنے خادم کو سزا دے تو چہرے پر مارنے سے احتراز کرے۔

۳۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یوں نہ کہو خدا تیرے چہرے کو بگاڑے اس لئے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ (الادب المفرد للبخاری ص ۱۰۷)

مذکورہ صدر آیات و احادیث میں انسانی عظمت و فضیلت کو بیان کیا گیا ہے ایسی فضیلت جس میں اور کوئی مخلوق اس کی شریک نہیں۔ انسان کے چہرے کی تعظیم اس کی فضیلت کے سبب ہے انسان کی صورت کی، خدائی صورت سے تشبیہ بھی دراصل بیان فضیلت ہی کا ایک انداز ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانی فضیلت کی اصل اس کی نائبانہ حیثیت میں ہے۔ انسان نائب خدا ہے۔ اس لئے وہ صاحبِ فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی شان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا تھا فرشتوں کے اعتراض کرنے پر انسان کی حمایت میں فرمایا:

" اِنِّیْ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" (البقرۃ۔۳۰) (جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

کائنات کی کوئی اور مخلوق اس فضیلت میں انسان کی شریک نہیں۔ انسان کے سوا کوئی بھی خلافت کا اہل نہیں۔ اس لئے اسے امانت قرار دیا ہے اور انسان کو اس کار خیر میں شریک ٹھہرایا کیونکہ باقی مخلوق نے بارِ امانت اُٹھانے سے انکار کر دیا۔ مگر انسان نے اُسے اُٹھا لیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

۸۔ غلط فہمی کا ازالہ

اسلام نے اگرچہ انسانی عظمت کا مدار تقویٰ کو قرار دیا ہے لیکن مطلق مخلوق ہونے کے لحاظ سے اسلام بھی اس کی فضیلت کا اعتراف کرتا ہے۔ اسلام میں عظمتِ انسان کا حقیقی تصور گوشت پوست یا نسل و خون سے وابستہ نہیں ہے۔ اسلام تو انسانیت کی برتری اور فضیلت کا علمبردار ہے نسل و خون سے وابستہ تصور غلط ہے، اس غلط احساسِ عظمت نے دنیا کو ظلم کدہ بنا دیا ہے۔ قرآن نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ"۔ (الروم۔ ۴۱) لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے خشکی اور تری میں فساد رونما ہو گیا۔

اسلام انسانی شرف کے لحاظ سے سب کو مساوی قرار دیتا ہے کسی شخص کو اظہارِ فضیلت کا ایسا کوئی حق نہیں جس سے فساد بپا ہو۔ آنحضورؐ نے فخر و غرور کو ملعون قرار دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاکم و محکوم، آقا و غلام اور ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز اُٹھ گئی اور انسان اپنے اصل مقام پر آ گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

" جو لوگ اپنے مرے ہوئے آباء پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ انہیں باز آ جانا چاہیئے وہ فقط دوزخ کے کوئلے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نجاست کے کیڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہونگے، جو نجاست کو ناک سے دھکیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور آباء پر فخر کو دور کر دیا تو وہ مومن متقی ہوتا ہے یا بدبخت فاجر ہوتا ہے سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی کے تھے۔" (مشکوٰۃ کتاب الادب)

ایک دوسری حدیث میں فرمایا "کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر سوائے تقویٰ کے۔" (مسند احمد)

ان تمام احادیث میں فضیلت کے غلط تصور کو مٹا دیا گیا ہے۔ ہر انسان پیدائشی طور پر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوسرے کے برابر ہے۔ فرق صرف اخلاق و تقویٰ کا ہے۔ اس قدرتی اور اکتسابی فرق کے سوا ہر تفریق مصنوعی ہے اور نسلِ انسانی کے لئے باعثِ ہلاکت۔

۹۔ انسان کا منصب خلافت

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں :۔

اوّلاً یہ کہ انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ماتحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی خادم ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذلت ہے۔ اگر جھکے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا اور گویا نیابت الٰہی کے منصب سے خود دستبردار ہوگا

دوسرے یہ کہ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ اسے اس بات کا اختیار نہیں کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں کو خود اپنی رعیت، اپنا نوکر اور اپنا خادم بنا لے کہ ایسا کرے گا تو باغی قرار پائے گا۔ اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں اپنے آقا کی املاک کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے، اس سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے، مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نمائندہ ہے اور جتنی چیزیں اس کے زیرِ حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

اس امانت میں نہ صرف دنیا کی ہر چیز شامل ہے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا جس طرح بقیہ اشیاء کا وہی تصرف مناسب ہے جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اسی طرح خود انسان کا جسم اور اس کی جان بھی خدا کی ہدایات کے مطابق استعمال ہونی چاہئیں۔ خدا نے اپنی مرضی وحی و الہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی اور خدا کا مربوط اور مفصل قانون کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھ کر اپنے اعمال و افعال خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالے۔

تیسرے یہ کہ نہ صرف انسان کا عمل خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مطابقت اتفاقی نہ ہو۔ نائب کا کام یہی نہیں کہ وہ ایسے افعال انجام دے جو آقا کی نظر میں پسندیدہ ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ نائب یہ افعال آقا کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر کے اس کی رضا کی خاطر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا، نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جوابدہ ہونے کا احساس کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اوّل تو یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے تخیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کئے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار اور بے وزن ہیں۔

چوتھے اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ نائب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا وہ حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی، حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبیر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ پس انسان کو بھی نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہی روش اختیار کرنی چاہیئے جو خود خدا کی روش ہے۔ مخلوق کی ویسی ہی خبر گیری، وہی رحمانی و رحیمی، وہی عدل، وہی رحم و کرم، ویسا ہی قہر و جبر جو خود خدا کے اخلاق میں شامل ہے، انسان کو چاہیئے کہ اپنے کردار میں بھی راسخ کرے۔ یہی مفہوم ہے جو "تخلقوا باخلاق اللہ" کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے میں یہ صفات اس حد تک پیدا نہیں کر سکتا جس حد تک خدا کی ہیں، کہ درجۂ نیابت درجۂ خداوندی کے آگے ہیچ ہے، لیکن اپنی حد تک ان صفات میں زیادہ سے زیادہ ملکہ پیدا کرنا بھی صحیح اسلامی زندگی ہے۔

پانچویں یہ کہ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جسم انسانی) اور خدا کی پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانۂ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے۔ اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیئے۔ اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں، ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تحقیقات ہونی چاہئے کہ اس نے کس طرح انجام دیں۔ اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی، بغاوت اور فرض ناشناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیئے اور اگر ایمانداری، فرض شناسی اور اطاعت کوشی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے۔

چھٹے یہ کہ ہر انسان نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے اچھے بُرے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا، نہ اس توقع کی کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کے نتائج اور ان کی سزا سے بچ جائیں گے۔ اور نہ اس کا کوئی خطرہ باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہوگا۔ یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ لہٰذا دنیا برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کرکے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

۱۰۔ اسلامی نظریہ کی افادیت

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو اسلام نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اس کے تمام اجزاء میں منطقی ربط ہے کوئی جز دوسرے جز کے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جاسکتی ہو۔ لہٰذا یہ ایک علمی نظریہ ہے۔ "علمی نظریہ"[1] کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو، لہٰذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اس کو شمار نہیں کیا جا سکتا[2]۔

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس سے اس نظریہ کی صداقت اور برتری پر روشنی پڑتی ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین عقل ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ

---

[1] SCIENTIFIC THEORY

[2] کسی زمانے کے کچھ علمی نظریات کا بظاہر اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ ایک علمی نظریہ کو صرف حقائق توڑ سکتے ہیں نہ کہ نظریات۔ لہٰذا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ انہیا کے پیش کئے ہوئے اس تصور کائنات و انسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس کو ٹوٹے ہوئے نظریات میں شمار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ دعویٰ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور صرف ایک ناظم کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے بہ نسبت اسکے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے ـــــ پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری وغیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیئے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیئے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں۔ تو یہ بالکل ایک قابل عمل نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ زندگی کا پورا نظام اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر بنتا ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لئے، علوم وفنون کے لئے، ادب اور ہنر کیلئے، سیاست اور انتظام مملکت کے لئے، صلح وجنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ضرورت کے لئے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لئے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

سوالات متعلقہ باب اوّل

۱۔ اسلام کا معنی ومفہوم بیان کرتے ہوئے اُس کے تصوّرِ دین کا تعارف کرائیے۔
۲۔ اسلام کی امتیازی خصوصیات پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم کیجئے۔
۳۔ اسلام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا کیا حل پیش کیا ہے
۴۔ وحی کی حقانیت دلائل وبراہین کی روشنی میں ثابت کیجئے۔
۵۔ مذہب کو انسانی زندگی میں کیا مقام حاصل ہے اور کیوں؟
۶۔ اسلامی فلسفۂ حیات پر ایک عالمانہ شذرہ قلمبند کیجئے۔
۷۔ دینِ اسلام کی نگاہ میں کائنات اور انسان کا کیا تصوّر ہے، تفصیلاً لکھئے۔
۸۔ انسان کیوں کر منصبِ خلافت پر فائز ہے اور خلیفۃ اللہ ہونے کے اعتبار سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

اسلام کے بنیادی عقاید

۱۔ توحید (وجود باری تعالیٰ، توحید کے دلائل، عقیدۂ توحید کے اثرات)

۲۔ تعلق باللہ اور اس کی بنیادیں

۳۔ رسالت

۴۔ آخرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب دوم

اسلام کے بنیادی عقاید

۱۔ اسلام میں عقیدہ کی اہمیّت

اسلام کے دائرہ میں داخل ہونے کے لئے چند باتوں کو جاننا اور ماننا ضروری ہے۔ اسی کا نام ایمان یا عقیدہ ہے۔

انسان کے تمام افعال و اعمال کا مرکز و محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ انہی اصولی و بنیادی خیالات کو عقائد کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اسی کے دائرہ حیات کا ہر خط اُسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال و حرکات اور ہمارے ارادہ کے محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات و جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں اُن کو "دل" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا:

"انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں! وہ ٹکڑا دل ہے۔" (صحیح بخاری کتاب الایمان)

غرض یہ کہ ہمارے دل کا ارادہ اور نیّت ہی تمہارے اعمال کی محرک ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پُرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" (تمام کاموں کا دارومدار نیّت پر ہے) (صحیح بخاری)

لہٰذا صحیح اور صالح عمل کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم چند اصول و ضوابط کو اپنے دل و دماغ میں اس طرح جگہ دیں کہ ان کی صداقت میں شبہ باقی نہ رہے اور اسی صحیح یقین اور مضبوط عقیدہ کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ اسی عقیدہ کو ایمان کہتے ہیں۔ ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ "عمل صالح" کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے۔

عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے ظہورِ اسلام سے قبل بہت نیکی کے کام کئے تھے۔ تاہم وہ مشرک تھا۔ حضرت عائشہ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں جو نیکی کے کام کئے کیا اس کو ان کا ثواب ملے گا؟ فرمایا "نہیں اے عائشہ" کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ خداوندا میرے گناہوں کو قیامت کے دن معاف فرما دے۔

(مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۱۲۹)

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے۔ بے کار اور بے بنیاد ہیں۔

قرآن میں فرمایا:

" جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔

(سورۂ ابراہیم - ۱۸)

حاصل بحث یہ ہے کہ ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی۔ ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے۔ جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے اس کے نہ ہونے سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ خدا کی ہستی اور جزا سزا کا یقین اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ ایمان ہمارے دل کا نور ہے۔ وہ نہ ہو تو پوری زندگی تاریک ہو جائے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش اور شہرت طلبی جیسے پست جذبات اور محرکات پر ہو۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے ایمان اور عمل دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے عمل ایمان کا ثمرہ ہے۔ ایمان کا پتہ عمل ہی سے چلتا ہے۔ اس لئے عمل کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں عقائد کی طویل فہرست نہیں پائی جاتی۔ اسلام نے عقائد کے اتنے ہی حصہ کو ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور اخلاق و عبادت کی بنیاد قرار پا سکے۔ چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں۔ ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں عقاید کے صرف پانچ اصول بیان فرمائے۔

(۱) ایمان باللہ (۲) ایمان بالرسل (۳) ایمان بالکتب (۴) ایمان بالملائکہ (۵) ایمان بالیوم الآخر۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے اُن کا اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر نہ کوئی عمل خالص ہو سکتا ہے نہ مقبول۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ اسلامی عقاید عقل کی کسوٹی پر

اوپر کے صفحات میں جن پانچ بنیادی عقاید کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سب امور غیب کی قبیل سے ہیں اور عالم آب و گل سے ماورا۔ اس لئے یہ مذہبی و روحانی ایمانیات ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر اپنے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی رکھی ہے۔ اس نے دین و دنیا دونوں کو ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لئے جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے لئے قوت کا ایک لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسد کبھی بند نہیں ہوتی۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ جن ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ہے وہ عقلی حیثیت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک ہمہ گیر اور ترقی پذیر نظام کے لئے اساس اور منبع قوت بننے کی صلاحیت کہاں تک موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع انسانی کی فلاح اس کا مقصود ہو اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو سکے۔ جس میں ہر اس چیز کو پروان چڑھایا جائے جو انسان کے لئے بحیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے اور ہر اس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لئے شر اور فساد ہے۔ ایک ایسی خالص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جا سکتی جو محض عالم آب و گل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں ہے مثلاً سورج، چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ، یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں ہے، مثلاً وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو "ایمانیات" بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی اصلاح میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں از روئے علم و عقل غلط ہے۔ علاوہ بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا۔ رہیں دوسری قسم کی چیزیں تو ظاہر ہے کہ مشترک انسانی تہذیب کے لئے اساس نہیں بن سکتیں کیوں کہ وہ بنائے تفریق و تقسیم ہیں نہ کہ بنائے جمع و تالیف۔ لہٰذا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیت و محسوسات سے ماورا ہوں۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماورا ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات بھی پائی جائیں۔

(۱) وہ خرافات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے امور ہوں جن کی تصدیق پر عقل سلیم مائل ہو سکتی ہو۔

(۲) وہ دور از کار باتیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہو۔

(۳) ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوائے فکر و عمل پر تسلط قائم کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کر سکے۔

اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں۔

اوّلاً، اسلام نے اللہ، ملائکہ، وحی، رسالت، اور یوم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن ہو، نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محض عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ہمارے اہلِ علم و حکمت نے اب تک جتنے مجردات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ توانائی حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقا ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں، بلکہ اس بناء پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہ و تعلیل کے لئے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظواہر اشیاء کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کئے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا اقتضا کرتے ہیں۔ پس اسلام جن مجردات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لئے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے بلکہ اس کے لئے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، وہ خلاف عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کئے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ (۱) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے (۲) اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس وسیع کائنات کی تدبیر میں اس کے احکام کو نافذ کر رہی ہیں۔ (۳) انسان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی، علم و جہل دونوں کا اس کے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔

(۴) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لئے اس کے خالق نے خود بنی نوع انسان ہی میں سے چند بہترین آدمیوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کو علم صحیح عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا۔ (۵) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لئے اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ ایک دن اس کو ذرّہ ذرّہ کا حساب دینا ہوگا۔ اور اپنے اعمال کے اچھے یا بُرے نتائج دیکھنے ہوں گے۔

یہ نظریہ خدا، ملائکہ، وحی، رسالت، یوم آخر، پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلاً محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہمیات و خرافات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ہم اس پر جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر اس کی تصدیق کی جانب ہمارا میلان بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے مگر اس کا وجود تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کر سکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اس نام سے یاد کرتے ہیں جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دنیا کے نظام کا درہم برہم ہو جانا قیاسات کی رُو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے اللہ کے آگے جوابدہ ہونا اور اس کا اپنے اعمال کے لئے مستوجب جزا و سزا ہونا خواہ کسی قطعی دلیل سے ثابت نہ کیا جا سکے، مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قائم کئے گئے ہیں ان میں سب سے بہتر، نتیجہ اور اقرب الی القیاس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

رہا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی مادی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جن کتابوں کو وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے معانی، اور جن لوگوں کو اللہ کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع، پائدار اور مفید اثرات کسی اور نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امر کا یقین کرنے کے لئے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ عام انسانی لیڈروں کو۔

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ایمانیات عقل کے خلاف نہیں ہیں عقل کے پاس ان کی تکذیب کے لئے کسی قسم کا مواد نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقا کے کسی مرتبہ پر پہنچ کر انسان کو رد کر دینے پر مجبور ہو جائے بلکہ اس کے برعکس عقل ان کی اغلبیت کا حکم لگاتی ہے۔

ثانیاً، غیبیات میں سے بیشتر امور ایسے ہیں جن کی حیثیت محض علمی ہے یعنی ان سے ہماری عملی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایشیائے ہیولیٰ، صورت مطلقہ، مادہ، فطرت اور قانون علت و معلول، اور ایسے ہی بیسیوں علمی مسلمات یا مفروضات ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے کا ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض علمی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاقی اور عملی زندگی سے ان کا گہرا تعلق بھی ہے۔ ان کی تصدیق کو اصل الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض علمی مسائل نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی اوصاف و خصائل پر، ہمارے شخصی اعمال پر اور ہمارے اجتماعی معاملات پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔

ثالثاً، اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی آبادیوں پر ان کی زندگی کے مخفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قائم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف ان ہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ یقین کہ ایک سمیع و بصیر، قادر و غالب اور رؤف و رحیم اللہ ہمارے اوپر حکمران ہے، اس کے بے شمار لشکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیئے ہیں وہ اُس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا برا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑیگا۔ اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مادی طاقتیں صرف جسم کو جکڑ سکتی ہیں، تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی معاشرے کے صرف اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں، قانون صرف وہاں کام کر سکتا ہے جہاں اس کے کارندوں کی پہنچ ہو۔ مگر یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے۔ عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک

ETHER

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا، اس پر ملامت کرنے والا، حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، وہاں اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی بازپرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے، جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم۔ پھر جس طرح اس یقین نے معمورۂ ارضی پر پھیلے ہوئے بے شمار مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تخیلات، اعمال اور اطوار میں غایت درجہ کی یکجہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلاف ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب پھیلائی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے فداکاری کی والہانہ روح پھونکی، اس کی مثال کہیں ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

یہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں ایمان سے مراد اللہ ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخر پر ایمان لانا ہے۔ پھر عقلی تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جیسا نظام کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لئے صرف یہی امور ایمانیات بن سکتے ہیں اور ان ہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو۔

اب تک کی بحث سے جو چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) ایمان، نظام اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اسی پر اس نظام کی عمارت قائم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔

(۲) انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس مطالبے کو قبول کرنے والا دائرہ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی احکام اور مدنی قوانین اسی کے لئے ہیں اور جو اس مطالبہ کو رد کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس سے نہ کوئی اخلاقی حکم متعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی مدنی قانون۔

(۳) اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے۔ صرف وہی عمل اس کی نگاہ میں قدر و قیمت رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو، اور جہاں سرے سے یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں۔

(بحوالہ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱- توحید

عقیدۂ توحید کی توضیح

جو شخص بھی دنیا کے مختلف الہامی مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرے گا اسے اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان مذاہب نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دی ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص کفر کی حالت کو چھوڑ کر مسلمان ہونا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے کلمۂ شہادت ادا کرنا پڑتا ہے، اور اسی کلمے کی بناء پر وہ شخص ملّت کفر سے کٹ کر ملّتِ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شخص اللہ پر ایمان کے تقاضے پورا کرے گا تو آخرت کے اعتبار سے اجر و ثواب کا مستحق اور بصورت دیگر عذاب کا مستوجب ہوگا۔ یہ الفاظ دیگر اسلام کے نزدیک محض اس اقرار یا ایمان سے انسان کی دنیوی اور آخری زندگی یکسر بدل جاتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک مابعد الطبیعی ہستی کے وجود یا عدم وجود کے اقرار سے انسانوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہونا چاہیئے لیکن اگر ہم بہ نگاہ غائر اس مسئلے کا مطالعہ کریں، جیسا کہ ہم اس باب میں کریں گے، تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس اقرار و انکار کے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ یہ نتائج فکری بھی ہیں اور عملی بھی۔ انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اس لئے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلے کو محض ایک علمی اور کلامی مسئلہ سمجھنا، جس کا تعلق محض فلاسفہ اور متکلمین کی موشگافیوں سے ہو، درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان و کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں ہر شخص کو ایک نقطۂ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نقطۂ نظر سوچ سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہو، بلکہ (جیسا کہ اکثریت کا قاعدہ ہے) بلا سوچے سمجھے بھی ایک نقطۂ نظر رکھا جا سکتا ہے اور یہ انسان اور معاشرے، دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام چونکہ افراد کی اصلاح کا آغاز بالکل بنیاد سے کرتا ہے اس لئے وہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ عمل صالح سے پہلے ایمان پر زور دیا جائے۔ بنیاد اگر صحیح نہ ہو تو دیوار ٹیڑھی اور کمزور رہے گی اور "تا ثریا می رود دیوار کج" کا نقشہ ہوگا۔ ایسی دیوار میں اگر کچھ ظاہری حسن ہے بھی تو وہ بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اعمال اگر صحیح عقائد اور صحیح نیت کے ساتھ نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بے معنی ہیں۔

اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کے تکمیلی فروع ہیں اور جتنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اخلاقی احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع اللہ کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ اللہ کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کا امتثال اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ غرض، ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا صرف ایمان باللہ پر قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں، نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و فرائض میں، نہ اوامر و نواہی کسی قوت و نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا نام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ "اللہ تعالیٰ موجود ہے" بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان کے لئے ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور انہی صفات کے تصور سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستیٔ باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے کہ وہ یہی ہے کہ اس نے صفات باری کا صحیح علم بخشا ہے، اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنا کر اس سے تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق، تنظیم اعمال، نشر خیر و منع شر، اور بناء تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت، جس کے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کو دخول اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمۂ لا الٰہ الا اللہ ہے، یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "الٰہ"، بجز اس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو عالم وجود کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے اور ان تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات و طاعات کو جو "الوہیت" کے لئے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ اس مجمل کلمہ کے اجزائے ترکیبی یہ ہیں:-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک، اُلوہیت کا تصوّر۔
دوسرے، تمام اشیاء سے اس کی نفی۔
تیسرے۔ صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اوّلاً، اس نے "اُلوہیت" کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصوّر پیش کیا ہے، جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملّتوں میں یہ تصوّر کسی نہ کسی طور پر موجود ہے، لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں "اُلوہیت" نام ہے محض قوّت اور اجنبیت کا، کہیں [illegible] دی گئی ہے۔ کہیں اس کو قوّت اور طاقت کا عام معنی سمجھا گیا ہے۔ کہیں وہ محض رعب اور ہیبت کی چیز ہے، کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے، کہیں اس کا مفہوم محض فوق حاجات اور غایت ذات ہے۔ پھر کہیں وہ قابل تجزیہ و تقسیم ہے، کہیں اس کو تجسیم[1] اور تشبیہ[2] اور تناسل[3] سے آلودہ کیا گیا ہے، کہیں وہ آسمانوں پر متمکن ہے اور کہیں وہ انسانی شکلیں بدل کر زمین پر اُتر آئی ہے، ان تمام غلط یا ناقص تصوّرات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے۔ اسی کتاب نے اُلوہیت[4] کی تقدیس و تمجید کی ہے۔ اسی نے بتایا ہے کہ الٰہ صرف وہی ہو سکتا ہے جو بے نیاز[5]، صمد[6] اور قیوم[7] ہو، جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو، جس کا علم سب پر محیط، جس کی رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب ہو، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو، اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ پھر یہ اُلوہیت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے "الٰہ" ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں، نہ یہ وقتی اور

۱۔ یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہماری (مادی اشیاء کی) طرح ایک جسم رکھتا ہے۔
۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی مادی شے سے تشبیہ دی جائے۔
۳۔ یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان و حیوان کی طرح صاحب نسل اور صاحب اولاد ہے۔
۴۔ ذات باری تعالیٰ۔ تصور الٰہ ہونا۔
۵۔ بے نیاز، بے پرواہ، بلند مرتبہ (وہ جس کی طرف مہتم بالشان کاموں میں رجوع کیا جائے)
۶۔ بہت بڑا قائم ہونے والا۔ بے مثال تھامنے والا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زمانی ہیں کہ ایک "الٰہ" کبھی تو ان سے منصف ہو، اور کبھی نہ ہو، نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک "الٰہ" میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔

الوہیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی زور بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیاء اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا۔ تمام موجودات عالم محتاج ہیں، مسخر ہیں، مخلوق ہیں، نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو رفع کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوت وجود، قوت فعل، اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہٰذا کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو "الوہیت" کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیازمندیوں میں سے کسی ایک حصہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔

اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے "الوہیت ثابت کرتا ہے جس کا نام "اللہ" ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو، اسی سے محبت کرو، اسی سے خوف کرو، اسی سے امید رکھو، جو کچھ مانگو اسی سے مانگو، ہر جہاں میں اسی پر توکل کرو، ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے پاس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا یا برا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

آئندہ صفحات میں توحید کی حقیقت اور اس کے انقلابی پیغام کے بارے میں علمی اور عقلی بحث کی جائیگی اور اس سلسلہ میں اسلام جو فطری طرز استدلال اختیار کرتا ہے اسے پیش کیا جائے گا۔ اس موضوع کی اچھی طرح تفہیم کے لئے مندرجہ ذیل چیزوں کو سمجھنا ہوگا۔

۱۔ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خالق اور حاکم ہے۔

۲۔ یہ خالق اور حاکم ایک اور صرف ایک ہے اور اس کی حکمرانی اس کائنات میں ہر طرف کارفرما ہے۔

۳۔ توحید کے نظریہ کے تحت خدا کا ایک مکمل تصور وابستہ ہوتا ہے اور اسلام کے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد اسی توحید کے تصور پر ہے۔

۴۔ توحید کے اثرات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا مرتب ہوتے ہیں اور اس نظریہ کے تحت کیسا انسان اور کیسا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی مباحث سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ وجود باری تعالیٰ

سب سے پہلا سوال جس سے ہمیں سابقہ درپیش ہے وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصیت سے پچھلے دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالف دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل فلسفہ کی ساری موشگافیاں انسان کی کوئی واضح رہنمائی کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر: ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے کچھ اور بھی تیکھے انداز سے شرکت کی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مادیت پرست سائنسدان اس دعوے کے ساتھ میدان میں اترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپ لیس نے نظام شمسی پر اپنی کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب نپولین نے اس سے تعجب سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں پاتا ہوں، تو اس نے شاہ فرانس سے کہا "حضور والا ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں صدی میں یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصور کو ختم کر دیا ہے اور کائنات کی ایک ایسی توجیہ کر دی ہے جس میں کسی مدبر اعلیٰ اور خالق کل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا کہ انسان بہت سی آراء قائم کرنے میں بڑا جلد باز ہے۔

وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا کا وجود حسی اور مادی نہیں ہے بلکہ ما بعد الطبیعی ہے۔ عام طور پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کے لئے ہمارے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں وہ حواس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی حواس کے ذریعہ حاصل کرتی ہے لیکن حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محض مادی اور حسی دنیا تک محدود ہے، جو چیزیں ان سے ماوراء ہیں یعنی طبیعی کی بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو جاننے کے لئے حواس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حواس مجبور اور لاچار ہیں اور اس کے حقائق کو جاننے کے لئے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو حسی دنیا سے متعلق ہوں یا جو اس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹیفک مطالبہ ہے۔

مادیت پرست سائنسدان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ سائنس زندگی کے ہر عقدہ کو حل کر سکتی ہے۔ جس طرح خشکی کی سواری پانی پر بے کار ہو جاتی ہے۔ اسی طرح طبیعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس ما بعد الطبیعی حقائق کا ادراک نہیں کر سکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائرہ میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دنیا کی بات پیش کرنا جو اس کے دائرہ سے باہر ہے اور جس کے متعلق وہ کوئی علم نہیں رکھتی، ایک غیر سائنٹیفک بات ہے۔ اور ایسے دعوے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سائنس کی صورت یہ ہے کہ:

۱۔ اس کا دائرہ کار حسی اور طبیعی دنیا تک محدود ہے۔ اس سے باہر کے بارے میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۲۔ طبیعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے کلی نہیں۔ وہ ایک خاص پہلو یا جزو کا مطالعہ کرتی ہے پوری حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی۔

۳۔ اس کا طریق مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہے اور ایک خاص طریق عمل کے ذریعہ اس کی حاصل شدہ معلومات سے قوانین، نظریات، اور طبیعی نظام کے بارے میں تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ظنی ہوتی ہیں، انہیں درجۂ یقین حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجہ میں نسبتاً یقین کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جوں جوں نظریات اور تعبیرات کا حصہ بڑھتا جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایک دور کے سائنسی تصورات دوسرے دور کے سائنسی تصورات کی تکذیب کر دیتے ہیں اور سر جیمس جینز کے بقول سائنس کا دریا اُلٹے رُخ پر بہنے لگتا ہے۔

۴۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے حاصل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں، اکثر ایسا ہوا ہے کہ فزکس اگر ایک سمت میں رہنمائی کرتی ہے تو بیالوجی ایک دوسری سمت میں اور سائکالوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لئے کسی ایک کو سائنس کہنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے، ایک بے سروپا اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ یہ سوال ہی سائنس کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے میں بجز خاموشی کے اور کوئی موقف اختیار نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی سائنس دان پروفیسر لیتر نے سچ کہا ہے کہ:

"کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔ اس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ ہے"۔

یہ تو ہے فطری صورت، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں پرانی سائنسی مادیت کے خلاف ایک شدید ردعمل رونما ہوا ہے اور سائنس کا نیا رجحان مذہب اور خدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ عکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہوا ہے اور نظریۂ اضافیت اور نظریۂ کوانٹم کے زیر سایہ جس نے پرورش پائی ہے، وہ سائنس کو مذہب کے حقائق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اگر لے لیا تو یہ دنیا بجائے ان سے قریب تر لے آیا ہے۔ عام فضا کی یہ تبدیلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر لی کا مشتے ڈوگلاس نے تو اپنی کتاب "تقدیر انسانیت" اس دعوے کے ساتھ پیش کی ہے کہ :

"اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے آتے ہیں"۔

پروفیسر سولیوان نے جو ٹی کے سائنسدانوں کے افکار کا جو نچوڑ پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ :

"ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دنیائے سائنس میں مذہبی نقطۂ نظر بھی اتنی ہی حجت و صداقت کا حامل ہے۔ جتنا سائنسی نقطۂ نظر۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئی سائنسی دنیا کے سب سے بڑے خلاق (یعنی البرٹ آئن سٹائن) کی نظر میں تو مذہبی فکر ہی سائنسی نقطۂ نظر کا ماخذ اور رہبر ہے"[1]

اور پروفیسر ہوڈ یہاں تک کہہ گیا ہے کہ :

"سر جیمس جینز اور سر آرتھر ایڈنگٹن کی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دنیا کے بارے میں انیسویں صدی کے تصورات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور دوستداری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لئے دونوں کے طریقہائے تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے"[2]

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رُخ کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں تک خالص سائنٹیفک طریقہ کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے۔ کیوں کہ خدا کے وجود کا ادراک حواس کے ذریعہ سے نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کے باوجود عقل سلیم کی رہنمائی کے لئے انفس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراہم کردہ معلومات میں لاتعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مدبر اور صاحب امر ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو اس کائنات کے حقائق کو دیکھ

---

[1] ملاحظہ ہو لوئن ڈی کا اسپیارڈ دی آبزرور (THE OBSERVER) مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۳۰ء۔

[2] ملاحظہ ہو ہوڈ کی کتاب GOD AND EVIL صفحہ ۱۴۰۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر بے اختیار پکار اُٹھتا ہے کہ یہ کارخانۂ رنگ و بو ایک حکیم اور دانا خالق اور فرمانروا کے بغیر نہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ قائم رہ سکتا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے۔ یہاں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نظام کا ایک فرمانروا ہے۔ نظم کا تصوّر ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصوّر ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصوّر ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصوّر ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصوّر خالق کے بغیر آخر کس طرح آسکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی جاری و ساری ہو گیا ہے؟ اس کائنات میں کمال درجہ کا حسن و توازن ہے۔ یہ حسن و توازن کے ایک منتظم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کارفرما ہے جو خیر کو قائم رکھنا اور شر کو ختم کرتا ہے۔ یہ اخلاق انتخاب ایک صاحب ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک مسلسل، مربوط اور معنی خیز ناول کی مانند ہے۔ کیا اس ناول کا کوئی مصنف نہیں؟ مسٹر آرتھر کیتھ نے سچ کہا ہے:

> "انسانی دماغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لئے ایک حقیر سا آلہ ہے۔ ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظم اور مربوط ہے اور فطرت کی نت نئی ایجادات کیسی حیران کن ہیں۔ ہر سمت میں ایک مقصد کارفرما ہے۔ خواہ ہم عامی ہوں یا سائنسدان، ہمیں کائنات کے لئے ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا پڑے گا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں۔"[1]

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس کے لئے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے، ایک نقطۂ آغاز یقیناً ماننا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں یعنی یہ کہ آغاز مادے سے ہوا، دوسرا وہ جو خدا کے ماننے والے کہتے ہیں یعنی یہ کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی سے ہوا۔ ان دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں مفروضے ہیں، کوئی تجرباتی یا مشاہداتی دلیل کسی ایک کے حق میں نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذی شعور ہستی ہے اور

---

[1] سر آرتھر کیتھ "I BELIEVE" صفحہ ۱۵۵

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مادہ شعور سے محروم ہے۔ سوال یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز یعنی مادہ۔ ایک صاحب شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لئے کہ شعور مجرد مادے سے بہت بلند ہے۔ لیکن اگر خدا کو، جو خود صاحب شعور ہے تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع ہو جائے۔ اسی طرح مادہ کو نقطۂ آغاز مان کر تمام کائنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جا سکتی لیکن ایک با اختیار و صاحب ارادہ ہستی کو مبدا ماننے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اور تمام مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والے کو اس قسم کی بے شمار مثالوں سے سابقہ پڑتا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے پیش نظر ہوا ہے۔

نظریہ ارتقاء ابتداً دو سائنس دانوں نے پیش کیا تھا۔ ایک چارلس ڈارون اور دوسرا الفرڈ رسل ولاس۔ لیکن بعد میں الفرڈ رسل ولاس نے اپنی کتاب شائع نہ کی اور نظریۂ ارتقاء کا سہرا ڈارون کے سر بندھا، لیکن ڈارون کے نظریات کے برعکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ "حیاتیاتی دنیا میں کم از کم تین ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوت یا علت کی مداخلت لازمی ہوئی ہے۔ ایک وہ وقت جب کہ پہلے جان دار خلیے کی تشکیل ہوئی، دوسرا وہ مقام جہاں سے حیواناتی اور نباتاتی زندگی جدا ہوئی، اور تیسرا وہ وقت جب انسان عالم وجود میں آیا" یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم از کم تین ایسے نمایاں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتفاقات کا سہارا لے کر نہیں ٹالا جا سکتا اور کسی بلند تر قوت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔

ارتقائے کائنات کے مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور رب کی ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے۔ نظریہ ارتقاء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل بے شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی، ہوا اور پانی کی ایک مخصوص شکل قائم ہوئی۔ موسم کا نظام اور ٹمپریچر زندگی کے قیام اور بقا کے لئے سازگار ہوئے۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے لئے تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا۔ سوال یہ ہے کہ اتنی منظم، مرتب اور منضبط تبدیلیاں آپ سے آپ کیسے واقع ہو سکتی ہیں؟ ہر چیز ایک دوسرے سے پیوست ہو اور تمام تبدیلیوں کے تعاون و توافق سے زندگی کے آئندہ مراحل طے ہونے کے لائق بنیں۔ کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب متناسب تبدیلیاں واقع ہو سکتی ہیں؟ کیا عقل اسے ماننے کے لئے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک حادثہ اور اتفاق کی بناء پر ہو گیا۔ اگر اس کا نام "حادثہ" اور "اتفاق" ہے تو پھر لغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے پڑیں گے۔ کیا کبھی ایسا "اتفاق" بھی واقع ہوا ہے کہ حروف کو ایک ڈبے میں ڈال کر ہلایا گیا ہو تو ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے ایک مربوط عبارت بن گئی ہو؟ کیا کبھی ایسا "حادثہ" بھی پیش آیا ہے کہ غالب یا اقبال کے کسی شعر کے الفاظ الٹ پلٹ کر کسی جاہل کو دیئے گئے ہوں اور وہ الفاظ آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالب یا اقبال کا شعر نکل آئے، حالاں کہ حروف، الفاظ، جملے سب وہی ہوں؟ اگر اس طرح ایک شعر نہیں بن سکتا تو یہ پوری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے ہیں؟ بے شک:

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ (النمل - ۸۸)	اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔
وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ۝ (قرآن حکیم)	خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ معین کیا۔

حیات و کائنات کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائنسی تجربات اور عقل سلیم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اس دنیا کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس کی ہر شے زبان حال سے پکار رہی ہے کہ کسی صاحب حکمت اور ذی اختیار ہستی نے اسے وجود بخشا ہے۔ وہی اس کی خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرمانروا ہے۔

۳۔ وجود باری تعالیٰ پر قرآن کا استدلال

وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سُراغ لگایا، جس میں سامان تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں۔ غرض، جماعت انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اس لئے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّیْنُ	اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر، دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (روم - ۳۰)	یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرۃ۔	ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔

انسان کا یہ جذبۂ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے۔ اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:۔

اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۝ (ابراہیم - ۱۰)	کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَیْرِ شَیْءٍ اَمْ ھُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا یُوْقِنُوْنَ ۝ (طور - ۳۵-۳۶)	کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے خالق ہیں یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے، اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے، اور اس کے اس وجود میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول آپ فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیوں کر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادۂ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذرّہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز و انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (آل عمران - ۱۹۰)	آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اُس کا سیاہ و سپید ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (فصلت - ۳۷)	اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔

آسمان و زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:-

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِكُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ (الجاثیہ - ۳-۴)	بیشک آسمانوں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جنکو زمین میں پھیلا رکھا ہے، یقین کرنے والوں کے لئے دلیلیں ہیں۔

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا۔ یہ کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قدو قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اُس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو، اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو، جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اوّل تو خود انسانوں کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

سورۂ لقمان میں آسمانوں کے، بلا کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے، کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا، قوت کشش ہی سہی، لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔ اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے۔ یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے۔

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آجانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں، اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معمہ ہے:۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (ذاریات - ۲۰ - ۲۱)	اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے؟

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے۔ وہ بھی غور کے قابل ہے۔ ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے۔ اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے۔؟

ایک ہی قسم کے پھل ہیں۔ اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں، اور دوسری طرح کھاؤ (یعنی منشیات بنا کر استعمال کرو) تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپنی محکم روش، اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ ۚ (النمل - ۸۸)

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ (الملک - ۳)

تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے پھر دہرا کر دوبارہ نظر کر تیری نگاہ تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا ذکر بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:۔

۱۔ قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بخود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے، بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

۴۔ توحید کے دلائل

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ عقل و وجدان اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق کے لئے کسی ذی شعور اور صاحب اختیار ہستی کی ضرورت ہے۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ عقل کی رو سے اس کائنات کا وجود و بقا محض ایک ہستی کا رہین منت ہے۔ عقلی طور پر ایک سے زیادہ خالق و مالک ہستیوں کا وجود ممکن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرے میں پھیلانے کی کوشش کی ہے، تاہم اس میں بھی ایک نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہرحال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب ذرا سوچئے کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پورے استحکام کے ساتھ قائم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس میں مختلف قوتوں کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں، لیکن دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی سنبھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ ان اضداد کے باوجود دنیا کی بقا محض اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں کئی حکمراں نہیں بلکہ صرف ایک حکمراں ہے، جس کا اقتدار سب سے بالاتر ہے اور وہ ان سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔

ایک اور اہم پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق اور ان کی باہمی سازگاری ہے، اسی طرح کی موافقت اور سازگاری جیسی کہ زوجین میں نظر آتی ہے عورت اور مرد اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود اگر عورت نہ ہو تو مرد کی قابلیتوں اور قوتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جائے گی۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔

توافق کا یہ پہلو صرف ضدین ہی میں نہیں۔ بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے، ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں، زمین اس کے لئے گہوارہ مہیا کرے۔ ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہو لے۔ تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ یہی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لئے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے۔ اور وہ پھل انسان کے لئے لذت اور بقائے زندگی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے؟ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر، قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لئے تصرف میں لائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بادلوں سے پانی برستا ہے، اس سے زمین لہلہا اُٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ پھر آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لئے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اس بارش کے پرورش کئے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کرلیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر درختوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنالیتی ہیں، جس کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان اس کو بیتا ہے، اس سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کرسکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مناظر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف سلسلے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں؟ جو دنیا اتنے بعید اجزا کی کشاکشوں کے اندر بھی توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو اتفاقی حادثہ ہوسکتی ہے اور نہ مختلف ارادوں کی رزم گاہ ہوسکتی ہے۔ ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گوہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں، اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم کا ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لئے غذا کا ذخیرہ حاصل کرلیتا ہے۔ کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں۔

پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو، دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے، بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری، یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض "نہ ماننے کی خواہش" پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

پھر جو چیز ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے جو اس کے ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی ایسا چپہ نہیں ہے جہاں سے انسان غافل اور بے پروا گزر سکے، ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کے کھولنے کے لئے دل فریب مناظر، بے حجاب جلوے، اور شیریں نغمے موجود ہیں اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے ارد گرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے تو دفعتاً اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمور دنیا خود بخود وجود میں آ گئی اگر اس کے دل و دماغ پر پردہ نہ پڑا ہو تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے۔

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ (المومنون - ۱۴)	بڑا ہی خیر و برکت والا ہے جو تمام صناعوں سے بڑھ کر ہے۔

یعنی صرف اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے بلکہ اس کے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق بہترین خالق ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت، اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے:

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (السجدہ - ۷)	جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی۔

ظاہر ہے کہ دنیا اپنی بقا کے لئے ان تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی۔ یہ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن یہ نشیب و فراز، یہ وادی و کوہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے، ممکن تھا یہ آسمان ہوتا مگر ستاروں کی یہ بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلووں سے معمور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لئے ہے کہ انسان کے حس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آ سکتی اور وہ خالق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمال قدرت، کمال صنعت و حکمت، اور کمال خیر و برکت کی تمام صفات سے متصف ہے۔

یہ رنگا رنگ جلوے، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے، جیسا کہ ہمارے متکلمین کہتے ہیں۔ بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو تمام صفات جمال و کمال سے متصف ہے۔ کیوں کہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے، خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قدیر ہے، علیم ہے، مہربان ہے، کریم ہے۔ اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت پر، بہترین قویٰ اور قابلیتوں اور نہایت اعلیٰ فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف خلق نہیں ہے بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے، صرف بخشنا نہیں ہے بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمال ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گذر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین و جمیل وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین متناسب الاعضاء اور خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے۔ اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزاء کی تشکیل مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس میں کارفرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دوکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں ہر چیز بے قرینہ بے ربط اور بے جوڑ ہوتی کیوں کہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی ہے جو ان اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی اور اس کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقا بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا اس کا جمال اور حسن بھی محض ایک حادثہ ہیں؟ کیا نتائج کی یکسانی اور نظام کی وحدت بھی بلا منصوبہ ہیں؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحے کے لئے بھی تسلیم کر سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور وہ اپنے علم و حکمت اور بلا شرکت غیرے مکمل اختیارات کی وجہ سے مختلف اجزاء میں ربط و اتصال پیدا کرتا ہے۔ اگر آسمان و زمین میں اس کی قوت میں کوئی شریک ہوتا یا یہاں بہت سے ارادوں اور ذہنوں کی کارفرمائی ہوتی تو کائنات میں توافق و تناسب ہرگز نہ ہوتا۔ (حقیقت توحید مولانا امین احسن اصلاحی)

۵- اسلام کا تصوّرِ اللہ

مختلف اقوام و مذاہب نے اللہ کو جن جن صفات کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کے تصوّر نے ان مذاہب کے پیروؤں کی سیرت و کردار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اللہ کا ایک تصوّر انسان کو دلیر، بیباک اور بزدل بنا دیتا ہے، دوسرا ظالم اور سنگ دل۔ ایک تصور انسان کو کشمکش حیات سے مفرور کر کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا ڈالتا ہے، دوسرا اسے ناچ رنگ کے جلسوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تصوّرِ اللہ انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آگ، پانی، پہاڑ، جنگل جیسی اشیاء کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور دوسرا اسے خلیفۃ اللہ بنا کر عناصر کی تسخیر پر مامور کرتا ہے۔ ذیل میں ہم دیکھیں گے کہ اسلام نے اللہ کا کیا تصوّر پیش کیا ہے۔

بہت سے جدید معاشروں میں اللہ کا تصوّر یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کھیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔ جیسے کوئی بچہ پھلجھڑی چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ زندگی اور موت، صحت و بیماری، قحط و خوشحالی، مسرت و نکبت اس کی قدرت کے تماشے ہیں جن سے اس کی مخلوق کو واسطہ پڑتا ہے، لیکن اس کی تقدیر کا دریا اپنے بہاؤ کی رو میں مگن ہے، نہ اس کی فکر کہ کون ڈوبتا ہے، نہ اس سے واسطہ کہ کون بچتا ہے، خدا کو نہ ہمارے دکھ درد سے واسطہ ہے، نہ ہمارے خیر و شر سے، وہ ہمارے آنسوؤں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تبسموں سے بے پرواہ اور ہمارے خیر و شر سے بے نیاز ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ تصوّرات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پوری مخلوق اور خصوصاً انسانی زندگی کی فلاح و بہبود سے براہ راست دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ محض موجودات کا خالق اور تقدیر ساز ہی نہیں، ہادی و رہنما بھی ہے :-

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی ۝ (الاعلیٰ ۲-۳)	(رب تو وہی ہے) جس نے ہر شے کو پیدا کیا پھر اس کو درست بنایا اور جس نے ایک اندازہ بنایا (تجویز کیا) پھر ہدایت عطا فرمائی۔

اس نے انسان کو جب حیات ارضی کے لئے میدان میں اتارا تو اسے اطمینان بھی دلا دیا کہ تم کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا جا رہا۔ تمہاری رہنمائی کی جائے گی :-

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ - ۳۸)	پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت (دین و شریعت) آئے تو جو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگوں کو نہ تو کچھ خوف و اندیشہ ہوگا اور ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے مختلف سرگرمیوں کے بھلے اور بُرے پہلو نمایاں کرتا ہے، قدم قدم پر ہدایت دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے، کہیں نفاق اور بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قائم رکھنے کا سبق دیتا ہے، کہیں رضاعت اور میراث کے معاملات میں ان کو پریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں حدود تعزیرات اور قوانین متعین کرتا ہے۔ الغرض دکھ درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اعتماد، یقین اور پختہ شعور حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

یہ اللہ سب کچھ جاننے اور دیکھنے والا ہے۔ کوئی آڑ نہیں جو بیچ میں حائل ہو، کوئی مغالطہ نہیں جس کا وہ شکار ہو جائے، وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے ہر گوشے سے واقف ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے، پھر وہ صاحب قوت بھی ہے۔ جس پر ضعف و نقاہت کا غلبہ نہیں ہوتا، جسے کام کا بوجھ دوسروں پر بانٹنے کی کوئی مجبوری درپیش نہیں ہے۔ اور جو اپنی ذمہ داریوں میں کسی دوسرے کے مشورے یا تعاون کا محتاج نہیں!

17354

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ اللہ صرف صاحب قوت ہی نہیں، اپنے بندوں کا رفیق و دمساز اور ولی و کارساز بھی ہے:۔

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (محمد - ۱۱) | یہ اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا رساز ہے۔

رفیق بھی ایسا رفیق نہیں جو وقت پڑے پر ہاتھ نہ آئے۔ بلکہ پکا ساتھی، ہر ہر لمحے کا ساتھی، برے اور بھلے کا ساتھی:۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ (الحدید - ۱۱) | تم جہاں بھی وہ تمہارے ساتھ ہے۔

ایسا ساتھی جو کٹھن گھڑیوں میں ہمت بندھاتا ہے۔ جب بندوں کو کوئی چرکہ لگتا ہے تو فوراً مرہم تسکین لئے پاس موجود ہوتا ہے۔ اپنے قصر رحمت کا باب قبول کھول دیتا ہے کہ ناسازگار حالات کی آندھیوں میں مجھے پکارو میں تمہاری فریادیں سنتا ہوں۔ اور ان پر مناسب کارروائی کرتا ہوں۔

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (المومن - ۶۰) | مجھے پکارو (دعا کرو) میں تمہاری درخواست (دعا) کو قبول کروں گا۔

وُہ دلوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ جب تم کرب کی گھڑیوں میں مجھے بے بس ہو کر پکارتے ہو تو میں مصیبت کی گھٹاؤں کو چھانٹ دیتا ہوں۔

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ۔ (النمل - ۶۲) | وہ کون ہستی ہے کہ جب بے قرار آدمی اس کو پکارتا ہے تو اس کی سنتا ہے۔ اور اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔

یہ وہ اللہ ہے جو قہار و جبار بن کر اپنے تخت پر براجمان نہیں ہوتا بلکہ اپنے بندوں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتا ہے، ان کے جلتے ہوئے سینوں کو تسکین کی ٹھنڈک پہنچاتا ہے، ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، اس کا تصور اتنی بڑی طاقت ہے کہ انسان۔ اگر اس نے اسے فی الواقع اپنے اندر جذب کر لیا ہو تو۔ رضائے الٰہی پر نگاہ جما کر اپنی زندگی کو داؤں پر رکھ سکتا ہے، وہ آروں کے نیچے چر سکتا ہے، اپنے تئیں کھال کھینچنے والے قصائیوں کے حوالے کر سکتا ہے پھانسی کے تختوں پر کھڑا ہو سکتا ہے، کوڑوں کی بارش میں ثابت قدم رہ سکتا ہے، اور کیا نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ انسان اس تصور کو حقیقتاً جذب کر لے۔

۶۔ عقیدۂ توحید کے انفرادی زندگی پر اثرات

توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا اپنی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ تمام کائنات کی خالق و رازق ایک ذات واحد ہے۔ اس کے سامنے ساری مخلوق اور دنیا کی تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طاقتیں ہیچ ہیں۔ موت و زندگی، صحت و بیماری، نفع و نقصان سب اسی کے اختیار میں ہے۔ اس میں کسی مخلوق کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو ولی ہی کیوں نہ ہو۔ سفارش کی جرأت نہیں کر سکتا۔

انسانیت پر اسلام کا سب سے بڑا احسان عقیدۂ توحید ہے جس طرح پورے اسلام کی جان اس کے عقائد ہیں، اسی طرح ان عقائد کی جان عقیدۂ توحید ہے۔ یہ عقیدہ دوسرے تمام عقائد کا نقطۂ کمال ہے جس نے شعور و یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اللہ ہی معبود ہے۔ اس نے درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر یقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ توحید دیگر مذاہب بھی مگر انسانی تصرفات کی وجہ سے توحید خالص ان میں باقی نہ رہی۔ اور کسی نہ کسی طرح ان میں شرک نے راہ پائی۔ تمام انبیاء و رُسل سب سے پہلے توحید کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ ان کو جو تکلیفیں دی گئیں، وہ عقیدۂ توحید کی وجہ سے دی گئیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی اسی عقیدہ کی تبلیغ میں گزری، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب مصائب اسی عقیدہ کی تبلیغ کی پاداش میں برداشت کئے۔

۷۔ صفاتِ باری تعالیٰ

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے کے لئے اس کی صفات کا جاننا بھی ضروری ہے تاکہ یقین رکھا جائے کہ وہ ان صفات سے موصوف ہے اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ کی چند بنیادی صفات اور ان کے جزوی تقاضوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی بنیادی اور اہم تر صفات یہ ہیں۔

۱۔ وہ ازلی اور ابدی ہے یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ کسی نے اسے پیدا نہیں کیا ہے، وہ آپ سے آپ موجود ہے۔

۲۔ وہ خالق یعنی سب اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے۔

۳۔ وہ ربّ (پروردگار) ہے یعنی وہ سب کو رزق دیتا اور پرورش کرتا ہے۔

۴۔ وہ مالک اور حاکم ہے اور سب مخلوقات اس کی محکوم ہیں۔

۵۔ وہ علیم ہے یعنی یہ کہ ہر بات اور ہر حرکت کو جانتا ہے۔ کیا ہو چکا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہوگا۔ سب اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

۶۔ وہ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی بے نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے ہر کام میں کچھ حکمت و مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

۷۔ وہ عزیز ہے اور ہر کام کی طاقت رکھتا ہے۔ اس کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ اس کے کسی فیصلہ کو روکا نہیں جا سکتا۔

۸۔ وہ عادل ہے اس کا ہر کام عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے سب فیصلے ٹھیک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ٹھیک انصاف کے مطابق ہوتے ہیں۔

۹۔ وہ مالک یوم الدین ہے برے کام کا برا بدلہ اور اچھے کام کا اچھا بدلہ دیتا ہے۔

۱۰۔ وہ معبود ہے۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔

۱۱۔ وہ احد ہے یعنی اس کی جتنی صفات ہیں۔ ان میں کسی کے اندر بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔

اوپر جتنی صفات مذکور ہوئیں وہ اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدۂ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے حسب ذیل ہیں۔

۸۔ عقیدۂ توحید کے تقاضے ۱۔ اللہ کے سوا کوئی اور ہستی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آگئی ہو بلکہ ہر چیز مخلوق ہے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے ہر مخلوق اس کی محتاج اس کی ملک اور اسی کی محکوم ہے۔ وہ اپنے اندر کوئی ذاتی صفت نہیں رکھتی بلکہ جو صفت بھی اس میں پائی جاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بنیادی طور پر تمام موجودات سے مختلف ہے۔ کسی طرح بھی کوئی اس کا ہم جنس نہیں ہے۔

"لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ" (الشوریٰ-۱۱) | (اس جیسی کوئی چیز نہیں)

نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ نہ وہ جسم رکھتا ہے نہ جسمانی صفات رکھتا ہے

۳۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہئے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک بھی ہونا چاہئے اور اصل مقصد بھی۔

۴۔ ایسے سب کام جو اپنی صورت کے اعتبار سے عبادت کی قسم کے ہوں صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے۔ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ امداد کے لئے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

۵۔ جن جذبات و احساسات میں عبادت کی روح پائی جاتی ہے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہیں۔ بھروسہ صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

۶۔ اس پوری کائنات کا حاکم اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق وہی ہے۔ حقیقی قانون ساز بھی وہی ہے۔

۷۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو۔ جو عبادت کے لائق ہو۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں اور نذریں پیش کی جائیں۔ کوئی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہیں جسے کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے مدد کیلئے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر بھروسہ کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے۔ جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت کی جائے، کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرّہ بھی ہو جو بال برابر کسی کو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہو، جو کسی کے لئے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

عقیدہ توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا بھی انکار اللہ پر ایمان رکھنے کے دعویٰ کو بے معنی کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری عبادتیں عقیدۂ توحید کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ عقیدہ اپنے اس پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں اُتر نہ چکا ہو۔

خلاصہ یہ کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس توحید کی تلقین کی وہ دو اصولوں پر مبنی ہے۔

۱۔ ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہیں جھکنا چاہیئے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ہر قسم کی قوت ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمال صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لئے ہیں جو عرش سے لے کر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اُٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیئے۔ ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں صرف ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب بلکہ دنیا بھر میں طرح طرح کے غلط عقائد پھیل گئے تھے۔ ان میں سب سے بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا۔ دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے۔ عیسائی تین اور مجوسی دو خدا مانتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں سینکڑوں خدا تھے۔ اس لئے سب سے پہلے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح سے دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا۔ آپ کے تیرہ سالہ مکی دورِ رسالت میں روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے ارکان فرض نہیں ہوئے تھے لیکن شرک کا استیصال نبوت کا پہلا سبق تھا۔ مکی عہد میں اکثر و بیشتر صرف یہی عقیدہ پیش کیا سورۃ الزمر مکہ میں نازل ہوئی۔ اس سورت میں شرک کی تمام صورتوں کو باطل قرار دیا گیا۔

۹۔ انفرادی زندگی پر توحید کے اثرات

جب توحید کا عقیدہ انسان کے دل میں راسخ ہو جاتا ہے تو اس سے وہ فوائد حاصل ہوتے ہیں جو کسی دوسرے عقیدہ سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ہم مختصراً ان کا ذکر کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ وُسعتِ نظر ایمان باللہ کا انسانی زندگی پر پہلا اثر یہ ہے کہ وہ انسان کی نگاہ میں اتنی وُسعت پیدا کر دیتا ہے جتنی خدا کی سلطنت وسیع ہے۔ انسان جب تک دنیا کو اپنے محدود علم اور قدرت کے دائرہ کے اندر بند رکھ کر دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ اسی تنگ دائرے میں محدود رہتی ہے۔ اسی دائرے میں وہ اپنے لئے حاجت روا تلاش کرتا ہے۔ اسی دائرے میں جو طاقتور ہیں ان سے ڈرتا اور دبتا ہے۔ اسی دائرے میں اس کی دوستی اور دشمنی محبت اور نفرت محدود رہتی ہے اللہ پر ایمان لانے کے بعد اس کی نظر اپنے ماحول سے نکل کر تمام کائنات پر پھیل جاتی ہے۔ اب وہ کائنات پر اپنے نفس کے تعلق سے نہیں بلکہ خداوند عالم کے تعلق سے نگاہ ڈالتا ہے اب اس وسیع جہان کی ہر چیز سے اس کا ایک اور ہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس کو دنیا میں کوئی حاجت روا کوئی طاقتور کوئی ضرر اور نفع دینے والا نظر نہیں آتا۔ اب اس کی دوستی یا نفرت اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ اللہ کے لئے ہوتی ہے پس جو اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ وہ کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا۔

۲۔ عزّتِ نفس ایمان باللہ انسان کو پستی و ذلت سے اُٹھا کر خودی و عزّتِ نفس کے بلند ترین درجہ پر پہنچا دیتا ہے۔ جب تک اس نے اللہ کو نہ پہچانا تھا دنیا کی ہر طاقتور چیز ہر نفع یا ضرر پہنچانے والی چیز کے سامنے جھکتا تھا۔ اس خوف کھاتا تھا۔ اس کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ اس سے امیدیں وابستہ کرتا تھا۔ مگر جب اس نے اللہ کو پہچانا تو معلوم ہوا کہ جن کے آگے وہ ہاتھ پھیلا رہا تھا وہ خود محتاج ہیں، جن کی وہ بندگی کر رہا تھا۔ وہ خود اسی کی طرح بندے ہیں۔

قرآن میں فرمایا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ" (الاعراف - ۲۴) | جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

جن سے وُہ مدد کی امیدیں رکھتا تھا وہ اس کی مدد تو درکنار آپ اپنی ہی مدد نہیں کر سکتے۔

"لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَا اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ" (الاعراف - ۲۴) | وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے بلکہ اپنی مدد سے بھی قاصر ہیں۔

یہ علم حاصل ہونے کے بعد وہ تمام دنیا کی قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کی گردن کسی کے آگے نہیں جھکتی۔ اللہ کے سوا اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا۔ اللہ کے سوا کسی کی عظمت اس کے دل میں نہیں رہتی۔

۳۔ عجز و نیاز ایمان باللہ سے جو خودداری انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس کو مغرور اور متکبر نہیں بناتی۔ بلکہ خدا پر ایمان رکھنے والے میں خودداری انکسار کے ساتھ اور عزّتِ نفس عجز و نیاز کے ساتھ ملی ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا کی طاقت کے سامنے میں بالکل بے بس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں۔ خُدا کی حکومت کے دائرہ سے نکلنا میرے اور کسی ہستی کے بس میں نہیں ہے۔ میں کیا تمام عالم اللہ کا محتاج ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ ایمان باللہ کی عظیم خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کو سراپا انکسار بنا دیتا ہے۔

۴۔ غلط توقعات کا اِبطال ایمان باللہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس سے تمام جھوٹے بھروسوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ انسان خوب سمجھ لیتا ہے کہ اس کے لئے اعتقادِ صحیح اور عملِ صالح کے سوا نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جو لوگ ایمان باللہ سے محروم ہیں۔ ان میں سے کوئی سمجھتا ہے کہ خدا کے کاموں میں بہت سے اور چھوٹے چھوٹے خدا بھی شریک ہیں۔ ہم ان کی خوشامد کر کے سفارش کروالیں گے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ اللہ بیٹا رکھتا ہے اور اس بیٹے نے ہمارے لئے کفارہ بن کر نجات کا حق محفوظ کر دیا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ ہم خود اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے چہیتے ہیں۔

"قَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ" (المائدہ-۳) | یہود و نصاریٰ نے کہا ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں۔

ایسی ہی اور بہت سی غلط توقعات ہیں جو لوگوں کو ہمیشہ گناہ کے چکر میں پھنسائے رکھتی ہیں لیکن قرآن جس ایمان باللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اس میں غلط توقعات کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔

۵۔ صبر و توکّل ایمان باللہ انسان میں صبر و توکّل کی شان پیدا کرتا ہے۔ خدا پر ایمان لانے والے کا دل ایک سنگین چٹان کی طرح مضبوط و مستحکم ہو جاتا ہے۔ ساری دنیا کی مشکلیں دشمنیاں تکلیفیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتیں۔ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا اس کا بھروسہ ان مادی اسباب و وسائل پر ہوتا ہے جو خود کسی طاقت کے مالک نہیں ہیں مگر جس کا بھروسہ خدا پر ہے جس نے خدا کا دامن تھام لیا ہے، اس کا سہارا ایسا مضبوط ہے کہ وہ کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔

۶۔ شجاعت ایمان باللہ سے انسان میں جرأت و شجاعت کا جذبہ اُبھرتا ہے انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں۔ ایک محبت جو وہ اپنی جان اپنے اہل و عیال اور اپنے مال سے رکھتا ہے۔ دوسرے خوف جو نتیجہ ہے اس غلط اعتقاد کا کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کر دینے کی قوت دراصل ان اشیاء میں ہے جو محض آلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ایمان باللہ ان دونوں چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ مومن کے دل میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ مال اور اولاد سب دنیا کی زینتیں ہیں جن کا کبھی نہ کبھی ضائع ہونا یقینی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی چیز وہ ہے جو اللہ کے ہاں ملے گی۔ رہا خوف تو مومن کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ نقصان پہنچانے اور ہلاک کرنے کی حقیقی قوت انسان یا حیوان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

توپ یا تلوار لکڑی یا پتھر میں نہیں ہے بلکہ خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ تمام دنیا کی قوتیں مل کر بھی اگر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں اور خدا کا اذن نہ ہو۔ تو اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا۔ موت کا جو وقت خدا نے لکھ دیا ہے۔ اس سے پہلے کسی کے لائے موت نہیں آ سکتی۔

۷۔ قناعت و بے نیازی ایمان باللہ انسان کے دل سے حرص و ہوس کے رکیک جذبات کو دور کر دیتا ہے۔ ایمان کے ساتھ انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا ہوتی ہے۔ مومن ہمیشہ باعزت طریقہ سے اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور جو تھوڑا بہت مل جاتا ہے اس کو اللہ کی دین سمجھ کر قناعت کر لیتا ہے عزت و دولت اس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کو چاہے باعزت بنا دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔

۸۔ اصلاحِ اخلاق توحید سے انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے نفوس میں پاکیزگی اور اعمال میں پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کے باہمی معاملات درست ہوتے ہیں۔ پابندیٔ قانون کا احساس پیدا ہوتا ہے اور افراد ایک زبردست باطنی قوت سے اندر ہی اندر سدھر کر ایک صالح اور منظم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ دراصل یہ توحید کا معجزہ ہے۔ دنیا کی کسی حاکمانہ قوت یا تعلیم و تربیت یا وعظ و تلقین سے اصلاحِ اخلاق اور تنظیم اعمال کا کام اتنے وسیع پیمانے اور اتنی گہری بنیادوں پر انجام نہیں پا سکتا۔

۹۔ عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی عقیدۂ توحید کا اجتماعی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الٰہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا میں سائنس نے ترقی کی ہے اُس رفتار سے انسان کے شعور نے ترقی نہیں کی۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح مختصر کر دیا، رسل و رسائل کی آسانیوں نے اخبار و افکار کی نشر و اشاعت انتہائی سہل کر دی۔ لیکن اس سب کے باوجود انسانی ذہن کی تنگی کا حال یہ ہے کہ دنیا اب تک قوم پرستی اور وطن پرستی سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔ وطن پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہر حال میں اپنے وطن کا ساتھ دے۔ خواہ وہ حق پر ہو یا نہ ہو۔ یہ ذہن میں رہے کہ وطن پرستی اور حب الوطنی دو مختلف چیزیں ہیں۔ حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے لیکن وطن پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان حق و ناحق کا معیار اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر محض اپنے وطن کو بنا لے۔ یہ شرک کی ایک شکل ہے اور اسلام اس کی بھی اسی طرح بیخ کنی کرتا ہے۔ جس طرح شرک کی باقی تمام شکلوں کی۔

یہ قوم پرستی بھی درحقیقت شرک کی ایک قسم ہے اسی قوم پرستی نے گذشتہ نصف صدی میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تاریخ انسانی کی ہولناک ترین جنگوں کو جنم دیا اور آج بھی انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی خطرے کے پیش نظر دنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگ عالمی ریاست کی حمایت کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ ساری کوششیں اس وقت تک بیکار ہیں جب تک انسانیت وحدت الٰہ اور وحدت آدم پر اشتراک نہیں کرتی۔

اس وقت اقوام میں افراتفری کا عالم یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے اور نہ آدم۔ ہر قوم کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کی شہریت جدا ہے، اس کے معتقدات اور اخلاق جدا ہیں۔ اور ہر قوم اس علیحدگی کو نہ صرف قائم رکھنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے۔ ان قوموں میں اتحاد کے لئے کوئی مشترک رشتہ موجود نہیں مشترک رشتہ صرف ایک ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ سب ایک ہی خدا کو مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لئے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے۔ اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی اور کسی مشکل کو حل نہیں کر سکیں گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ تعلّق باللہ اور اس کی بنیادیں

۱۔ اللہ کا جامع تخیّل قرآن پاک کی آیات اور اسلام سے پہلے عربوں کے اشعار سے واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیّل ضرور موجود تھا، جس کا نام اُن کے ہاں اللہ تھا۔ مگر اللہ کیا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، اُس کا تعلق بندوں کے ساتھ کیا ہے؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیّل نہ تھا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ربّانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی اُن کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہاء اور جس کی وسعت غیر محدود ہے۔ جس کے علم کے حاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کر دے۔ اس کی محبت دنیا کا حاصل، اُس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

ان تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی اللہ کا نام یاد آتا تھا، وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اُس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہتے تھے۔ اس سرمستی و سرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی۔ دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لئے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدّ و جہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور اللہ کا حکم جان کر اس کی پوری مستعدی کے ساتھ بجا لانے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدار ازلی کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں اُن کی مدح فرمائی۔

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ" (النور۔ ۳۷)

وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا:

"وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ" (البقرہ۔ ۱۶۵)

ایمان والے سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ دیگر اہل مذاہب کا زاویۂ نگاہ ان کا توکل، ان کا صبر، اُن کی استقامت، اُن کی بہادری غرض اُن کی ہر چیز اُن کے اسی جذبۂ ایمانی کا پرتو تھی۔ دیگر مذاہب والوں کا معاملہ اس سے کچھ مختلف تھا۔ انجیل میں "باپ" کا لفظ اللہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور اللہ پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے، اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو نظر انداز کر کے دیکھئے تو یہ اللہ کے صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث (TRINITY) کے عقیدہ کو [illegible] کے پردہ میں چھپا لیا۔ یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ باپ (خدا)، بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس ہیں۔ یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں اپنے وجود میں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے اللہ کے جسم ہونے کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

یہودیوں کے صحیفوں میں خدائے برحق کا نام "یہوداہ" تھا، مگر عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ دوسرا عام نام "ادونائی" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ اللہ کے بیسیوں نام جو دراصل اس کے ذاتی اوصاف کے ترجمان ہیں، تورات کا دفتران کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ "فوجوں والا اللہ" ہے۔ جو اللہ کی صفت جلالی کا مظہر ہے۔ اہل ہنود میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات مختلف ہیں لیکن ہر صفت نے اُن کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے، اور خود اللہ ہر قسم کی صفات سے خالی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ہندوستان کے تمام مذاہب اسی تجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ برہما، مہیش، وشنو تین صفات خالق، مُمیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں۔ شنکر آچاریہ نے اللہ کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کئے ہیں یعنی حیات، علم اور سرور۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی۔ آپؐ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ رسولِ کریمؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا سکھلائی "اے خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور بعض کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتی ہوں"۔

بیہقی کتاب الاسماء والصفات)

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا "

(الکہف - ۱۰۹)

کہدو کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کیلئے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی، اگرچہ ہم ایسا ایک اور سمندر کیوں نہ لے آئیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ تعلّق باللہ اور اس کی بنیادیں

غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دینی احکام کی اطاعت کا اصلی مقصد عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے مابین تعلّق کو استوار کرنا ہے۔ ایک مومن پر فرض ہے کہ اللہ کی بندگی اور اطاعت کا فریضہ انجام دیتے وقت اپنا نصب العین صرف رضائے الٰہی کو بنائے۔ کیوں کہ "اطاعت" کے تصوّر کے ساتھ "اجر" کا تصوّر اسی طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصوّر۔ اس لئے اگر دین کا بنیادی تصوّر اور انسان کا فریضۂ حیات اللہ کی اطاعت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس اطاعت سے اس کا مقصد و منشا اللہ رب العزت سے اجر کا حصول ہی ہوگا۔ پھر چونکہ کسی بالاتر ہستی کی خدمت و طاعت کا اجر حاصل اُسی وقت ہوتا ہے جب وہ اس کار خدمت اور عملِ طاعت کو پسندیدہ اور قابلِ قبول پاکر اس سے خوش ہوگئی ہو۔ اس لئے فطری بات ہے کہ طالبِ اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر لگی رہتی ہے۔ وہ اگر خوش ہوگیا تو گویا اجر حاصل ہی ہوگیا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر قرآنی تصوّرِ دین کا واضح تقاضا یہ ہوا کہ انسان کی غرض اپنے مالک کی رضا حاصل کرلینا ہو اور اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے اس کی نظریں ہر وقت اسی مقصد پر لگی رہیں۔ اور یہ بھی کہ وہ جو نیکی بھی کرے اسی مقصد و نیّت سے کرے کہ اس کا تعلق اپنے اللہ کے ساتھ استوار ہو جائے۔

قرآن میں فرمایا:

"وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى" (اللیل - ۱۹-۲۰)

اور اس لئے نہیں دیتا کہ اس پر کسی کا احسان ہے جس کا وہ بدلہ اتارتا ہے۔ بلکہ اپنے ربِّ اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے۔

"وَمَا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ" (الحدید - ۲۷)

اور ہم نے ان پر اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے سوا اور کچھ فرض نہیں کیا تھا۔

پہلی بنیاد ایمان

تاہم تعلق باللہ استوار کرنے کے لئے چند امور اساس و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

تعلق باللہ استوار کرنے کے لئے اوّلین بنیاد ایمان باللہ ہے۔ یہ عقیدہ جو اسلام کے فکری و عملی نظام میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے محض اسی قدر نہیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمّل اور صحیح تصوّر رکھتا ہے۔ اسی تصوّرِ صفات سے وہ قوّت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر حکمران ہو جاتی ہے محض ہستیٔ باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے۔ جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکتا ہو۔ دوسری ملّتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کر دیا ہے، وہ یہی ہے کہ اس نے صفاتِ باری کا صحیح، مکمل اور مفصل علم بخشا ہے اور پھر اسی علم کو اصلِ ایمان بنا کر اس سے تزکیۂ نفس، اصلاحِ اخلاق، تنظیمِ اعمال اور بناءِ تمدّن کا کتنا بڑا کام لیا ہے۔ جو دنیا کے کسی مذہب و ملّت نے نہیں لیا۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت جس کے زبانی اقرار اور قلبی تصدیق کو دخولِ اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "الٰہ" بغیر اُس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ "الوہیت" کو کائنات کی جملہ اشیاء سے سلب کر کے صرف ایک ذات کے لئے ثابت کیا جائے، اس مجمل کلمہ کے اجزاءِ ترکیبی تین ہیں:۔

(۱) ایک الوہیت کا تصوّر

(۲) تمام اشیاء سے اس کی نفی

(۳) صرف اللہ کے لئے اس کا اثبات

قرآن مجید میں اللہ کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

یہ ایمان باللہ کا اجمالی مفہوم ہے مگر اس کی وسعت اور جامعیت کا یہ عالم ہے کہ دین کے تمام ایمانیات و عقائد اسی ایک اصل کی فرع ہیں۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر و مرجع اللہ کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے فرشتے ہیں۔ کتابوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہیں۔ رسولوں پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لئے ایمان ہے کہ وہ اللہ کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لئے فرائض ہیں کہ اللہ نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لئے حقوق ہیں کہ وہ اللہ کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کی اطاعت اور نواہی سے اجتناب اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہیں۔ غرض ہر چیز جو اسلام میں ہے، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بناء ایمان باللہ پر ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کر دیجئے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں، نہ اُن کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و واجبات میں نہ اوامر و نواہی کسی قوتِ نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ قوانین و ضوابط۔ ایمان باللہ کے ہٹتے ہی یہ سارے کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

پس تعلق باللہ کی پہلی بنیاد اللہ کی ذات پر ایمان ہے۔ اس ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم محتاج ہیں کسی کو نفع و ضرر پہنچانا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کے افعال کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں نہیں بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوتِ وجود، قوتِ فعل اور قوتِ تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ اس لئے کائنات کی کوئی شئے ایسی نہیں جو "الوہیت" کا شائبہ ہی اپنے اندر رکھتی ہو۔ اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لئے "الوہیت" ثابت کرتا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ۔ اُسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو۔ اُسی سے محبت کرو، اُسی سے ڈرو، اُسی سے اُمید رکھو۔ جو کچھ مانگو اُسی سے مانگو۔ ہر حال میں اُسی پر بھروسہ کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اُسی کے پاس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے اور تمہارا اچھا یا بُرا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔ ایمان باللہ اصل ہے اور دیگر تمام ایمانیات اس کی فرع ہیں۔ یہ تعلق باللہ کی پہلی بنیاد ہے۔

دوسری بنیاد اطاعت

اللہ کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد اُس کی اطاعت ہے، جس میں انبیاء کتب مقدسہ اور یوم آخر پر ایمان سب شامل ہیں۔ اس لئے کہ کسی چیز پر ایمان لانے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہستی کو تسلیم بھی کیا جائے اور عملی زندگی میں اس کی اطاعت بھی کی جائے۔ اُس نے انبیاء پر جو کتب مقدسہ نازل کیں اور اُن میں جو احکام اپنے بندوں کو دیئے ان پر عمل کرنے کا نام ہی اطاعت ربانی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنے بندوں کو احکام براہِ راست نہیں دیتا بلکہ انبیاء و رُسل کی وساطت سے دیتا ہے۔ اس طرح انبیاء کی اطاعت بالواسطہ اللہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے اور اُن کے دیئے ہوئے احکام کے بغاوت کی ہم معنی ہے۔ قرآن کریم میں انبیاء کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

"وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (النساء - ۶۴)

ہم نے کوئی رسول سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد کیلئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت، جو اصل مقصود ہے اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ کیوں کہ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس لئے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ کیوں کہ رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء - ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔

احادیث میں بھی اس حقیقت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا۔

"جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے اُن کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نشانِ امتیاز ہیں۔" (صحیح بخاری)

اطاعت کے بارے میں قرآن نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہدیا ہے کہ محض ظاہری اطاعت مطلوب نہیں بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے خلوصِ دل کے ساتھ اطاعت کرے جو نزاع باہم بپا ہو اُس کے لئے حکم خداوندی کی طرف رجوع کرے جو رسول کریمؐ کے ذریعے مل سکتا ہے۔ اور وہاں سے جو فیصلہ بھی ہو اُسے اطمینانِ قلب سے قبول کرے اور دل میں بدگمانی اور شکایت نہ رکھے۔

غرض یہ کہ تعلق باللہ کی دوسری بنیاد عملی زندگی میں اللہ کی اطاعت ہے جس میں انبیاء کی اطاعت بھی شامل ہے۔ اس اطاعت پر مضبوطی سے قائم ہوئے بغیر تعلق باللہ کے سب دعاوی طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ کے ہم معنی ہیں۔ اس سے اُن لوگوں کے دعویٰ کی قلعی کھل جاتی ہے جو اپنے آپ کو ولی، قطب اور نہ جانے کیا کچھ کہتے ہیں مگر اُن پر اطاعت الٰہی کی کوئی چھاپ نظر نہیں آتی۔

تیسری بنیاد اخلاص و محبت

کسی کام کو صرف اللہ تعالیٰ کے تقرب و رضا کے لئے انجام دینا اور مخلوق کی خوشنودی و رضامندی یا اپنی کسی نفسانی خواہش کو شامل نہ کرنا اخلاص کہلاتا ہے۔ اخلاص کے وجوداً و عملاً تین درجے ہیں۔

اخلاص: (۱) ایک یہ کہ فعل کو انجام دیتے وقت صحیح مقصد پیش نظر ہو یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ غلط مقصد پیش نظر ہو، یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ کچھ بھی پیش نظر نہ ہو، نہ غلط مقصد اور نہ ہی صحیح۔ بلکہ یونہی معمول کے مطابق ایک کام انجام دیا جائے۔ یہ درجہ متوسط ہے، یہ اخلاص سے اس قدر بعید نہیں جس قدر دوسرا فعل ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور مقصد یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو، اس کے سوا اور کوئی نیت نہ ہو۔ یہ اخلاص کا درجۂ کمال ہے۔ ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص میرے خشوع و خضوع کو دیکھ کر میرا معتقد ہو جائے گا۔ یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ ہم حسبِ معمول نماز پڑھ لیں اور کوئی خیال دل میں نہ ہو۔ یہ صورت بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ البتہ کسی حد تک اخلاص کے قریب ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ کام اپنے اختیار سے کیا جائے وہ کسی غرض کے تصور سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تعلق باللہ کے لئے ضروری ہے جو افعال ہمدست صادر ہوں وہ محض رضائے الٰہی کے لئے ہوں۔ کوئی کام کیسا ہی نیک ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اُس میں جس قدر اخلاص زیادہ ہوگا اسی قدر اجر و ثواب بڑھتا جائے گا۔ حدیث میں آیا ہے کہ میرا صحابی اگر آدھ سیر جو اللہ کی راہ میں خرچ کرے تو وہ دوسرے کے اُحد کے برابر سونا خرچ کرنے سے بہتر ہے۔ چونکہ صحابہ کے دلوں میں خلوص و محبّت دوسروں سے بہت زیادہ تھی اس لئے اُن کے صدقات و حسنات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

مَحبّت: محبّت کے لغوی معنی کسی ایسی چیز کا ارادہ کرنے یا چاہنے کے ہیں جس سے کسی خیر کا ملنا متوقع ہو۔ (مفردات امام راغب)

ظاہر ہے کہ محبّت ایک ہی قسم کی نہیں ہوتی، بلکہ بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ محبّت جس کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے اور جو اپنے طور پر خواہ کتنی ہی ترقی کر جائے محبّت ہی رہتی ہے۔ دوسری محبّت وہ ہوتی ہے جس کا سرچشمہ طبعی جذبات ہوتے ہیں۔ اور یہی وہ محبّت ہوتی ہے جو اگر حدّ سے بڑھ جائے تو عشق کہلاتی ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ادراک ہم حسّی اور طبعی طور پر نہیں کرتے۔ اس لئے اُس سے کی جانے والی محبّت بھی دراصل عقلی نوعیّت ہی کی ہوتی ہے۔ قرآن حکیم نے عشق کے لفظ اور اس کے فطری تقاضوں کے ذکر سے مکمل اجتناب کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ اُسے جو محبّت مطلوب ہے وہ یہی عقلی محبّت ہے، نہ کہ وہ محبّت جو طبعی اور جذباتی ہوتی ہے۔

الغرض تعلّق باللہ کی تیسری بنیاد اخلاص و محبّت ہے۔ دین میں [illegible] ایمان یا اطاعت معتبر نہیں جو اللہ کی محبّت اور اخلاص پر مبنی نہ ہو۔ محبّت بھی محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں، بلکہ ایسی محبّت مطلوب ہے جو تمام محبّتوں پر غالب آجائے۔ جس کے مقابلہ میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلّقات کی قدر و قیمت بھی باقی نہ رہے۔ جس کے لئے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے، لیکن اس کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبّت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:۔

"کہدو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اُس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے" (التوبۃ-۲۴)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایمان کی حقیقی لذّت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ (صحیح بخاری و مسلم)

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اللہ سے جو خلوص و محبّت مطلوب ہے اس سے مراد وہ جذباتی محبّت نہیں جو انسان کو بیوی بچوں سے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبّت ہے جس کی بناء پر انسان اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عزیز ترین چیزوں پر ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے۔ اگر ان اصولوں کی راہ میں خود اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے لڑتا ہے، دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے، یہاں تک کہ بیوی بچے، خاندان، ملک اور قوم بھی ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات ٹھکرا دیتا ہے۔

مندرجہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ اللہ سے محبت کا یہی تقاضا ہے کہ اس کے احکام و فرامین پر عمل کیا جائے اور اگر نہ کیا جائے تو عشق و محبت کے تمام دعوے کھوکھلے اور بے بنیاد ہیں۔ حدیث جبریل ـــــ جس میں دین کے اصول و مبادیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ـــــ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کے دریافت کرنے پر کہ احسان کیا چیز ہے، فرمایا:

"اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ" (صحیح بخاری)

تعلق باللہ یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو یہ سمجھے کہ وہ تجھے دیکھتا ہے۔

اس حدیث پاک میں حقیقی اخلاص، خشوع و خضوع اور توجہ الی اللہ کی منظر کشی کی گئی ہے یعنی اللہ کی عبادت کرتے وقت انہماک، دلجمعی اور توجہ الی اللہ کا یہ عالم ہو کہ انسان یوں تصور کرے کہ وہ ان مادی آنکھوں سے جمال الٰہی کا نظارہ کر رہا ہے اور پوری کائنات کا تصور اس کی نظر سے مٹ چکا ہے۔

بس ایمان، اطاعت اور اخلاص وہ ستون ہیں جن پر تعلق باللہ کی عمارت کو استوار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تینوں امور اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ دین کے کلیات سے لے کر فروع و جزئیات تک کوئی چیز ان کے احاطہ سے باہر نہیں۔ ان کے بغیر تعلق باللہ کے سب دعوے بے کار ہیں۔ ؎

زبان نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبال)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) رسالت

۱۔ انبیاء کی ضرورت

انسان کو انبیاء کی کیا ضرورت ہے؟ رسولوں کا سلسلہ کیوں قائم کیا گیا؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کے لئے ہمیں ذرا دور سے جانا ہوگا یعنی پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ انسان کو اپنی زندگی میں فلاح کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اور وہ صحیح کامیابی کیوں کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کامیابی زیادہ عرصہ قائم رہنے والی نہیں ہے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان کو آخرت میں جو باقی رہنے والی ہے، کامیابی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ انسان دونوں عالم میں کامیابی حاصل کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقاصد کا تعین صحیح طور پر کرے اور اس کے حصول کے لئے صحیح راہ عمل تلاش کرے۔ اس کے لئے اُسے ہدایت کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ فلاح کس عقیدے اور کس طریقے میں ہے۔

اسلام نے اس دوگونہ کامیابی کے حصول کا جو طریقہ بتایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے اس لئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کی اطاعت کے ذریعہ اس ہدایت سے پورا فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

اللہ کی بندگی اور اطاعت کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے کیوں کہ اطاعتِ احکام ہی کی ہوتی ہے اور احکام کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے ایک انسان جوں ہی اپنے پروردگار کا بندہ اور اطاعت گزار بن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لامحالہ یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے مالک کے وہ احکام کیا ہیں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے، اس کا مالک کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن باتوں کو ناپسند کرتا ہے؟ اس کا وفادار ٹھہرنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے اور اس کی نافرمانی سے محفوظ رہنے کے لئے اسے کیا کرنا چاہیئے؟ یہ ساری باتیں جانے بغیر اطاعت الٰہی کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ انسان یہ کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور فلاں فلاں کاموں سے روکا ہے؟

اس کے جواب میں جن چیزوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک تو ہر شخص کی اپنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

عقل ہے لیکن انسان کے لئے بطور خود یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اس کی زندگی کے اور اس کائنات کے بنیادی حقائق کیا ہیں؟ اس کے خالق و پروردگار میں کیا صفات پائی جاتی ہیں؟ انسانوں سے ان صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ اور ان کے لئے اس کے احکام کیا ہیں؟ غرض کہ اس سلسلے میں عقل کی نارسائی بالکل مسلم ثابت ہے۔

دوسری چیز انسان کا وجدان اور اس کی قلبی قوت کیا ہے۔ لیکن اس قوت کا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ریاضت نفس کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی یہاں کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکتی کیونکہ انسان اپنے ظرف کو جیسا بھی کر لیا ہے کیسا ہی آئینہ کیوں نہ بنالے، اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کا عکس آپ سے آپ ہرگز نہیں دکھائی دے سکتا۔ آئینے میں کسی چیز کا عکس پڑنے کے لئے یہی تو کافی نہیں ہے کہ آئینہ صاف اور چمک دار ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کھلی شکل میں اس کے سامنے اور قریب موجود ہو۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جب تک خود ہی اپنے احکام کا تعین کر کے انہیں وجود میں نہ لائے اور وجود میں لا کر قلب انسانی کے سامنے نہ رکھ دے، لاکھ صاف اور چمک دار ہونے کے باوجود بھی اس کے اندر ان کی چھاپ نہیں پڑ سکتی۔

تیسری چیز مختلف افراد کے الگ الگ فکر کے بجائے اجتماعی غور و فکر ہے۔ لیکن جس طرح ہزاروں اور لاکھوں اندھے مل کر ایک آنکھوں والے شخص کی حیثیت حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح افراد انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد بھی احکام الٰہی کے دریافت کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آخر بہت سے افراد کا مجموعہ بھی تو ایسے ہی لوگوں سے مل کر بنا ہوگا جن میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنی عقل سے احکام الٰہی معلوم کر لینے کا خواب بھی دیکھ سکے۔ اس لئے یہ ذریعہ بھی اتنا ہی ناکام ذریعہ ہے جتنا کہ پہلا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ان تینوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو انسان کی یہ ضرورت پوری کر سکے۔

بلاشبہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کا برا یا بھلا ہونا ہمیں خود بخود محسوس ہو جاتا ہے اور ان کی برائی یا بھلائی کا فیصلہ ہم اپنی عقل یا اپنی فطرت یا اپنے وجدان سے کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہدایت الٰہی بھی برے اور بھلے کاموں کے تعین ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات سے یہ خیال کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ انسان بطور خود اللہ تعالیٰ کے سارے احکام اور مرضیات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کیونکہ کچھ کاموں کے بُرے یا بھلے ہونے کا علم و اندازہ تمام کاموں کے بارے میں علم و اندازے کا قائم مقام کسی طرح نہیں بن سکتا۔ ذرا اپنی دنیا کو دیکھئے آخر وہ کتنی قدروں میں متفق ہے؟ کتنے کام ہیں جن کے بھلے ہونے پر اور کتنے کام ہیں جن کے برے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

[illegible] ہے؟ [illegible] حیات کے [illegible] ایسے کاموں اور ایسی قدروں کی کوئی فہرست تیار نہیں کی جا سکتی جن پر ہر زمانے اور ہر جگہ تمام لوگوں کا اتفاق ہو اور جن تھوڑی سی باتوں پر اتفاق ہوگا تفصیلات میں یہ اتفاق بھی قائم نہیں رہے گا۔ چند باتوں کے برے یا بھلے ہونے کا فیصلہ اگر نوع انسانی کر بھی سکتی ہے تو یہ خیر و شر کے پورے مسئلے کو حل کر سکنے کی قابلیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ یہ نہ کہا جائے گا کہ دیئے کی روشنی، روشنی ہی نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا پڑے گا کہ پوری دنیا کو منور کرنے کے لئے سورج کی ضرورت ہے اور ٹمٹماتا ہوا دیا سورج کی جگہ نہیں لے سکتا۔

غرض اس معاملے میں انسانی قوتوں کی بے بسی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے خلاف نہ عقل کچھ کہہ سکتی ہے نہ تجربہ و مشاہدہ زبان کھول سکتا ہے اس صورت حال کا مطالبہ واضح طور پر یہی تھا کہ اس معاملے میں انسان کو بھٹکنے کے لئے چھوڑنے کے بجائے اس کی اوپر سے رہنمائی کی جاتی کیونکہ اس کی اپنی فکری اور وجدانی قوتوں میں اگر یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات معلوم کر لیتیں۔ حالاں کہ انسان کو اس بات کی ضرورت اتنی ہی تھی، جتنی غذا اور پانی کی۔ تو اب اس کی ضرورت کے پوری ہونے کی شکل اس کے سوا اور کوئی رہ ہی نہیں جاتی کہ اس کا اللہ کی طرف سے کوئی خارجی انتظام ہو۔

ایک طرف تو یہ صورت حال اور انسان کی سب سے بڑی بنیادی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اللہ کی ربوبیت تھی، اس کی رحمت تھی، اس کا عدل تھا، اس کی حکمت تھی اور ان میں سے ہر ایک صفت کا مطالبہ تھا کہ انسان کو یوں بے بسی کے اندھیرے میں نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کی مدد کی جائے، اس کو وہ احکام صاف صاف بتا دیئے جائیں جن کے جانے بغیر وہ بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ رب العالمین اپنے احکام و مرضیات کو انسانوں تک پہنچانے کے لئے کوئی خارجی اہتمام نہ کرتا اور اس سلسلے میں ایک دن کی بھی تاخیر روا رکھی جاتی، اور نسل انسانی کی ابتداء کے ساتھ ہی ساتھ اس اہتمام کی بھی ابتداء نہ ہو جاتی۔ جس پروردگار نے انسان کی مادی ضروریات کا اتنا بڑا انتظام کر رکھا تھا، اس کی شان پروردگاری سے بالکل بعید تھا کہ وہ اس کی اخلاقی، دینی اور سماجی ضرورتوں کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ جس آقا نے انسان پر اپنی مرضی کی راہ چلنے کی ذمہ داری ڈالی تھی اس کی رحمت اور اس کا انصاف یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرے۔ چنانچہ اس نے یہ انتظام کیا۔ اور یہی وہ انتظام ہے جسے دین کی اصطلاح میں "رسالت" کہا جاتا ہے اور جس واسطے سے یہ انتظام ہوتا ہے اسے "رسول" کہتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جہاں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف نہیں ہو سکتا وہاں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مومن اور مسلم بننے کے لئے رسالت پر ایمان لانا انتہائی ضروری ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح آنکھوں کی بینائی میں بینائی ضروری ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز کسی منزل تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہو جب تک اسے اپنا نہ لیا جائے منزل تک پہنچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ رسالت کی عملی اہمیت اس سے بھی اونچی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے بغیر اللہ کے احکام کو نہیں جانا جا سکتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر خود اللہ اور آخرت کو بھی نہیں جانا جا سکتا۔ رسالت ہی وہ ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم عطا کرتا ہے۔ اس لئے رسالت کے بغیر اللہ اور آخرت پر ایمان بھی، جیسا کہ چاہیئے، نہیں لایا جا سکتا۔

۲۔ انبیاء کی بنیادی خصوصیات

اس سے پہلے "انبیاء کی ضرورت" کے تحت ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانوں کو جیسے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے ویسے ہی الہامی ہدایت اور انبیاء کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سب سے پہلے جس انسان (حضرت آدمؑ) کو بھیجا اسے منصب نبوت سے سرفراز کیا۔ حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد تک خدا کے تمام فرمان پہنچائے، اور ان کی اولاد نے اپنے بیٹوں، پوتوں تک ان ہدایات کو منتقل کیا۔ لیکن جوں جوں انسانی نسل پھیلتی اور دور دراز کے علاقوں میں آباد ہوتی گئی اس تعلیم کے نقوش مدھم پڑتے گئے، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا۔ ان جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء بھیجے تاکہ انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام سرانجام دیں۔ یہ پیغمبر مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں آئے۔ ان میں چند مثلاً حضرت نوح۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت اسحاق، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے ہم اچھی طرح مانوس ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ہزارہا انبیاء آئے۔ ایک اندازہ کے مطابق تمام انبیاء کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

قرآن کریم میں انبیاء کی جو خصوصیات بیان کی گئیں ہیں ان میں سے نمایاں خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ بشریت

اگرچہ انبیائے کرام علیہم السلام باطن اور معنویت میں عام انسانوں سے بہت بلند تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب انسان ہی تھے۔ نہ وہ فرشتوں کے گروہ سے تھے اور نہ جنوں سے۔ اسلام کے نزدیک یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خدا یا اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا بیٹا یا اس کا کوئی اوتار انسانی شکل میں آکر الہامی ہدایت پہنچائے۔ دراصل انبیاء میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی تسلیم کر لینے کے بعد توحید و نبوت کی حیثیتیں مشتبہ ہو جاتی ہیں۔ خدا کی یکتائی کا تصور مجروح ہوتا ہے اور انبیاء کی بعثت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا کہ:

"اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (الکہف) | میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ بسا اوقات انبیاء پر یہ اعتراض بھی ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا شخص جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور دیگر انسانی ضروریات رکھتا ہے نبوت کے منصب پر فائز ہو جائے لیکن ان کے اعتراضات کے باوجود انبیائے کرام نے کبھی یہ نہیں کہا، نہیں، ہم تو بشر نہیں ہیں اس سے بلند تر کچھ چیز ہیں، ان کا متفقہ جواب تھا:۔

"اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" (ابراہیم - ۱۱) | بلاشبہ ہم تمہاری طرح انسان ہونے کے علاوہ کچھ نہیں۔

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی اعتراض ہوا، لوگوں نے کہا کہ اگر خدا کو کوئی پیغامبر بھیجنا ہی تھا تو وہ ہمارے ہی جیسے انسان کے بجائے کسی فرشتے کو کیوں نہ بھیجتا۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ:

"اگر اس زمین پر فرشتے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے" (بنی اسرائیل : ۹۵)۔

یہ درحقیقت بڑا ہی حکیمانہ جواب ہے۔ اس لئے کہ (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) پیغمبروں کا کام محض یہ نہیں ہے کہ نعوذ باللہ ڈاکیے کی طرح اللہ کی کتاب پہنچا دیں بلکہ ان کے کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی کو ھدایاتِ الٰہی کا مظہر بنا کے دکھا دیں اور دنیا کے سامنے مثال اور نمونہ بن کر پیش ہوں۔ اب اگر فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا تو اگرچہ وہ خدا کا پیغام پہنچا دیتے لیکن فرشتہ ہوتے ہوئے آخر وہ ان احکام پر کیسے عمل کر پاتے جن کا تعلق خاص بشری جذبات و داعیات اور مخصوص انسانی مسائل سے ہے اور جب وہ شریعت کے ایک بڑے حصے پر عمل ہی نہ کر پاتے تو اپنے پیروؤں کے لئے اچھا نمونہ کیسے ثابت ہوتے۔ مزید برآں فرشتوں یا دیگر غیر انسانی مخلوقات کی مثال انسانوں کے کام کی ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ انسان اقتدا اسی کی کر سکتا ہے جو قوت و اختیار کے اعتبار سے اسی جیسا ہو مختلف الجنس مخلوق ہمیں مرعوب تو کر سکتی ہے لیکن ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔

۲۔ وھبیت | وھبیت کے معنی یہ ہیں کہ رسالت کوئی اکتسابی شے نہیں جو محنت اور تلاش و جستجو سے مل جائے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے اور اسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شخص کو ملتی ہے جسے وہ مرحمت فرماتا ہے۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اکثر پیغمبروں کے حالات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ آغاز وحی سے پہلے وہ ایک عرصے تک عبادت و مراقبہ میں مشغول رہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات کے ملنے سے پہلے چالیس روز تک روزے کی حالت میں کوہ طور پر رہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام ایک سنسان جنگل میں بہ روز تک عبادت میں مشغول رہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہینوں غارِ حرا میں عزلت گزیں رہے۔ اس طرح کی عبادت اور ضبطِ نفس میں وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود نبوت کا منصب النسابی نہیں جو محنت و کوشش سے حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے انسانوں میں مختلف کمالات عطا کئے ہیں لیکن ان کے بالفعل حصول کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح انبیاء میں نبوت بالقوہ موجود ہوتی ہے البتہ قبول وحی کے لئے استعداد حاصل کرنے کے لئے انبیاء کو بھی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی عبادت و ریاضت خواہ کتنی ہی کیوں نہ کرے چونکہ بالقوہ نبوت کی صلاحیت سے محروم ہے لہٰذا نبوت حاصل نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس منصب و ذمہ داری کے لئے افراد کا انتخاب خود کیا۔ اس انتخاب خود کو قرآن کی زبان میں اصطفاء کہتے ہیں۔ اصطفاء کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ رسالت کے لئے انتخاب ایسے ہی افراد کا ہوا تھا جو خدا کے نزدیک اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے اس عظیم مقصد کے لئے موزوں ترین تھے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اپنے لئے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (الانعام - ۱۲۵)

اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کو عطا کرنی چاہیئے۔

۳۔ تعلیمات من جانب اللہ

پیغمبر دین اور شریعت کے نام پر جو کچھ انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ وہ ہدایت ربانی کے تابع ہوتے ہیں، نہ خود ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے اور نہ ذاتی ارادہ۔ وہ وہی کرتے اور کہتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے:

"وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝" (النجم - ۳-۴)

وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔

نبی کی ساری تعلیمات کے اللہ ہی کی جانب سے ہونے کا مطلب بہت وسیع ہے۔ اس کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہِ راست یا فرشتے کے ذریعے نبی کو سکھا دیئے ہوں۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی حکمت اور نورِ نبوت اس کو عطا ہوئے ہیں ان کے ذریعہ اس نے خود مزید احکام نکالے ہوں، یہ دونوں قسم کی تعلیمات بلا واسطہ یا بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔

" وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۷)

(یعنی) جو کچھ حکم رسول تمہیں دے اسے مان لو اور جس چیز سے وہ منع کر دے اس سے رک جاؤ۔

۴۔ عصمت نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں نہ اخلاق و اعمال کی لغزشیں۔ نفس اور شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق و افکار اور اعمال بھی پاک ہوتے ہیں لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں غلط کام کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی طرح انبیاء علیہم السلام کے اندر بھی یہ قابلیت طبعی طور پر لازماً موجود ہوتی ہے، لیکن اس قابلیت کو بروئے کار آنے میں کامیابی نہیں ہو پاتی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی فکر و بصیرت بھی حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام الٰہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعہ مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوفِ خدا اور اس کا اندیشۂ آخرت اس درجہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں کہ گناہ کے محرکات سر اٹھا ہی نہیں پاتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی رہتی ہے اور یہی نگرانی انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور اخلاق و عمل کی کوتاہیوں سے بچائے رکھتی ہے۔ اور اس طرح اس کا ہر قول حق اور ہر عمل صحیح و صواب ہوتا ہے اور پوری زندگی ایک صاف اور روشن آئینہ کی مانند ہوتی ہے۔ جسے خالق کائنات نے انسانوں کے لئے اُسوہ (مثالی نمونہ) مقرر فرمایا ہے اور جس کی اتباع میں نجات ہے۔

درحقیقت نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لئے بالکل ناگزیر تھا جس کے لئے رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے، یا خیانت کر سکتا ہے یا نفسانیت کا شکار ہو سکتا ہے، یا منشائے الٰہی کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے، آخر دوسروں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ لوگ کیسے یقین کریں کہ وہ فلاں حکم دیتے ہوئے سچ بول رہا ہے۔ یا خدا کے نام پر جو ہدایات دے رہا ہے وہ سب کی سب فی الواقع خدا کی طرف سے ہیں۔ اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کمی و بیشی نہیں کی جس کا دامن غلطیوں یا گناہوں سے آلودہ ہو، لوگوں کے لئے اعلیٰ ترین اور قابلِ تقلید نمونہ (اسوۂ حسنہ) کیسے بن سکتا ہے؟ نبی کو چوں کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اللہ تعالیٰ نے احکام الٰہی کی مکمل اطاعت کا اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر بھیجا تھا لہٰذا ان کے دامن کو گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا تاکہ لوگ بلا خوف و خطر ان کی زندگی کے ہر پہلو کی پیروی کر سکیں۔

یاد رہے کہ نبی نہ صرف یہ کہ معصوم ہوتا ہے بلکہ فی الحقیقت معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے۔ فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور سیرت و کردار کی لغزشوں سے پاک ہونا صرف اللہ کے انہی خاص بندوں کا حصہ ہے۔ دوسرے لوگ خواہ فہم و بصیرت اور نیکی و تقویٰ کی کتنی ہی بلند چوٹیوں پر کیوں نہ پہنچ جائیں لیکن معصوم عن الخطا نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی زندگیاں قابل تقلید ضرور ہیں لیکن ان کے اعمال دین میں حجت بالذات نہیں ہیں اور نہ تنقید سے بالاتر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انبیاء کی زندگیاں سند و حجت کی بناء پر تنقید سے بالاتر ہیں۔

۵۔ ہر قوم کے لئے نبی

ان موٹی موٹی باتوں کے علاوہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء ہر قوم میں بھیجے گئے ہیں:۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (فاطر - ۲۴)	کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی خبردار کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو۔

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تمام انسان برابر ہیں اور سب ایک ہی مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اللہ کی بندگی سبھی کا فریضہ ہے اور آخرت میں اس فرض کے متعلق ہر ایک سے پوچھ گچھ ہوگی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا کہ کچھ لوگوں میں تو اللہ نبی بھیجتا اور باقی لوگوں کو ان سے محروم رکھتا حالانکہ وہ خالق و مالک سب کا ہے۔

ان تمام انبیاء کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور نہ صرف ماننا بلکہ ان کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ بدقسمتی سے اکثر مذاہب اس سلسلے میں اپنے پیروؤں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہودیوں پر انبیائے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور نبی کا اقرار فرض نہیں رہا، ہندو تمام غیر ہندو انسانوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھ کر ہی بہترین ہندو رہ سکتے ہیں مسیحی حلقوں میں پیغمبر اسلام کی جی بھر کر توہین ہوتی ہے، غرض کہ عام طور پر ایک مذہب کے ماننے والے اپنے دائرے کے باہر کسی نبی کی عزت و توقیر ضروری نہیں سمجھتے، لیکن مسلمان ایسا نہیں کر سکتے، ان پر تمام انبیاء کی تعظیم فرض ہے۔

۶۔ منصب رسالت

انبیاء علیہم السلام کے منصب اور ان کے درجے کے بارے میں اچھی خاصی غلط فہمیاں رہی ہیں اور بعض حلقوں میں اب بھی ہیں۔ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ انبیاء درجۂ بشریت سے بلند، فرشتے یا خدا ہوتے ہیں، یا کم از کم خدائی میں تھوڑے بہت شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ انبیائے کرام نے خود ہمیشہ اس کی تردید کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ۔ (ہود۔ ۳۱)

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضے میں خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

اسی طرح بعض انبیاء علیہم السلام کو ان کی قوموں نے خدا کا بیٹا بنا لیا۔ حالانکہ انہوں نے بھی اعلان کر دیا تھا:

"اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۔ (مریم۔ ۳۰)

مَیں اللہ کا بندہ ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ پچھلی اُمتوں نے اپنے انبیاء کی تعظیم و تکریم میں غلو کرتے کرتے انہیں خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ اس بات کا بڑا خیال رکھا کہ کوئی شخص آپ کی ایسی بے جا تعظیم نہ کرے جس سے فتنہ پیدا ہو۔ کئی بار لوگوں نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے سختی سے روک دیا اور بار بار خدا کے سامنے اپنی بندگی اور بیچارگی کا اعلان کیا۔

ایک طرف تو انبیاء کے مرتبے میں اس درجہ غلو کیا گیا کہ انہیں خدائی تک پہنچا دیا گیا۔ دوسری طرف ایک گروہ نے رسالت کے درجے کو اس قدر کم سمجھا کہ رسول کی حیثیت ایک ڈاکیہ یا نامہ بردار سے زیادہ نہ رہی، انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نبی کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب انسانوں تک پہنچا دے اور بس۔ لیکن اگر رسولوں کا کام اتنا ہی ہوتا تو خدا یہ کام دوسروں سے بھی لے سکتا تھا۔ آخر اس کے لئے یہ کیا مشکل تھا کہ لوگوں پر لکھی لکھائی کتابیں نازل کر دیتا یا فرشتوں کے ذریعے کتب بھیج دیتا۔ لیکن چونکہ شہادت کا کام بڑا وسیع ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل بھیجے، ان انبیاء کی ذمہ داریاں اور ان کے مناصب کیا تھے، اس سلسلے میں ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کریں گے کہ اس نے انبیاء کی کیا حیثیت بیان کی ہے۔

۷۔ قابلِ اطاعت

قرآن کریم کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی ہے اور ایسا سمجھنا شرطِ ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے اور مصلحت خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہرصورت یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء۔ ۶۴)

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔

پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہیں ہونی چاہیئے بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (النساء - ۶۵)

پس نہیں، اے نبی! تمہارا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ آپس کے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے فیصلے پر بلا کسی دلی تنگی کے آمادگی کے ساتھ سر تسلیم خم نہ کر دیں۔

اور یہ بات عقل کے مطابق بھی ہے اس لئے کہ انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ نبی ہے نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ہو ہی نہیں سکتی یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی دعوت کے ساتھ یہ مطالبہ کیا :

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝ (الشعراء - ۱۱۰) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

اس دعوت سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ صرف رسول کی اطاعت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور صرف رسول ہی بتا سکتا ہے کہ خدا کے احکام کیا ہیں اور ان احکام پر کس طرح عمل کیا جانا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار اطیعوا اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول (رسول کی اطاعت کرو) کا بھی حکم آیا ہے۔ نبی دین و شریعت کے دائرے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے یہ حقیقت نبی کی حیثیت کو اور بھی اہم بنا دیتی ہے کیوں کہ اس صورت میں نبی کی اطاعت نہیں رہ جاتی بلکہ خدا کی اطاعت بن جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا گیا۔

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء - ۸۰)

جس نے رسول کی اطاعت کی اُسی نے خدا کی اطاعت کی۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی کا ایک بڑا اہم منصب "مطاع" کا ہے۔ وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کامل اطاعت کی جانی چاہیئے، ایسی اطاعت جس میں نہ کوئی قید و شرط ہو نہ کوئی بے دلی۔ جو شخص نبی کا مقام اس سے نیچے سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور بالکل نہیں جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں۔

۸۔ شارح کتاب اللہ

اللہ تعالیٰ کی شریعت چونکہ ہمیشہ رہنے کے لئے ہے لہٰذا کتاب اللہ میں زیادہ تر زور اصول و مبادی پر دیا گیا ہے اور اللہ کے پیغمبر کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ ان کی تشریح و توضیح کریں، سورۂ نحل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ :

"وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ" (آیت - ۴۴)

اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) تمہاری طرف اس لئے نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کیلئے تم اس ہدایت کو واضح کر دو، جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ بات ظاہر ہے کہ تشریح و توضیح خود کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد بھی کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے اسی طرح اگر کتاب میں کسی عملی مسئلے کا ذکر ہو تو بسا اوقات شارح کو عملی مظاہرے کے ذریعے سے مطلب سمجھانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں، انبیاء معصوم ہوتے ہوتے ہیں، اسی بناء پر ان کی یہ تشریح و تعبیر خطا سے بالاتر اور ہمیشہ کے لئے حجت ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ قرآن کی تشریح اور اس سے احکام اخذ کرنے کا جو کام کریں گے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو، وہ حجت نہیں ہوگا۔

۹۔ معلّم و مُربّی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے کہ:۔

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (آل عمران - ۱۶۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے کہ خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اور دیگر متعدد مقامات پر اس مفہوم کی آیات وارد ہوئی ہیں۔ ان ساری آیات میں جو بات مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف قرآن کی آیات سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین اور مقاصد تھے۔

(۱) لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم "الکتاب" کی تعلیم دیں۔

(۲) اس کتاب کے منشاء کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔

(۳) افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشو و نما دیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ پڑھ کر سنانے کے علاوہ نبی کے جو فرائض ہیں ان میں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی ہے۔ اور جب یہ تعلیم آپ کے فرائض نبوت میں سے ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ اسی تعلیم کو پیغمبرانہ حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی تعمیل امت مسلمہ کے لئے فرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی زبانی تعلیم اور عملی مظاہرے کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایات اور عمل کے ذریعے محفوظ رکھا اور وہ "احادیث وسنن" کے نام سے موسوم ہوا۔

۱۰۔ پیشوا اور نمونہ تقلید

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما بنایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایات و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لئے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، وہ جس اُمت میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) روشن ہوتے ہیں جن کی روشنی میں کر ایک ہوتی ہے۔ سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ" (آیات ۳۱-۳۲)

اے نبی کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دیگا اور اللہ غفور و رحیم ہے۔ کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

اسی طرح سورۂ احزاب میں کہا گیا ہے۔

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ" (آیت ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تقلید موجود ہے۔ ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہے۔

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو پیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تقلید کو مسلمانوں کے لئے لازم قرار دیا ہے۔ یہ آیات اسی بات کی طرف واضح رہنمائی کرتی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک میں، حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

إِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ: كِتَابَ اللَّهِ وَسُنَّتِي۔

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی عملی زندگی)

جو مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ کی زندگی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی آپ کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۱- شارع اور قانون ساز

سورۂ اعراف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ

(اعراف (آیت - ۵۷)

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کیلئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن (غیر الٰہی قوانین) اتار دیتا ہے، جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات عطا کئے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے اس لئے وہ بھی قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ یہی بات سورۂ حشر میں بڑی صراحت سے ارشاد ہوئی ہے:-

"وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ" ۵ (الحشر آیت)

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کردے اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرو، بلا شبہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

۱۲- قاضی اور حکم

قرآن میں بے شمار جگہوں پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی و حکم مقرر کیا ہے۔

"إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ

(النساء - ۱۰۵)

اے نبی، ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم فیصلے کرو جیسا کہ اللہ تمہیں دکھائے۔

مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ جب رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا (سمعنا و اطعنا) اسی طرح ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول کسی معاملے میں انہیں کوئی حکم دے دے تو وہ اسے بسر و چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے دل میں فیصلے کے خلاف ذرا بھی تنگی نہیں ہوتی۔

انبیاء کے گوناں گوں مناصب میں سے یہ صرف چند تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ قرآن میں ان کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ انبیاء ہادی (رہنما) نذیر (ڈرانے والے) داعی (خدا کی طرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دعوت دینے والے) مبشر (خوشخبری سنانے والے) مبلغ خدا کے احکام پہنچانے والے) مزکی (برائیوں سے پاک کرنے والے) سراج منیر (روشن چراغ) بھی تھے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ انبیاء عام رہنماؤں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اگرچہ عام رہنماؤں میں ہمیں معلم بھی مل جاتے ہیں، حاکم بھی، قانون ساز بھی اور جج بھی، لیکن ان لوگوں کی رہنمائی اور انبیاء کی رہنمائی میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ عام رہنما یا تو خود ساختہ ہوتے ہیں یا عوام کے بنائے ہوئے۔ اس کے برخلاف انبیاء کو نہ کوئی شوق ہوتا ہے اور نہ وہ عوام الناس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جملہ مناصب کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی یہ جملہ حیثیتیں حاکم، قاضی، شارع وغیرہ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ کوئی بات اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کرتے۔ صرف وہی کچھ کہتے ہیں جس کا خدا نے انہیں حکم دیا ہو۔ وہ خدا کے فرمان میں تبدیلی یا اضافہ بھی نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ ان کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

(اسلام ایک نظر میں از مولانا صدرالدین اصلاحی)

۱۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سلسلے میں موجودہ دور میں بہت کافی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اللہ کے رسول کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں جو کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک دیانتدار قاصد کی ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن ہم تک پہنچا دیا اور اس کے بعد آپ کا تعلق ہم سے اور ہمارا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ لیکن ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصور صحیح نہیں اس لئے کہ رسول صرف پیغامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ معلم، مزکی، قانون ساز اور رہنما بھی ہوتا ہے اور یہ سارے مناصب اسے خدا ہی کی طرف سے ملتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں، علم ظاہر اور علم باطن، ان کے نزدیک علم ظاہر یعنی شریعت کا علم (جو ان کے نزدیک کمتر درجے کا علم ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں میں پھیلایا لیکن علم باطن یعنی طریقت کا علم صرف چند لوگوں کو دیا اور انہی سے یہ علم سینہ بہ سینہ چلا۔ یہ خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو مجروح اور ان سے ہمارے تعلق کو کمزور کرتا ہے، اس لئے کہ انہیں جس علم سے نوازا گیا تھا وہ پوری انسانیت کے لئے ضروری تھا۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہمیت نہیں دیتے۔ ماحول کے زیر اثر احترام بھی کرتے ہیں لیکن بس اس طرح کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ! ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان کی دنیوی اور اخروی سعادت کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بلا چون و چرا مان لے۔ ان لوگوں کے نزدیک "زمانے کے تقاضے" کچھ اور ہیں، اور زمانہ قدیم کی روش پر اب بھی اصرار کرنا جہالت اور تاریک خیالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ چوتھا گروہ ہمارے عوام الناس کا ہے جس کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے اور اس عقیدت کی تسکین کے لیے میلاد کرنے کے علاوہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

ان امور کے پیش نظر ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے وہ بنیادیں واضح کی جائیں۔ قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو چار بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ ایمان، اطاعت، اتباع اور محبت۔ ذیل میں ہم ان سب کی مختصر تشریح کریں گے۔

۱۔ ایمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی یہ پہلی بنیاد ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے، اس بات پر اعتماد کہ آپ صادق و امین ہیں، آپ کے ہر قول و فعل میں گہری حکمت ہے۔ جو راہ آپ نے دکھائی ہے اگرچہ اس میں ظاہراً کتنے ہی خطرات نظر آتے ہوں مگر نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے اس بات پر اعتماد کہ آپ نے زندگی کے اصول سکھائے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر اس پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا طریقہ جو آپ نے بتایا اور سکھایا ہے اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ یہ اعتماد اور یقین انسانوں میں پیدا نہ ہو وہ ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے:۔

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینًا وبمحمد رسولا (صلعم)	ایمان کا مزہ اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمدؐ کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہو گیا۔

اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے علوم و افکار اگر کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ کتاب و سنت کے مؤید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر و فلسفہ کو یا کسی وجدان و کشف کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھہرائے یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے تو اس کا دعوائے ایمان محض ایک فریب نفس ہے اس لئے کہ اس کا ایمان اس اعتماد سے خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

۲۔ اطاعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد اطاعت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی نبی یا رسول محض اس لئے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایت وہ دے اس کی بے چون وچرا تعمیل کی جائے۔

اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ" (نساء-۶۴)

ہم نے کوئی رسول سوائے اس مقصد کے کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت، جو اصل مقصود ہے، اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ اپنے بندوں سے براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطے سے کرتا ہے۔ رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے۔ کیوں کہ رسول کی اطاعت، درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

"مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ" (النساء) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

احادیث میں بھی اس حقیقت کو بہت تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ "جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نشان امتیاز ہیں۔" (بخاری)

اس اطاعت کے بارے میں بھی قرآن نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ محض ظاہری اطاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری کہ آدمی پورے خلوص دل کے ساتھ اطاعت کرے۔ جو قضیئے اور جھگڑے پیدا ہوں، ان کے لئے اللہ کے رسول کی طرف رجوع کرے اور وہاں سے جو بھی فیصلہ ہو اسے اطمینان اور پوری رضامندی سے قبول کرے اور دل میں بدگمانی اور شکایت نہ رکھے۔

ان احکام کا تعلق صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارک ہی سے نہیں تھا۔ بلکہ اب بھی جب کہ آپ کی ذات پاک ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو آپ کی سنت آپ کی قائم مقام ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس کی اطاعت بھی آپؐ کی اطاعت ہے۔ اپنی وفات سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا "میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں، جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قائم رہو گے گمراہ نہ ہو گے ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول اللہ"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ آپؐ کو رسول ماننے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم آپ کی کتاب و سنت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپؐ نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جا رہا ہے اور اطاعت اپنی ہوا و ہوس کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بالکل خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو یہ رسول کو صحیح معنوں میں ماننا نہیں ہو گا۔

۴۔ اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت میں کیا جاتا ہے تو صرف وہ باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و ہدایات اور اوامر و نواہی کی ہوتی ہے لیکن اتباع کے دائرہ میں مستحبات اور نوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہو سکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں خلوص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا لیکن اتباع میں متبوع کے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا ضروری ہے۔

صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بھی کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی حکم دیا تو اطاعت کر لی بلکہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہوں میں بسا لیتے اور اس کی تقلید کرتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھال دے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباع رسول میں صحابۂ کرام کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں بلکہ فی الحقیقت اتباع رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ہر ہر ادا معرفت الٰہی کا نشان ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ اس کا اتباع کرتے ہیں، یہاں تک کہ خدا کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۔ ۳۱)

اے نبی کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا۔

۴۔ محبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا اطاعت معتبر نہیں جس کی بنیاد محبت نہ ہو۔ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ ہو۔ محبت بھی محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے جس کے مقابلہ میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی قدر و قیمت نہ رہ جائے، جس کے لئے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:۔

"قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ" (توبہ ۔ ۲۴)

کہدو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔

اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی شخص کا ایمان متحقق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیز و اقارب سے عزیز نہ رکھے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ایمان کی حقیقی لذت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔"

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ جذباتی محبت نہیں جو انسان کو بیوی بچوں سے ہوتی ہے۔ بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبت ہے جس کی بناء پر انسان اپنی عزیز ترین چیزوں پر ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے۔ اگر ان اصولوں کی راہ میں خود اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے لڑتا ہے، دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے یہاں تک کہ بیوی بچے، خاندان، ملک اور قوم بھی ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات ٹھکرا دیتا ہے۔ اس محبت کی اس اصولی نوعیت کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(ترمذی) "فَقَدْ اَحَبَّنِیْ"	جس نے میری سنّت سے محبّت کی اس نے مجھ سے محبّت کی۔

اسی حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت کا یہی تقاضا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل نہ ہو تو محبّت کا دعویٰ کھوکھلا اور بے بنیاد ہے۔

۱۴۔ اُسوۂ رسولؐ اللہ یہ انبیائے کرام اور بانیان مذہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا یہی باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے۔ اور یہی ایک معیار اس فیصلہ کے لئے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہو سکتا ہے۔ مفید نصیحتوں، میٹھی میٹھی باتوں اور اچھی اچھی تعلیموں کی دنیا میں کمی نہیں۔ کمی اس چیز کی ہے وہ کام اور عمل ہے۔ موجودہ مذاہب کے شارحوں اور بانیوں کی سیرتوں کے تمام صفحے پڑھ جایئے۔ دلچسپ تصویریں ملیں گی۔ دل آویز حکایتیں ملیں گی۔ خطیبانہ بلند آہنگیاں ملیں گی تقریر کا زور شور اور فصاحت و بلاغت کا جوش نظر آئے گا۔ مؤثر حکایتیں تھوڑی دیر کے لئے خوش کر دیں گی مگر جو چیز نہیں ملے گی وہ عملی کام اپنے احکام و نصائح کو آپ برت کر اور کر کے دکھانا ہے۔

انسان کی عملی سیرت کا نام خُلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا اور کس مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا؟ لیکن قرآن نے صاف کہا اور دوست و دشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا:

"وَ اِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (القلم ۳-۴)	(اے محمدؐ) بیشک تیری مزدوری نہ ختم ہونے والی ہے اور بیشک تو بڑے (درجہ کے) اخلاق پر (فائز) ہے

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے بحیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھا دیا۔

آپؐ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبّت کی نصیحت کی تو شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اور خدا کے ذکر سے آپؐ کی زبان غافل ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپؐ ہر وقت اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

آپؐ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپؐ کا حال کیا تھا؟ عام پیروؤں کو تو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا، مگر خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے طلوع آفتاب کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، عصر، مغرب، عشا، پھر تہجد، پھر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز بھی کیسی کہ رات رات بھر خدا کے حضور میں کھڑے ہیں حتیٰ کہ کھڑے کھڑے پائے مبارک میں ورم آجاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتیں "اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے پھر اس قدر کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں"۔ فرماتے "اے عائشہ، کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"۔ یعنی نماز حقیقت الٰہی سے نہیں ہے بلکہ محبت الٰہی اس کا منشا ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔

آپ نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں "جب آپ روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے"۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو تین تین دن بغیر کھائے پیئے متصل روزے رکھتے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔

آپ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت مشہور ہے "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قرابت داروں کا حق پورا کرتے ہیں، مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آتا سب اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ حالانکہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں نہ کمی تھی مگر وہ سب غیروں کے لئے تھا۔ اپنے لئے کچھ نہ تھا۔ اگر تھا تو یہی فقر و فاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور سب سے زیادہ سخاوت آپ رمضان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ کے ساتھ ایک راستے سے گذر رہا تھا راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ابوذر، اگر احد کا یہ پہاڑ میرے لئے سونا ہو جائے تو کبھی میں پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لئے کچھ چھوڑ دوں" یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے۔ بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور باہر آگئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرمایا" مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمدؐ کے گھر میں پڑا رہ جائے" اس سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف اور بے چینی ہے۔ لیکن اسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں حکم ہوتا ہے کہ" انہیں خیرات کر دو کیا محمدؐ اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں"

آپؐ نے زہد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا طرزِ عمل کیا تھا؟ آپ سُن چکے ہیں کہ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ و صدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے۔ مگر امیرِ عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہا کرتی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپؐ کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ جب آپؐ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لئے تھوڑے سے جو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جو کے بدلے میں آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ فرزندِ آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں۔ رہنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانکنے کو کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی" یہ محض الفاظ کی خوشنما بندش نہ تھی بلکہ یہی آپؐ کی طرزِ زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔ آپ کا کپڑا کبھی تہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا یعنی جو بدن مبارک پر کپڑا ہوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہ کیا جاتا۔ ایک دفعہ ایک سائل خدمتِ اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواجِ مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ" گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے"۔ ۹ھ ہجری میں جب اسلام کی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توشہ خانہ کی مالیت یہ تھی۔ جسمِ مبارک پر ایک تہبند، ایک کھری چارپائی، سرہانے ایک تکیہ جس میں خرمے کی چھال بھری تھی۔ ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ اور بس۔

آپؐ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت معلوم ہے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور تنگدستی کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو کاشانۂ نبوت سے جواب ملا۔ " اے فاطمہ! ابھی تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے" ایک دفعہ آپؐ کے پاس چادر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ تھی۔ ایک صحابیہ نے لاکر پیش کی۔ اس وقت ایک صاحب نے کہا، کیسی اچھی چادر ہے۔ آپؐ نے فوراً اتار کر ان کی نذر کر دی۔ ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا ان سے کہا، عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ گئے اور جا کر لے آئے حالانکہ آپؐ کے گھر میں اس آٹے کے سوا رات کے کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔

خدا پر اعتماد، توکل اور بھروسہ کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھو۔ حکم الٰہی تھا کہ "واصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل" یعنی، جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا تو بھی دکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی کر کے دکھا دیا۔ پھر آپؐ ایک ایسی جاہل اور ان پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی۔ اور اس کے لئے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی مگر آپؐ نے کبھی اس کی پروا نہ کی اور اپنے فرض کو پورا کرتے رہے۔ قریش نے آپؐ کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں مگر صبر و استقلال کا سررشتہ آپؐ کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ ہجرت کے وقت غار ثور میں پناہ لیتے ہیں۔ کفار آپؐ کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ بے یار و مددگار نہتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم دو ہی ہیں لیکن ایک تسکین بھری ہوئی آواز آتی ہے۔ ابوبکرؓ ہم دو نہیں "لا تحزن ان اللہ معنا" گھبراؤ نہیں ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہونچنے کے بعد چونکہ یہود، منافقین اور قریش کی ریشہ دوانیاں اور غارتگری حد سے بڑھ چکی تھیں اس لئے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن کی رات کو حفاظت کرتے لیکن جب آیت "واللہ یعصمک من الناس" (خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا) نازل ہوئی تو اس وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر پہرے کے سپاہیوں سے فرمایا "لوگو، واپس جاؤ مجھے چھوڑ دو کہ میری حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی ہے"۔ غزوۂ نجد سے واپسی میں آپؐ ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں صحابہ کرام اِدھر اُدھر ہٹ گئے ہیں۔ ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آجاتا ہے۔ آپؐ بیدار ہوتے ہیں۔ موقع کی نزاکت قابل غور ہے۔ بدو پوچھتا ہے "بتاؤ اے محمدؐ، اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟" اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ "اللہ"! اس پُر اثر جواب سے دشمن متاثر ہو جاتا ہے۔ اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے عفو و درگذر سے کام لینا اور دشمنوں سے پیار کرنا گویا صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی حصہ تھا۔ چناں چہ ابوسفیان نے جو برابر سات سال تک آپؐ کے خلاف فوجیں لاتے رہے، بارہا آپؐ کے قتل کا فیصلہ کیا۔ ہر قدم پر اسلام کے سخت ترین دشمن ثابت ہوئے لیکن فتح مکہ سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پہلے جب حضرت عباسؓ کے ساتھ وہ آپؐ کے سامنے آتے ہیں تو گو ان کا ہر جرم ان کے قتل کا طالب ہے مگر رحمت عالم کا عفو عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) انتقام کے جذبہ سے بالاتر ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ان کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں:۔

"مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِیْ سُفْیَانَ کَانَ اٰمِنًا۔" (جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لیگا اس کو بھی امن ہوگا)۔

ہندہ (ابوسفیانؓ کی بیوی) جو احد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی تھی، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کی تھی اور جس نے ان کے سینے کو چاک کر کے کلیجہ چبانا چاہا، وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی کچھ تعرض نہیں فرماتے بلکہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ چناں چہ عفو عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے "اے محمدؐ! آج سے پہلے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے۔"

اسی طرح ہبار بن الاسود وہ شخص تھا جو ایک حیثیت سے آپؐ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ کا قاتل تھا اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ مکہ کی فتح کے موقع پر اس کا خون ہدر کیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے حضور کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے جرائم کی جو اطلاعیں آپؐ کو ملی ہیں۔ وہ سب درست ہیں۔" اتنا سنتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دوست و دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

غرض، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ آخری حج کے موقع پر جب کہ شمع نبوت کے ارد گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم تھا، انسانوں کو خدا کا آخری پیغام سنایا جاتا ہے عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جاتی ہے

"آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کاروبار آج باطل کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔"

بہرحال، آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی کا جائزہ لے لیجئے لیکن ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ نظر نہیں آسکتا۔

۴۔ اسلامی تصورِ آخرت

(۱) انسان کی دنیوی زندگی در اصل اس کی اُخروی زندگی کا مقدمہ ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار ہے۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے۔ اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بار آور ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا۔

(۲) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس پورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے۔

(۳) اس نظام کے درہم برہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوگی جس میں انسان کے اُس کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیئے تھے ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے گی اور بُرے اعمال کی بُری سزا دی جائے گی۔

لیکن اسلام کے پیش کردہ اس حل کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ان کوششوں کا تذکرہ مفید ہوگا جو انسان نے ان سوالات کے حل کرنے کے لئے خود کی ہیں۔

۱۔ مادّہ پرستوں کا نقطۂ نظر اور اس کا علمی جائزہ

ایک جماعت کے نزدیک زندگی جو کچھ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے، اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں۔ جس کے بعد حیات، شعور، احساس، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں۔

" اِنۡ هِیَ اِلَّا مَوۡتَتُنَا الۡاُوۡلٰی وَمَا نَحۡنُ بِمُنۡشَرِیۡنَ ۝ (الدخان - ۳۵)	اور (انکار آخرت کرنے والے) لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرنا ہے اور پھر ہمیں اٹھنا نہیں ہے۔
وَقَالُوۡا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَنَحۡیَا وَمَا یُهۡلِکُنَا اِلَّا الدَّهۡرُ ۚ (الجاثیہ - ۲۴)	اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اسی دنیا کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

ان لوگوں کے نزدیک یہ کارخانۂ عالم جس طرح چل رہا ہے یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے۔ کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ یہ بات اس بنا پر نہیں کہتے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے اور فی الحقیقت یہ کارخانۂ عالم لازوال ہے۔ بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوتی۔ اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے۔ مگر کیا ہمارا کسی شئے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیاء کا وجود اور ہمارا عدم احساس اشیاء کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے۔ اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ دراصل فنا ہو جاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے محسوس کیا اور اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو معدوم ہو گیا۔ کیا کوئی صاحب عقل میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد سرے سے کوئی حیات ہی نہیں ہے۔

پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے۔ اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ کیونکہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اس پار جھانک سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم اُدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جا سکے کہ اُدھر کچھ ہے بھی یا کچھ نہیں ہے۔ پھر اگر کارخانۂ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ ہم نے اس امر کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، کیونکہ میں نے اس کو نہ گرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی نظر آتی ہے جو اس کے کبھی گرنے کی پیشین گوئی کرتی ہو۔ کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا؟

لیکن زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے۔ بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس بات کا بہت گہرا تعلق ہے اور در اصل ہمارے اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ کیونکہ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا، اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے۔ جس میں مجھے اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا، اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا، تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس لاہور سے کراچی تک جانا ہے۔ اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا۔ جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہے۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ لاہور سے کراچی ہی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک منزل ہے۔ اس کے بعد اسے ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس کارنامے کی خفیہ مسل موجود ہے جو میں نے پاکستان میں انجام دیا ہے اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجے کا مستحق ہوں۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص لاہور سے کراچی ہی تک کے سفر کی تیاری کرے گا اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لئے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے تک ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ اور دوسرا یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلے میں ہے۔ پہلا شخص اپنے افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کی نگاہ ان نتائج پر ہوگی جو اس دوسرے ملک میں پہنچ کر نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرز عمل کا یہ فرق براہ راست نتیجہ ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح

www.KitaboSunnat.com
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی اور موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اُٹھائیں گے اس کی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اس زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اُٹھے گا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہوگی۔

چنانچہ اگر انسان کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قائم ہو کہ بس زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے، یہ ہمیشہ رہے گی۔ تو یقیناً ایسے شخص کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ ناموافق حالات کی بنا پر اس سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی۔ کیوں کہ جب وہ اپنی نیکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑ جائے گی، جب وہ اپنی مظلومی کی دادرسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور جب وہ شریروں، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف سرنگوں ہونے ہی کے لئے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے وہاں خودکشی کی رفتار نہایت تیز ہے اور وہ اقوام جن کا پختہ یقین زندگی بعد موت پر ہے ان میں خودکشی کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پروفیسر فلپ ہٹی اس امر کا تذکرہ بطور خاص کرتا ہے کہ مسلمانوں میں خودکشی کا رواج سب سے کم ہے اور قرونِ اولیٰ میں تو اس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ دراصل نتیجہ ہے تصورِ آخرت کا۔

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسر پوری ہو۔ وہ ظلم و ستم کرے گا، لوگوں کے حقوق غصب کرے گا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لئے کوئی بدسے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آسکتی ہے۔ وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت یا اسی قسم کے اور دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ صرف ایسے جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جس کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو۔ تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوں گی اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پورے معاشرے کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے، اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسیات کی بنیاد پر تعمیر ہوگا۔ نیکی محض دنیوی فائدے کے ہم معنی ہوگی اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہو کر رہ جائے گی، غرض، دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا برے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو تو انسان افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ سزا و جزا کے لئے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام "ضمیر" ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لئے کافی سزا ہیں، اور اس کا اطمینان انسان کے لئے نیکی کا کافی معاوضہ ہے۔ مگر اوّل تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لئے انسان کو اتنی قربانی کرنا پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے، اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں، ان ہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا۔ اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ضمیر کا رُخ بھی پھر جائے گا۔

۲۔ ہندو مت کا تصورِ آخرت

ہندو کے خیال میں موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں بلکہ محض تبدیلِ جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی۔ اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں اس نے بہم پہنچائی ہیں۔ تو روح اعلیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طبقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض اس نظریہ کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور ان ہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اس دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتائج بھگتیں۔ گویا اس عقیدے کی رو سے ایک شخص جو اس وقت انسان ہے وہ اس لئے انسان ہو گیا کہ جب وہ جانور تھا تو اس نے اچھے عمل کئے تھے۔ اور اور ایک جانور جو اس وقت جانور ہے وہ اس لئے جانور ہو گیا کہ انسان کی جون میں اس نے بُرے عمل کئے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انسان وحیوان اور درخت ہونا سب دراصل پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے! اس طرح اس نظریے کو ماننے کے لئے ایسی باتوں کو ماننا ضروری ہے جو صریح علم وعقل کے خلاف ہیں۔ چناں چہ

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو اور نبات اور حیوان ہونے کے لئے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ ایں چہ بوالعجبی است؟

۲۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح، جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی، جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہیں۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات، حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں، نہ کہ نفوس کے۔ اس لئے جو نفس انسان کے قالب میں عقلی وفکری قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں لابعقل ہو گیا۔ اور نباتی قالب میں اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہو گئی۔

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالارادہ کئے جائیں۔ اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہو سکتے ہیں، اور ان پر جزا اور سزا بھی ہو سکتی ہے، لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے۔ اور نہ ان کے لئے جزا وسزا کی کوئی وجہ جواز ہے۔

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ برے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہیئے۔ اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل ہم کو ملا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس برے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں۔ لامحالہ اس سے بُرے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہو گا۔

غرض، عقل سلیم اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی ترقی کرتا گیا، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ظاہر ہے کہ اس رویے کا اثر انسانی زندگی اور تمدّن پر اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا ہو جب کہ اس میں سرے سے کوئی معقولیت ہی نہیں پائی جاتی۔ اسی اعتقاد سے "اہنسا" کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لئے حد درجہ مہلک ہے۔ جو قوم اس عقیدہ کی قائل ہو اُس کا جذبۂ شجاعت فنا ہو جاتا ہے اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہو جاتی ہیں۔ اور وہ قوائے جسمانی کو نشو و نما دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ عقیدہ تمدن و تہذیب کا بھی دشمن ہے اور انسان کو رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیاسی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھیں جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہو کر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے مستعد ہو جائیں۔ کیا یہ تخیّل تہذیب و تمدن کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کر سکتی ہے؟

۳۔ یہود و نصاریٰ کا تصورِ آخرت

یہود روزِ قیامت اور اُخروی جزا و سزا کے قائل تھے "ایوب" میں لکھا ہے:۔

"کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ میرا بدلا دینے والا زندہ ہے اور روز آخرت زمین پر قائم ہوگا۔ ہر چند میرے مرنے کے بعد میرا جسم کرم خوردہ ہو جائے گا۔ لیکن میں اپنے گوشت میں سے خدا کو دیکھوں گا۔"

واعظ کی کتاب میں لکھا ہے:۔

اے جوان تو اپنی جوانی میں خوش ہو اور اپنی بلوغت کے دنوں میں اپنا جی بہلا۔ مگر جان رکھ کہ ان ساری باتوں کے لئے خدا تجھ کو عدالت میں لائے گا۔"

کفّارۂ مسیح کا عقیدہ:۔ عیسائی آخری اور جزا و سزا کو مانتے ہیں۔ مگر وہ کفارے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مسیح نے صلیب پر جان دے کر تمام بنی آدم کے گناہوں کو چھپا لیا ہے اور اُن کے لئے نجات کا موجب بن گئے ہیں۔ عیسائیوں کے نزدیک ہر انسان پیدائشی گنہگار ہے۔ آدم اور حوّا نے جو گناہ کیا وہ وراثتہً ہر شخص کی فطرت میں چلا آ رہا ہے، جس کی وجہ سے ہر شخص گنہگار ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک نیک اعمال نجات کے موجب نہیں ہو سکتے۔ اگر اللہ تعالیٰ بندے کے گناہ توبہ اور استغفار سے معاف کر دے تو اس کا یہ رحم اس کے عدل کے خلاف ہے۔ اللہ رحیم ہے، اس کا رحم چاہتا ہے کہ انسان سزا سے بچ جائے۔ وہ عادل بھی ہے، اُس کے عدل کا یہ تقاضا ہے کہ سزا ضرور دی جائے۔ رحم اور عدل ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ بندے کی نجات کا ہونا ضروری ہے۔ بندوں کو نجات دلانے کی ایک صورت یہ ہے کہ خدا کا بیٹا یسوع مسیح جو تمام گناہوں سے پاک اور معصوم ہے لوگوں کے تمام گناہوں کو اپنے اوپر لے کر جان کی قربانی دے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سارے لوگوں کے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔

۴۔ اسلامی عقیدۂ آخرت اور اس کے دلائل

سوالات کے ان دو غیر مطمئن جوابات کے بعد اب تیسرا حل زیر بحث ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جیسے جیسے اسلام کے جوابات کو غائر نظر سے دیکھیں گے اس کی حقانیت و صداقت مبرہن ہوتی چلی جائے گی۔

اسلام کے نزدیک، جیسا کہ ابتداً اشارہ کیا گیا، ان بنیادی فطری سوالات کا جواب یہ ہے کہ:

(ا) ایک دن اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔ یہ دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے۔

(ب) پھر وہ سب کو ایک دوسری زندگی بخشے گا، اور سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔

(ج) تمام لوگوں نے اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا پورا نامۂ اعمال خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔

(د) اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور بُرے اعمال وزن فرمائے گا، جس کی بھلائی خدا کی میزان میں برائی سے زیادہ وزنی ہوگی اس کو بخش دے گا اور جس کی برائی کا پلہ بھاری رہے گا اسے سزا دے گا۔

یہ ہے فطری سوالات کا وہ جواب جسے اسلام "عقیدۂ آخرت" کے نام سے موسوم کرتا ہے یہ وہ مذہب ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید اسی مذہب کا پر زور وکیل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس کے تذکرے سے خالی ہو۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس عقیدہ کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت پر کلام کریں، ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس نظریہ کے حق میں کیا دلائل ہیں اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

۵۔ عقلی دلائل

یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسی تجربہ کے حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص، جو چند لمحہ قبل تک سانس لیتا اور اپنے ارادہ سے حرکت کرتا تھا، وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہوگیا اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شے غائب ہوگئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متحرک مادے کو نمو اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا یہ سوال کہ وہ شے کہاں چلی گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے یا معدوم ہوگئی؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قائم ہوگا یا نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے ہم اس سوال کا نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اس چیز کو فی نفسہٖ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے ہیں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس بنا پر جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ سائنس سے انحراف کرتا ہے۔ سائنس کی رو سے کوئی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے؟ (کیوں کہ یہ میرے حسی اور تجربی علم سے باہر ہے) لیکن اگر وہ یہ کہے کہ "چوں کہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ اس لئے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا" تو یقیناً معقولیت کے حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ ایک گنوار نے اگر "راکٹ" نہیں دیکھا تو وہ کہہ سکتا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ "راکٹ" کیا چیز ہے" لیکن جب وہ کہے گا کہ "میں جانتا ہوں کہ راکٹ کوئی چیز نہیں ہے" (کیوں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا) تو عقل مند اس کو احمق کہیں گے۔ اس لئے کہ اس کا کسی چیز کو نہ دیکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہے ہی نہیں۔ ایک آدمی کیا۔ اگر ساری دنیا کے لوگوں نے بھی کسی چیز کو نہ دیکھا ہو تو بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے جب تک ہم کوئی یقینی ذریعۂ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹیفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں نہ اقرار۔

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹیفک رویے کو نباہ سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں۔ لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرز عمل قائم کریں یا اقرار پر۔ مثلاً ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں۔ اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ درپیش نہ ہو تو آپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایمان دار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایمان دار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے، مگر اس کی ایمان داری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کریں گے، عملاً اس کی صورت تو وہی ہوگی جو اس کی ایمانداری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہم بہر حال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں۔ اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتی تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے۔ اور دوسرے یہ نظام کائنات۔ ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز بچی رہتی ہے جس کے لئے کسی دوسری نوعیت کے نظام (دوسری زندگی "آخرت") کی ضرورت ہو۔

انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت سے معدنیات، نمکیات، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے اس کے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نمک، گیسیں، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لئے جن قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کائنات کے اندر کارفرما ہیں، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، پودے، اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں۔ اور وہ قانون بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ جو نشو و نما پانے والے اجسام کے لئے درکار ہیں۔ پھر انسان ایک زندہ وجود ہے۔ جو اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں خشکی، تری، اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں، اور وہ قوانین بھی بتمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرہ عمل پر حاوی ہونے کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے، جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے۔ نیک اور بد کی تمیز ہے۔ نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے۔ اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ اور وہ ظلم اور انصاف، سچائی اور جھوٹ، حق اور ناحق، رحم اور بے رحمی، احسان اور احسان فراموشی، فیاضی اور بخل، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاقی صفات کے درمیان فرق کرتا ہے۔ یہ صفات عملاً، اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتب ہوتے ہیں۔ لہٰذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبیعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے اس لئے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو۔ سارا نظام کائنات طبیعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے۔ اخلاقی قوانین کسی طرف کارفرما نظر نہیں آتے، یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے مگر سچائی میں نہ وزن ہے، نہ قیمت۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی، بلکہ اکثر جوتیوں کی۔ یہاں مادی وسائل کیلئے کوئی قانون مقرر نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ مقرر نتیجہ نکل سکے طبیعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاقی نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبیعی قوانین دے دیں۔ اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے مگر طبیعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ اس لئے اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں۔ دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے ردعمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اس کے پورے نتائج وصول کرنے کے لئے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت ظاہر ہے کہ انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی اور حیوانی عناصر کے لئے تو موجودہ طبیعی دنیا اور اس کے طبیعی قوانین کافی ہیں مگر اس کے اخلاقی عنصر کے لئے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لئے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس میں اخلاق کا قانون حکمران ہو اور طبیعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مرتب ہوئے ہیں اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو، جہاں آگ صرف اس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایک ایسا نظام عالم ضرور موجود ہو۔

۶۔ قرآن کا طرز استدلال

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیئے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی؟ تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو طبیعی قوانین پر بنا ہے ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کردے گا۔ اور بیک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ غلطی اور فروگزاشت کے بغیر محفوظ ہوگا، ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا ردعمل دنیا میں ہوا ہے، اس کی پوری روداد موجود ہوگی، وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہوں گی جو اس ردِّ عمل سے متاثر ہوئیں۔

ایک ایک ذرّہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضاء شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا مستوجب ہے۔ یہ انعام اور یہ سزا، دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جاسکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے، وہاں مقداریں کچھ اور ہوں گی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے، انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کرسکے گا۔ بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں اور جس انسان کی برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں وہ ان کی پوری سزا بھگتے گا بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اُسے تکلیف سے بچا سکے۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ خصوصاً آج کل جب کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات قدم قدم پر اس نظریۂ آخرت کی تائید و توثیق کرتے چلے جارہے ہیں۔ مثلاً خود سائنس دانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک دن سورج ٹھنڈا اور بے نور ہوجائے گا۔ سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔ اور یہ دنیا تباہ ہوجائے گی۔ یا جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ جو آواز ہمارے مُنہ سے نکلتی ہے وہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوا میں تھوڑی سی لہر پیدا کر کے فنا ہو جاتی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہر آواز اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو دوبارہ پیدا کیا جا سکتا ہے چنانچہ گراموفون کا ریکارڈ اسی اصول پر بنا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہماری ہر حرکت کا ریکارڈ ان تمام چیزوں پر منقوش ہو رہا ہے جن کے ساتھ اس حرکت کا کسی طور پر تصادم ہوتا ہے۔ غرض، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟

۷۔ قرآنی دلائل اس موقع پر اگر مختصراً قرآنی طرز استدلال پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر قرآن نے جو طرز استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الٰہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ مثلاً

"اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (الاعراف - ۱۸۵)

کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین کے انتظام پر غور نہیں کیا۔

گویا اشارہ کیا گیا کہ اگر تم آنکھیں کھول کر ان آثار کو دیکھو، جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو اور ان سب محسوسات اور مشاہدات پر غور و فکر کر کے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔ پھر وہ ان ہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدیہی ہیں۔ اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات (اُخروی زندگی) کو تم بعید از عقل سمجھ رہے ہو، تمہاری عقل و قیاس سے دُور ہو مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

"ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا"۔ (النازعات - ۲۷)

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ خدا نے تو ایسی (بڑی چیز کو) بنایا ہے۔

جس خدا نے اتنا بڑا نظام کائنات پیدا کیا ہے، جس نے اجرام سماوی کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے، جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کر سکتا اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسے غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے جن کے ادراک سے تم عاجز ہو، اس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے، کیسی بڑی خام خیالی ہے۔ آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"

(حم السجدہ - ۳۹)

اور (۳۱) کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سوئی پڑی ہے پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ بھیگ اٹھی اور لہلہانے لگی تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

"اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ"

(الحج - ۵)

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اُٹھنے میں شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی سیسی بے جان شے سے تم کو پیدا کیا ہے۔

اسی طرح ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل معمولی سمجھ سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہو جانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے۔ پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ جوڑنے پر قادر نہیں ہے؟ اسی مثال پر قیاس کر لو کہ صانع عالم، جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہو سکتا۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ

(الروم - ۲۷)

اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتداء کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لئے سہل تر ہے۔

۸۔ عقیدۂ آخرت کے انسانی زندگی پر اثرات

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس دنیوی زندگی کے بعد ایک اُخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن اور اغلب اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے۔ اور عقل (بشرطیکہ صحیح و سلیم ہو) اور علم (بشرطیکہ حقیقی ہو) ہم کو اُخروی زندگی کے اس تصور پر، جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے نہیں روکتے بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حیات اُخروی کا مسئلہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ اس کو ماننے سے زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے۔ آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کی جوابدہی کرنی ہے اور مستقبل کی سعادت و شقاوت اس کے حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ جو شخص اس اُخروی زندگی کا معتقد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاقی افعال کے صرف انہی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مرتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے مہلک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا۔ وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھے گا۔ اسی طرح عدل و امانت اور عفت کو بھی مفید سمجھے گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا۔ خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو، بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اس کے پاس اخلاقی اعمال کی متعین اخلاقی قدریں ہوں گی اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔

اس طرح اسلام نے آخرت کے عقیدے کو اپنے اخلاقی ضابطہ اور نظام شرعی کے لئے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے۔ جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لئے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور بدی پر یقینی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنی بقا و استحکام کے لئے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعے سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقت ور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے۔ جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھہرایا ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ اس عقیدے کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ:

"وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ" (البقرہ - ۲۴۳) | اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے

راہ خدا میں سرفروشی کے لئے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مر نہ جاؤ گے بلکہ ہمیشہ زندگی پاؤ گے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (البقرہ-۱۵۴)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔

مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لئے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے:

"اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ" (البقرہ-۱۵۷)

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے بڑی عنایات ہونگی اور رحمت الٰہی ان پر سایہ کریگی

بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ:

"قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ" (البقرہ-۲۴۹)

جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے انہوں نے کہا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے۔

سخت سے سخت مشکلات کے مقابلہ میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ:

"نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا" (التوبہ-۸۱)

جہنم کی آگ دنیا کی گرمیوں سے زیادہ سخت ہے۔

نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کیلئے ابھارتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے:

"وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ-۲۷۲)

جو کچھ تم خیرات کروگے اس کا پورا اجر تم کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔

بخل سے روکنے کے لئے فرمایا جاتا ہے:

"وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ" (آل عمران-۱۸۰)

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دار کیا ہے اور پھر وہ اس میں بخل کرتے ہیں، وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے لئے اچھا ہے بلکہ درحقیقت یہ ان کے حق میں برا ہے۔ جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائیگا۔

سود خوری کے ظاہری فائدوں سے دست بردار ہونے کے لئے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ:

"فَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۡ" (البقرہ-۲۸۱)

اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کے پاس لوٹائے جاؤگے۔

متاع دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوش حالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

" لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۚ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝

(آل عمران - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۱۹۸)

دنیا کے ملکوں میں کفر کی روش اختیار کرنے والے کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے، یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے، لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کیلئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کیلئے اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کیلئے وہی سب سے بہتر ہے۔

عقیدۂ آخرت کی اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس عقیدہ پر ایمان و ایقان رکھنا ایک مسلمان کے لئے ناگزیر ہے۔ اور جب تک اس پر ایمان نہ لائے، کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مسلمان تو خیر بڑی چیز ہے۔ سچ یہ ہے کہ آخرت کا انکار انسان کو انسانیت سے گرا کر حیوانیت سے بھی بدتر درجے میں لے جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوالات متعلقہ باب دوم

(۱) اسلام کے بنیادی عقائد پر ایک مفصّل مقالہ سپردِ قلم کیجئے۔

(۲) توحید کی اہمیّت کتاب وسنّت کی روشنی میں ثابت کیجئے نیز بتائیے کہ توحید کے زیرِ اثر انسانی زندگی پر کیا اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔

(۳) تعلّق باللہ سے کیا مراد ہے اور اس کی بنیاد کن امور پر قائم ہے۔

(۴) رسالت کی ضرورت و اہمیّت اور انبیاء کی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

(۵) مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر جامع نوٹ لکھئے:۔

عصمت۔ بشریّت۔ وھبیّت۔ معلّم و مربّی۔

(۶) رسول اکرمؐ کے ساتھ ہمارے تعلّق کی بنیاد کیا ہے تفصیلاً لکھئے۔

(۷) مندرجہ ذیل میں سے کسی دو پر جامع نوٹ لکھئے:۔

ایمان۔ اطاعت۔ اتّباع۔ محبّت

(۸) منکرینِ آخرت اپنا موقف کن دلائل سے ثابت کرتے ہیں اور آپ اُن کا کیا جواب دے سکتے ہیں۔

(۹) ہندومت، یہودیت اور عیسائیت کے تصوّرِ آخرت پر ایک مقالہ قلمبند کیجئے۔

(۱۰) عقیدۂ آخرت انسانی زندگی پر کیا اثرات ڈالتا ہے اور کیوں؟

(۱۱) ایک مومن اور منکر آخرت کی زندگی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ دونوں کا تقابل کیجئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بابِ سوم

اسلام کا تصورِ عبادت اور اسلامی عبادات

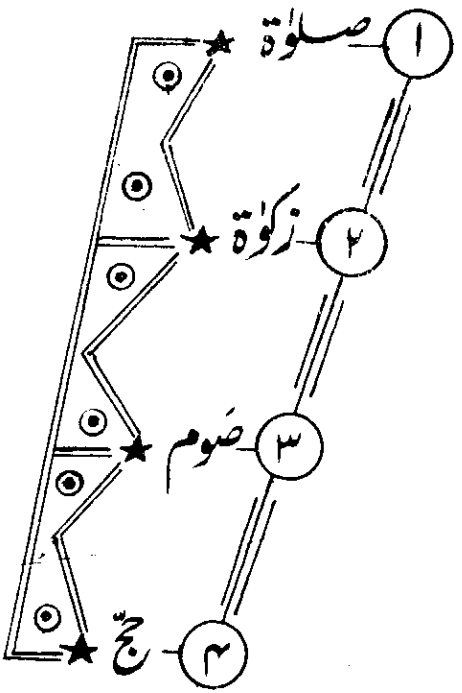

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب سوم

اسلام کا تصورِ عبادت اور اسلامی عبادات

قرآن کی رُو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے، "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (میں نے جنّوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) لہٰذا ہمارے لئے اس بات کا سمجھنا بڑا ضروری ہے کہ عبادت کیا ہے اور اس کا صحیح تصوّر کیا ہے۔

عبادت کا ایک تصوّر وُہ ہے جسے جاہلی تصوّرِ عبادت کہا جاسکتا ہے۔ اس تصوّر کی رو سے عبادت محض پوجا پاٹ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے پسیج جاتے ہیں اور ان سے یونہی کام نکالا جا سکتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی انسانوں سے خوشامد، نذر و نیاز اور عاجزی کا طالب ہے۔ اس تصوّر کی بناء پر جاہلی مذہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا دوسرا تصور، جسے جوگیانہ یا راہبانہ تصورِ عبادت کہنا موزوں ہوگا، یہ ہے کہ انسان دنیاوی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے، مراقبہ، نفس کشی اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعے اپنی اندرونی قوّتوں کو نشو و نما دے اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اُخروی نجات حاصل کرے۔ عبادت کا یہ تصوّر اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے، جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصوّر پر ہے اور جن کے نزدیک دین اور دنیا ایک دوسرے کی ضد ہیں اور جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے علائق سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔

اسلام کا تصورِ عبادت ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے۔ اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے جس نے اس زمین پر اس کو اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا۔ کچھ اختیارات عطا کئے، کچھ ذمہ داریاں دیں، کچھ خدمتیں سپرد کیں۔ اپنی مملکت اور رعیت کے حصّے پر اقتدار دیا۔ اس دنیا میں اس کا کام اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے۔ اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی تقرری کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لئے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس مطیع اور فرماں بردار بندہ تھا، نہ یہ کہ سست، کام چور، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا۔

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور، جو اوپر بیان کئے گئے ہیں، ناقص ہیں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے میں صرف کرکے یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے، اس کی مثال ایک ایسے ملازم کی ہے جسے آپ نے رات دن کے لئے رکھا ہو اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پر درش کر رہے ہوں لیکن وہ بس صبح شام آکر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جس جس کی چاہے نوکری بجا لائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت پوجا پاٹ اور ریاضت میں صرف کر دیتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لئے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ پڑھتا رہے لیکن باغ کی اصلاح و ترقی کے لئے کچھ نہ کرکے دے۔ ایسے ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام بھی، ایسے عبادت گزاروں کے متعلق قائم کرتا ہے۔

اسلام کا تصورِ عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو، آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھیں، آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں، آپ کا سونا جاگنا، اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، غرض کہ سب کچھ خدا کے قانون کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں۔ اور زندگی کے جو فرائض آپ سے متعلق کئے ہیں، ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ اٹھائیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت اور ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلے میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، اپنے کاروبار میں اہلِ معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور ریاضت کرنا عبادت نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض زبان پر اللہ اللہ جاری ہو بلکہ اصل ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں آپ پھنسیں اور پھر خدا سے غافل نہ ہوں۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لئے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد رکھیئے اور اس کے قانون کی پیروی کرتے رہیئے۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھیئے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ میں بندوں کا خدا نہیں، خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہوئیے اور ظلم کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود یہ خیال رکھیئے کہ میں خدا کی طرف سے عدل قائم کرنے پر مامور ہوں، زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہوئیے اور پھر یاد رکھیئے کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امانت دار ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصل مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنیئے اور خوفِ خدا آپ کو طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچاتا رہے، سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لیجئے اور پھر سچائی، انصاف اور حق پسندی کے اصول پر عمل کر کے دکھایئے۔ تجارت، صنعت و مالیات کی باگیں سنبھالئے اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک و ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلیئے۔ ہر طرف ظلم و دغا اور فریب و بدکاری کے راستے آپ کے لئے کھلے ہوں اور دنیاوی کامیابیاں اور مادی لذات ہر طرف سے دعوت دے رہی ہوں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف آپ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے۔ حدود اللہ میں سے ایک ایک کے قائم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قائم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے، خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنیٰ ہو جائے پھر بھی آپ کا ارادہ متزلزل نہ ہو اور آپ کی جبیں عزم پر شکن نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت!

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا گوشہ ہائے عزلت میں نہیں پا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان اور دنیوی زندگی کے ہنگاموں میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ جس انسان کے سامنے حرام کے فائدے اور ظلم کے مواقع قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا، اسے خدا کی یافت ہو گئی۔ جس نے گھر میں تفریح کے لمحوں اور کاروبار کے ہنگاموں میں، ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، اس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے اپنے قریب سے قریب تر پالیا۔ جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کئے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کا پابند رہا اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اور اس سے زیادہ خدا کا مقرب اور کون ہو گا؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشو و نما کا راستہ یہی ہے۔ روحانی ارتقاء اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں، اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں، دنیوی زندگی میں، جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے چلیں اور پورے شعور اور تمیز سے اُس طریقے پر کاربند رہیں جو انسان کے شایانِ شان ہے تو آپ کی روحانیت روز بروز ترقی کرتی چلی جائے گی اور آپ روز بروز خدا سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ وہ آپ کا ہاتھ ہو جائے گا، جس سے آپ کام کرتے ہیں، وہ آپ کی آنکھ ہو جائے گا جس سے آپ دیکھتے ہیں اور وہ آپ کے پاؤں ہو جائے گا جس سے آپ راہ چلتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اُس کی مرضیات کا پابند ہو جاتا ہے وہ رب سے راضی ہو جاتا ہے اور رب اس سے راضی۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ "لا الٰہ الا اللہ" کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے۔ اور بندہ بن کر رہنے کا نام ہی عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی ہے اور بڑی آسانی سے اسے زبان ہلا کر ادا کیا جا سکتا ہے مگر عملاً انسان کی پوری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں؛ اس کے لئے بڑی زبردست تربیت کی ضرورت ہے؛ اس کے لئے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مضبوط کردار بنایا جائے، عادات و خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر لیا جائے۔ بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لئے تیار کرنے والا ہو اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار، اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لئے اسلام میں نماز، روزہ، حج اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زکوٰۃ کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادات کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بس عبادات یہی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اصلی عبادت کے لئے انسان کو تیار کرتی ہیں، یا یہ کہ یہ اس کے لئے تربیت کا لازمی نصاب ہیں، انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اُس خاص کردار کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے اور اُس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الٰہی میں تبدیل نہیں ہو ہوسکتی۔ نیز یہ کہ ان کے ذریعے بندہ رب سے قریب تر آتا ہے، اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور وہ زمین و آسمان کے مالک کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے، ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں، جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بناء پر ان کو ارکان اسلام قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قائم کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لئے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ صلوٰۃ

۱۔ مقصدِ حیات کی یاد دہانی

انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کیلئے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ شعور ہر وقت تازہ رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ یہ ضرورت اس لئے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی حواس سے بالاتر ہے لیکن گمراہی کی طاقتیں ہر سمت پھیلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان کو بار بار اس بات کی یاد دہانی کی جاتی رہے کہ اسے اپنی زندگی ایک مخصوص انداز سے گذارنی ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ جیسے ہی آپ صبح کو اُٹھیں وہ آپ کو یہ بات یاد دلاتی ہے۔ شام اور رات کو جب تفریح یا آرام کا وقت ہوتا ہے تو نماز آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطان نفس کے بندے نہیں ہو۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بناء پر قرآن میں اسے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔

۲۔ فرض شناسی: چوں کہ انسان کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکام کو بجا لائے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی پیدا ہو بلکہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ مثال کے طور پر فوج کو دیکھئے، وہاں کن کن طریقوں سے فرائض کو سمجھنے اور ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی بار بگل بجایا جاتا ہے۔ سپاہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، ان سے قواعد کرائی جاتی ہے! آخر کس لئے؟ اس لئے کہ سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا ہو اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہوں ان کی آزمائش ہو جائے تاکہ ان کی اصلاح کی کوشش ہو یا بالآخر ان کو فوج سے نکال دیا جائے دنیا کی فوج کے لئے کام کا وقت تو کبھی برسوں میں آتا ہے، تب بھی قواعد روزانہ کرائی جاتی ہے، لیکن اسلام کی تیار کردہ فوج تو ہر وقت برسرکار ہے۔ اسے زندگی کے ہر آن شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، فرائض بجا لانے ہیں، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کے لئے زیادہ سخت تنظیم، تربیت اور آزمائش کی ضرورت ہے اور انہی مقاصد کے تحت نماز دن اور رات میں پانچ بار فرض کی گئی ہے تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت ہو اور دوسری طرف سچے اور جھوٹے مسلمانوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ:

"بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ" | بندے اور کفر کے درمیان ترک صلوٰۃ واسطہ ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یعنی ترکِ صلوٰۃ وہ پل ہے جسے پار کرکے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

۳۔ **تعمیرِ سیرت**: نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو انسانی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ مثلاً سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے لہٰذا وہاں سارا زور نظمِ مملکت کی صلاحیت پیدا کرنے پر دیا جاتا ہے، سپاہیوں کا کام جنگ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور **اطاعت** امیر اور تنظیم کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت کی تیاری ہے جس کا **مقصد** اولین نیکی کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے اور جسے سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کے قوانین کی پابندی کرنی ہے اور انہیں پوری دنیا میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ یہ عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان میں خدا کا خوف، اس کی محبت اور اس کی خوشنودی کی خواہش نہ پیدا ہو اور جب تک آدمی یہ جان نہ لے کہ خدا حاکمِ اصلی ہے اور ہر انسان کے سامنے جوابدہ ہے مسلمان اسلام کے طریقے پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ خدا ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کی ہر ہر حرکت سے باخبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ یہی یقین انسان کو خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لئے تیار کرتا ہے، اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ اسی یقین کو بار بار انسان کے ذہن میں تازہ کرے۔

نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بخود انسان کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے قرآن میں دعوےٰ کیا گیا ہے کہ:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔ (العنکبوت - ۲۵)

یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے۔

اسی بنا پر نماز قدیم ترین زمانے سے انبیاء کی تعلیمات کا جزو رہی ہے۔ جتنے انبیاء خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اوّلین رکن اسلام تھی۔ اسلامی تحریک میں جب بھی کبھی زوال آیا نماز کا نظامِ تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا کیوں کہ اسلام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے طریقے پر چلنے کے لئے اسلامی سیرت ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے اور جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہوگا۔

۴۔ **ضبطِ نفس اور تقویٰ:** تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لئے لگایا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر پوری طرح قابو یافتہ رہے، اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے صبح کا وقت ہے، نیند آرہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے، پڑے رہو، اب کہاں اٹھ کر جاؤ گے، نماز کہتی ہے کہ وقت آچکا ہے، سیدھی طرح اٹھو، وضو کرو، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے، پانی گرم نہیں ہے، نہ سہی، ٹھنڈا ہی پانی استعمال کرو اور چلو مسجد کی طرف۔ ان دو مطالبات میں سے اگر کسی نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو اس کا نفس اس سے جیت گیا ورنہ اس نے نفس پر قابو پا لیا۔ اسی طرح ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہر وقت کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے بہانے ڈھونڈتا ہے لیکن نماز ہر وقت تازیانہ بن کر آجاتی ہے اور آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے۔ اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ خواہشات نفس کا زور توڑ دیں گے، ان پر حکمراں ہو جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و ارادے کے مطابق انہیں تبدیل کر سکیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

"فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۝" (مریم - ۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی۔ لہٰذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے، یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ نماز:

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

(۲) انسان کو فرض شناس بناتی ہے۔

(۳) فرض شناس اور فرض ناشناس میں تمیز کا ذریعہ بہم پہنچاتی ہے۔

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام ترتیب دیتی ہے تاکہ اس کی سیرت پختہ ہو سکے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۵) انسان میں یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہے اس پر عمل کر سکے۔

(۶) بندے کو رب سے قریب لاتی ہے اور اس کے قلب کو پاکیزگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔

۵۔ اجتماعی فوائد: اب ہمیں نماز کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ آدمی دنیا میں کوئی کام اکیلا نہیں کر سکتا۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور ہمسایوں، معاملہ داروں اور ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب اگر ایک انسان ایسے لوگوں کے درمیان گھرا رہے جو خدا کے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے یا اس کی نافرمانی پر تُلے ہوئے ہیں تو اکیلے آدمی کے لئے اپنی زندگی میں اس قانون کو جاری کرنا دشوار ہو جائے گا، حالاں کہ مسلمانوں کے ذمے کام نہ صرف یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی میں جاری کریں بلکہ پوری دنیا پر غالب و نافذ کریں۔ اس کام کے لئے ایک آدھ مسلمان کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر ایک جتھا بنیں اور پھر اس کام کے لئے کوشش کریں۔

نماز ہماری اس ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے، اس کو قائم کرتی اور رکھتی ہے اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اس لئے پنج وقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے، حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی دوڑ جاؤ۔ جیسے فوجی سپاہی بگل سنتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ کمانڈر نے ہمیں طلب کیا ہے اور اس کی تعمیل کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح ہر مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سُنے سب کام چھوڑ کر قریب کی مسجد کا رُخ کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی مہم درپیش آئے تو سارا گروہ ایک منظم جتھے کی صورت میں جمع ہو سکے اور اس کیلئے کام کر سکے۔

یہ تو محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں، یہاں ایک دوسرے کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں کہ سب ہم مقصد اور ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پریشان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ ہے تو آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا اور جو لوگ خوشحال ہیں وہ غریبوں کی مدد کر سکیں گے۔

پھر مسجد میں تمام مسلمان مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر پہلے آیا تو وہ اگلی صف میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو پچھلی صفوں میں رہے گا! کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی مسجد میں اپنی نشست محفوظ نہیں کرا سکتا اور نہ کوئی شخص اس بات کا مجاز ہے کہ کسی شخص کو اس کی جگہ سے ہٹا دے۔ تمام مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ یہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ اونچ نہ نیچ، کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک نہیں ہوتا اور نہ کسی کے برابر کھڑے ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کے فرد کو یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب برابر ہو طبقاتی امتیاز یا نسل، قبیلہ، رنگ اور وطن کی عصبیتیں غلط ہیں۔

مسجد میں ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے شریعت میں وہ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ یہ صفات، جن کا ذکر ہم کریں گے، انتہائی معنی خیز ہیں، ان کے ذریعے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس چھوٹی سی مسجد کے باہر اس وسیع مسجد میں، جس کا نام زمین ہے، مسلمانوں کا اجتماعی نظام کیسا ہونا چاہیئے، انہیں کیسا امام یا لیڈر منتخب کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھنا چاہیئے۔

ہدایت دی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو۔ حکم دیا گیا ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تو تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن، اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کی اقتدا کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ ان ساری ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیئے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے، محض جوان، مضبوط اور فرصت والے آدمیوں کو پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قراءت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں اور کمزور اور مشغول آدمی بھی ہیں، جو اپنا کام چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس طرح گویا سردار قوم کو تعلیم دی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو افراد کے ساتھ اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیئے۔

حکم دیا گیا ہے کہ امام کی سختی سے پیروی کرنی چاہیئے۔ اس کی حرکت سے پہلے حرکت کرنا منع ہے۔ اس طرح قوم کو بتایا جا رہا ہے کہ اسے سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیئے۔ البتہ اگر امام غلطی کرے تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ اسے "سبحان اللہ" کہہ کر ٹوک دیں "سبحان اللہ" کے معنی ہیں کہ "اللہ پاک ہے" مطلب یہ کہ تم سے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، غلطیوں سے مبرا ذات تو صرف خدا کی ہے۔ امام کا فرض ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو مقتدیوں کا فرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے کہ اس کی پیروی کرتے رہیں۔ یہ تو چھوٹی موٹی غلطیوں کی بات ہے لیکن اگر غلطی سنگین ہو اور کفر و شرک تک پہنچتی ہو تو جماعت کا فرض ہے کہ فوراً علیحدہ ہو جائے اور اس امام کو ہٹا کر دوسرا امام مقرر کرے۔ قومی زندگی میں بھی یہی حیثیت ہے۔ جب تک سردار قوم حدود اللہ میں کام کر رہا ہو اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر حدود کو توڑ دے تو ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ ایسے رہنماؤں اور اکابر کو ان کے عہدوں سے اتار دے اور ان کی جگہ خدا ترس لوگ منتخب کرے۔

نماز کے انہی فوائد کی بناء پر اس کو دین میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اسے 'عماد الدین' یعنی دین کا ستون کہا گیا ہے۔ جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کی عمارت ڈھا دی اور جس نے اس کی حفاظت کی اس نے دین کی عمارت محفوظ رکھی۔

مزید برآں نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگائیے کہ نماز کو قرآن پاک میں "ایمان" تک کہا گیا ہے اور فقہاء و ائمہ نے فرمایا ہے کہ ترک نماز اور ایمان ساتھ ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ نماز روحانی ترقی اور قرب الٰہی کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ نماز اس طرح پڑھی جائے جیسے آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نماز ایمان بھی ہے اور ایمان کی پہچان بھی ہے، دل کا نور اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے اور انفرادی اور اجتماعی سیرت کی صورت گر بھی۔ نماز دین کا وہ ستون ہے جس کے قیام سے دین قائم ہے اور جس کے منہدم ہو جانے سے دین کی عمارت بھی منہدم ہو جاتی ہے۔

۶۔ نماز کے معاشرتی و اخلاقی حکم و مصالح

۱۔ ستر پوشی:۔ نماز کے معاشرتی فوائد میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے۔ شرم و حیا کے پیش نظر اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے۔ بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پرواہ تھے۔ یہاں تک کہ جب دیہاتی عورتیں حج کے لئے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کے بغیر اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"خُذُوا زِينَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ" — ہر مسجد میں زینت لگا کر جاؤ

(الاعراف — ۳۱)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مردوں کے لئے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لئے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا۔ اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر پوشی پر مجبور کیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لئے ان کو ستر پوش بنا دیا۔

۲۔ طہارت و پاکیزگی: نماز کا دوسرا معاشرتی فائدہ طہارت اور پاکیزگی ہے پہلی وحی کے بعد جب جبریل علیہ السلام دوسری مرتبہ نازل ہوئے تو یہ حکم لائے :۔

" وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (المدثر۔۴) | اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔

چنانچہ اسلام نے طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کئے۔ نماز کی درستی کے لئے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن اس کے کپڑے اور نماز کی جگہ نجاست اور آلودگی سے پاک ہو۔ اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت و نظافت کی بالکل تمیز نہ تھی۔ یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد میں آکر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا صحابہ اس کو مارنے دوڑے۔ آپ نے ان کو روکا اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اس قسم کی نجاستوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اور صحابہ سے فرمایا کہ اس نجاست پر پانی بہا دو۔ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لئے تھی اہل عرب اور مسلمان کو پاک و صاف رہنے کا خوگر بنایا۔

۳۔ پابندئ وقت: انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں۔ انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب واقع ہوا ہے۔ اس کو پابند اوقات بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیئے جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے۔ نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں اس لئے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں خصوصاً نماز باجماعت کے ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں۔ ان کے شب و روز کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار بن جاتے ہیں۔ وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔

مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے۔

" اَلصَّلٰوةُ مِكْيَالٌ فَمَنْ اَوْفٰى اُوْفِيَ بِهٖ وَمَنْ طَفَّفَ فَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا لِلْمُطَفِّفِيْنَ۔
(کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۲۳)

نماز ایک پیمانہ ہے جس نے اُسے پورا ناپا اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ **سحر خیزی**: طب اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے۔ جب رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کو نماز عشاء کے بعد بیکار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے صبح کو مؤذن کی پُر تاثیر آواز:

"اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ" | نماز سونے سے بہتر ہے۔

ان کو بے تابانہ نیند کے بستر سے اٹھا دے۔

۵۔ **خوفِ خداوندی**: ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے۔ جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے' اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے۔ اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے۔ وہ لوگوں سے اس لئے شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرض نماز انسان کے اخلاقی احساس کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے۔ خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

"اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ" (عنکبوت - ۴۵) | بے شک نماز بے حیائی اور بُری باتوں سے روکتی ہے۔

۶۔ **تربیت جہاد**:۔ باطل کو شکست دینا اور حمایت حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لئے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیئے' اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں۔ حدیث میں آیا ہے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تو تسبیح کہتا تھا۔ اسی طریقہ پر نماز قائم کی گئی ہے۔" (ابو داؤد)

صف بندی ایک افسر (امام) کی اطاعت تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہمی محبت اور ایک تکبیر کی آواز پر سب کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صف جنگ کے اوصاف سکھاتی اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے۔

۷۔ **اُلفت و محبت**: نماز مسلمانوں میں باہمی الفت و محبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ محلہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دُور ہو گی۔ ان میں آپس میں محبت اور اُلفت پیدا ہو گی۔ اسی طرح وہ ایک دوسرے کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

امداد کے لئے ہر وقت تیار رہیں گے۔ قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:

وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (الانعام-۱۵۹)	خدا سے ڈرتے رہو۔ نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔ ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے گروہوں میں بٹ گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے روکتا ہے کہ جب دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

۸۔ **نظم جماعت:** کسی قوم کی زندگی نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز با جماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا صف بصف کھڑا ہونا۔ شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ جس طرح نماز کی درستگی، صف کے سیدھا ہونے پر موقوف ہے۔ اسی طرح پوری قوم کی زندگی باہمی تعاون، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے۔

۹۔ **مساوات:** نماز باجماعت مسلمانوں کے لئے برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی درسگاہ ہے۔ یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے سب ایک ساتھ، ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں۔ جماعت کی امامت کے لئے حسب نسب، نسل و خاندان، رنگ و روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ علم و دانش، فضل و کمال اور تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں۔ سب ہی ایک زمین پر ایک امام کے پیچھے ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اس کی جگہ سے ہٹا نہیں ہو سکتا۔ اس انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے۔

www.KitaboSunnat.com

۱۰۔ **مجلس عمومی:** آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی و قومی مشکل پیدا ہوتی یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ "اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ" (نماز جمع کرنے والی ہے) سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس ضروری امر سے اطلاع پاتے یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے۔ یہ گویا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اوّلیں شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے۔ اس کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اس کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم جماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے۔ مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی مسلمان جب زندہ تھے تو ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا۔ ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی مسجد ہی ان کا دارالامارۃ تھا، وہی دارالشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا۔ وہی درس گاہ اور وہی مہبط تھا۔

نماز کے ان ہی ثمرات و برکات کی بناء پر ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمثیل میں صحابہؓ سے فرمایا کہ "اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتی ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ نہیں یا رسول اللہ! ارشاد ہوا کہ نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو" (کنز العمال جلد ۴ صفحہ ۶۷ نیز حکم ابن خزیمہؒ طبرانی)

دین اسلام میں نماز کے بارے میں جو تاکیدی احکام آئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ روز قیامت سب سے پہلے نماز کی باز پرس ہوگی۔

روز محشر کہ جاں گداز بود
اوّلیں پرسش نماز بود

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ زکوٰۃ

۱۔ زکوٰۃ کا لغوی و اصطلاحی مفہوم | زکوٰۃ عربی زبان میں مصدر ہے۔ یہ دو معنی کے لئے مستعمل ہے۔ (۱) پاک صاف کرنا (۲) پھلنا پھولنا اور بڑھانا۔

شرعی اصطلاح میں زکوٰۃ اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر مسلمان پر فرض ہے جو مال کی ایک خاص مقدار کا مالک ہو۔ اس کو زکوٰۃ کا نام اس لئے دیا گیا ہے کہ مال میں سے زکوٰۃ کا مقررہ حصہ نکالنے کے بعد باقی ماندہ مال پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ گویا زکوٰۃ ایک میل تھا۔ جس کے نکالنے کے بعد مال پاک ہو گیا یا اس لئے زکوٰۃ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ نکالنے سے مال میں برکت پیدا ہو جاتی ہے اور بظاہر وہ کم ہو جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں برکت بڑھ جاتی ہے۔ جس طرح سُود کے بارے میں ارشاد ہوا۔

"یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ۔ (سورۃ البقرہ۔۲۷۶) | اللہ تعالیٰ سُود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھا دیتا ہے۔

حالانکہ بظاہر سُود سے مال میں اضافہ ہوتا ہے اور صدقہ سے مال کم ہوتا ہے مگر قرآنِ کریم کا بیان ہماری ظاہر بینی کے برعکس ہے۔ زکوٰۃ کو صدقہ بھی کہتے ہیں۔ صدقہ کا اطلاق ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر کیا جاتا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی اہمیت: زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام مذاہب کی کتابوں میں فرض قرار دی گئی ہے لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام تک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا لازمی جزو تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب میں شامل رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں۔

"اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ" (البقرہ۔۸۳) | (ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔

دین اسلام کی تعلیمات میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے وہ زکوٰۃ ہے نماز حقوق اللہ میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق العباد میں شامل ہے۔ دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم ہونا اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ایمان کے بعد جہاں اعمال صالحہ کا ذکر آتا ہے بالعموم صرف دو اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک نماز کا دوسرا زکوٰۃ کا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کریم میں فرمایا:

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ"۔ (البقرہ - ۲۷۷)

بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ بجلیؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر تین باتوں پر بیعت کی تھی۔

(۱) نماز پڑھنا (۲) زکوٰۃ دینا (۳) ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔

وفد عبدالقیس نے ۵ھ میں آستانہ نبوت پر حاضر ہو کر جب اسلامی تعلیمات دریافت کیں تو آپ نے اعمال میں پہلے نماز اور پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔

(صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ جلد اوّل صفحہ ۱۸۸)

۹ھ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ "پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا۔ جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے۔ جب وہ نماز پڑھنے لگیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائیگی۔

(صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۱۰۹۶)

صحابہؓ میں جو لوگ شریعت کے رازداں تھے وہ زکوٰۃ کی اہمیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا "جو توحید کا قائل ہو اس کا خون بہانا روا نہیں۔ اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے" حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: "خدا کی قسم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا وہ اس کو دینا پڑے گا۔" (صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۱۸۰)

حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو شریعت کا محرم اسرار ہی سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے آگے گردن تسلیم خم کر دی۔

۳۔ زکوٰۃ کی تدریجی فرضیت: جس طرح نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آکر رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق خیرات کی ترغیب بھی آغاز اسلام ہی سے شروع ہوئی لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ آغاز اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خیرات کا ہم معنیٰ تھا اس کی مقدار نصاب مال اور دوسری خصوصیات جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں بعد کو رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچیں۔ بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفرؓ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ پہنچے اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کیں تو حضرت جعفرؓ نے اس کے جواب میں یہ تقریر کی۔

"وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں۔ روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں" (مسند احمد جلد اول ص۲۰۲)

اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتداء ہی میں ہو چکا تھا۔ وفد عبدالقیس ۹ھ کو بارگاہِ رسالت میں پہنچا تھا۔ آپ نے ان کو جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ ۹ھ میں نجاشی نے نامۂ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا تذکرہ بھی کیا۔ (صحیح بخاری جلد اول)

ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ ۸ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ صدقہ وخیرات کی تعلیم بھی موجود تھی۔ مدینہ منورہ آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۂ فطر واجب ہوا اور اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی۔ صحابہؓ نے دریافت کیا، یارسول اللہ ہم کیا خیرات کریں؟

"یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ" (سورہ بقرہ ۲۱۵) | وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔

فرضیت زکوٰۃ کی راہ میں اسلام کا یہ پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار ونصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں۔ آئندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں کیونکہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی۔ کچھ دنوں بعد جب فتوحات کا آغاز ہوا، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم نازل ہوا:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ۔ (سورۂ بقرہ ۲۶۷) | اے ایمان والو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں ان میں سے کچھ خیرات میں دیں۔

اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا۔ رمضان ۸ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک شیرازہ میں پرو دیا۔ اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَکِّیْهِمْ بِهَا" (التوبہ ۱۰۳) | ان کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کرو کہ اس کے ذریعے سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چنانچہ اس سے اگلے سال یعنی محرم ۹ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام و قوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی یہ تمام احکام سورۂ توبہ میں مذکور ہیں جو ۹ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

۴۔ نماز اور زکوٰۃ کا ربط و تعلق

احکام دین کی اصولی تقسیم کیجئے تو ان کی دو ہی قسمیں ہو سکیں گی۔ ایک قسم کے احکام وہ ہیں جن کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے۔ دوسری قسم کے احکام حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح دین کی پوری در اصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور بندوں کے حقوق دونوں سے عہدہ برآ ہو جائے۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں کی حقیقت سے صاف عیاں ہے کہ نماز اللہ کا حق ہے۔ بخلاف ازیں زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز اور جوہر ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق ادا کر دیا تو ممکن نہیں کہ وہ مسجد سے باہر آ کر اللہ کے حقوق بھول جائے اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چشمہ سے پانی اُبلتا رہتا ہے۔ اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگانِ خدا کے حقوق پامال کرتا رہے گا۔ جو شخص اپنے بھائیوں، پڑوسیوں پر اپنی کمائی خود اپنی خوشی سے صرف کریگا اور صرف کر کے ان کو اپنا احسان مند بنانے کے بجائے اُلٹا انہی کا شکر گزار ہو گا وہ تو ان کا ایک ایک حق ادا کر کے ہی چین پا سکے گا۔

۵۔ نصاب زکوٰۃ

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ تورات نے ہر قسم کی پیداوار پر عُشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف شرح کے مطابق زکوٰۃ فرض کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اوصاف پر زکوٰۃ مقرر ہو جو کچھ عرصہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسب ضرورت خانگی اور تجارتی فائدہ اُٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی بناء پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو دو ایک روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں۔ کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں کی گئی۔ مثلاً مکان کا ساز و سامان، لباس، اسباب سواری بلکہ بعض فقہاء کے نزدیک سونے چاندی کے مستعمل زیور پر زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔

کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشو و نما پانے والی چار چیزیں ہیں:۔

زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال۔

چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔ زمین کی دو قسمیں کی گئیں۔

۱۔ زمین کی ایک قسم وہ ہے جس کے سیراب کرنے میں کاشت کار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے خود بخود سیراب ہوتی ہے اُس میں سے عُشر یعنی ۱/۱۰ بطور زکوٰۃ مقرر کیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲- زمین کی دوسری قسم وہ ہے جس کی سیرابی کاشت کار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا تو اس میں پہلی قسم سے نصف یعنی بیسواں حصہ مقرر ہوا۔ نقدی جس کی ترقی، حفاظت اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گمشدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے زمین کی دوسری قسم سے بھی آدھا یعنی چالیسواں حصہ (۲½) مقرر ہوا۔ نقدی اور سونا چاندی پر زکوٰۃ اس وقت فرض ہوتی جب سال بھر تک کسی کے پاس پڑا رہے۔ سونے کی مقدار جب ساڑھے سات تولہ اور چاندی دو سو درہم ہو تو اس پر ایک سال کے بعد زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جانوروں کی مختلف اقسام میں زکوٰۃ کی شرح کیا ہے اور اس قسم کے دیگر جزوی احکام تو ان کی تفصیلات معلوم کرنے کیلئے کتب حدیث و فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے بہر دست یہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔

۶- مصارفِ زکوٰۃ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا:

"اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَ الْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ۔"

(التوبہ - ۶۰)

زکوٰۃ کا مال تو غریبوں، مسکینوں اور زکوٰۃ کے شعبہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کیلئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف لانا ہے اور غلام آزاد کرانے میں اور جو تاوان بھریں ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافروں کیلئے یہ خدا کی طرف سے قومی و مذہبی لحاظ سے رقم کو خرچ کرنے کی تاکید ہے۔

اسلام کا اقتصادی نظام اور زکوٰۃ

مقاصدِ زکوٰۃ ۱- تزکیہ نفس: زکوٰۃ کا حقیقی و بنیادی مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے پاک ہو جائے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔"

(سورۃ اللیل - ۱۷)

اور اس (جہنم) سے اس شخص کو دور رکھا جائے گا جو اللہ سے بہت ڈرنے والا ہے جو پاک ہونے کے لئے اپنا مال دوسروں کو دیتا ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا:

"خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً

ان کے مالوں میں سے صدقہ لو جس کے ذریعے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا" (التوبۃ:۱۰۳) انہیں پاک کرو گے اور ان کا تزکیہ کرو گے۔

مذکورہ صدر آیتوں سے معلوم ہوا کہ صدقہ وزکوٰۃ کی اصلی غرض دل کی پاکی اور نفس کا تزکیہ ہے ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو خدا پرستی کی اصل دشمن ہے اور جو انسان کو خدا اور آخرت سے بیگانہ بنا کر رکھ دیتی ہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بھی ہے کہ

"حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ | دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

اس محبت کا تعلق اگرچہ دنیا کی بہت سی چیزوں سے ہوتا ہے مگر ان سب سے زیادہ طاقتور اور خطرناک محبت مال کی ہوتی ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مال ہی امت کے حق میں سب سے بڑا فتنہ قرار دیا ہے۔

"فِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ" (ترمذی) | میری اُمت کا سب سے بڑا فتنہ مال ہے۔

۲- امداد باہمی:- زکوٰۃ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ" (صحیح مسلم کتاب الایمان جلد ۱) | اللہ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے کہ ان کے امراء سے لی جائے اور غرباء میں تقسیم کی جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کا ایک خالص اجتماعی اور معاشی پہلو بھی ہے اور اس کے بغیر زکوٰۃ کا اسلامی پہلو مکمل نہیں ہوتا۔ ایک شخص نے پورے خلوص کے ساتھ اپنی دولت کا ایک حصہ نکالا تو بلاشبہ اس نے اپنے دل کی پاکی اور اپنے نفس کے تزکیہ کا اہتمام کر لیا مگر اس کا یہ فعل شریعت کے نزدیک ادائے زکوٰۃ کا موجب نہیں بنا۔ یہ ادائے زکوٰۃ اس وقت بنے گا۔ جب وہ اپنی اس نکالی ہوئی دولت کو حصہ داروں کے حوالے کر دے گا یعنی دل کی پاکی کا زکوٰۃ کی بنیادی غرض وغایت ہونا مسلم ہے لیکن اس مال کا غریبوں کی حاجت روائی کا ذریعہ بننا بھی اپنی جگہ بالکل ضروری ہے اور اس کے بغیر زکوٰۃ کا شرعی فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زکوٰۃ کو کھاتے پیتے افراد کی دولت میں غریبوں کا حصہ ٹھہرایا ہے۔ دین میں اس بات کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا پورا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے:

"وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔"

۳- نصرتِ دین:- زکوٰۃ کا ایک مقصد دین کی حفاظت ونصرت بھی ہے قرآن کریم میں جہاں زکوٰۃ کے مصارف بیان کئے گئے ہیں وہاں ایک مصرف "فی سبیل اللہ" بھی قرار دیا گیا ہے یعنی اللہ کے دین کی خاطر کی جانے والی جدّوجہد میں خصوصاً جنگی ضرورتوں میں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فی سبیل اللہ کی مالی ضرورتوں کا فراہم ہونا بھی زکوٰۃ کے مقاصد

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں شامل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ

"وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ" (التوبہ۔۴۱) | تم اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔

اہل ایمان کی جب بنیادی صفات بیان کی جاتی ہیں تو ان میں "اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے جہاد کرنے" کی صفت بھی لازماً موجود ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں کے ذریعے جہاد کرنے کا مفہوم بالکل واضح ہے اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے کے لئے جن مصارف کی بھی ضرورت پڑے انہیں اپنے اس سے مہیا کرو۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دین کی نصرت و حفاظت کوئی چھوٹے درجے کا کام نہیں۔ اس لئے اس کی خاطر اپنی دولت کا خرچ کرنا بھی کوئی معمولی جہاد نہیں ہو سکتا۔

قرآن حکیم نے جہاد کا حکم دیتے وقت ایک جگہ فرمایا ہے:۔

"وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" (البقرہ۔ ۱۹۵) | اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ہاتھ روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی نصرت و حفاظت کے لئے مصارف کا فراہم نہ کرنا، ہلاکت مول لینا ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ جو کام دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی ہلاکت سے محفوظ رہنے کی شرط ہو اسے بھلا کون معمولی کام ٹھہرا سکتا ہے۔

۴۔ اشتراکیت کا علاج: دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقیناً پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض نہایت دولتمند ہو جاتے ہیں۔ جن کے خزانوں کیلئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں۔ جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک باشت زمین بھی نہیں ہوتی۔ دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا دینے کے روادار نہیں ہوتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دولت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی و جہد اور دوست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان ناکارہ افراد کا ان میں کوئی حصہ نہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قارون کو جب زکوٰۃ کا حکم سنایا تو اس نے جواب دیا:

"إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي" (قصص۔ ۷۸) | مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب کچھ ملا ہے۔

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی۔ ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب وہوا اقتصادی مشکلات کے ابر و باد کا طوفان پیدا کر رہی ہے مزدور و سرمایہ کی جنگ پورے زور سے ہو رہی ہے سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں۔

۵۔ اقتصادی فوائد: زکوٰۃ اخلاقی و روحانی فوائد کے علاوہ بیش بہا اقتصادی فوائد کی بھی موجب ہے۔ ہم قبل ازیں بیان کر چکے ہیں کہ زکوٰۃ ان ہی چیزوں میں فرض ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں۔ (۱) بقاء (۲) نمو

بقاء سے مقصود یہ ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں کیونکہ جو چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے اور نہ وہ دوسروں کے استعمال کیلئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے۔ اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ نمو کا مقصد یہ ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بناء پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں۔ ورنہ اصل سرمایہ میں سال بہ سال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔

اس طرح زکوٰۃ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں، ترقی دی جائے۔ کیونکہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنی پڑے گی تو وہ کوشش کریگا کہ جہاں تک ممکن ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے۔ اسی بناء پر اسلام نے زکوٰۃ کو ان چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا جن میں نمو اور اضافہ کی صلاحیت ہو اور اسی بناء پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی۔ تاکہ ہر شخص اپنے مال یا جائداد سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے صحابہ کرامؓ اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایہ کے متولی تھے ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں تاکہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمند صحابہؓ میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین و ملت کی خدمت کیلئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے۔ دوسری جانب غریب صحابہؓ میں وہ قناعت اور خود داری پیدا ہو گئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولتمند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک آتے تھے اور غریب اپنے افلاس کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں بیت المال میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انشاء سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ ایک ایسا مالی و اقتصادی نظام تھا جس میں سود کا عمل دخل بالکل نہ تھا اور اس لعنت کے بغیر ہی لین دین کے سب کام انجام پاتے تھے۔

۶۔ زکوٰۃ معاشی نقطۂ نظر سے

اسلام دین اور دنیا کے امتزاج کا داعی ہے اس لئے اس کی عبادات بھی اخلاقی فوز و فلاح کے ساتھ دنیوی زندگی کی اصلاح اور اس کی صحیح خطوط پر تعمیر کی بھی ضامن ہیں۔ زکوٰۃ جہاں حب مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہیں معاشی نقطۂ نظر سے معاشی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک و ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدّ و جہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اسی کے لئے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اسے فنا ہو جانا چاہیئے کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں۔ نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے پر تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا نہ دے، اور گرتوں کو تھام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعہ معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے۔

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلے ہی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں امداد باہمی کا ایک ایسا نظام قائم کیا جس کے ذریعے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی۔ اسلامی حکومت نے ابتدا سے ہی اس نظام کو عملاً قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ہر ضرورت مند کو سرکاری وظیفے دیئے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مؤرخ طبری زکوٰۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔

پھر زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے اور اس طرح تقسیم دولت صحت مند

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادوں پر واقع ہوتی ہے۔

۰۔ شت کا ایک اور بنیادی مسئلہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو روکنا اور سرمایہ کاری کو بڑھانا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں جہاں معاشی پس ماندگی ہے اس کا بڑا سبب دولت کی غلط تقسیم اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہی ہے۔ زکوٰۃ کا ایک معاشی وظیفہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے دولت آپ سے آپ سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوتی ہے اس لئے کہ اگر اسے ذخیرہ کیا جائے تو ۴۰ سال میں وہ آپ سے آپ ختم ہو جائے گی۔ اس لئے اس کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دولت کو روک رکھنے کی بجائے کاروبار میں لگایا جاتا رہے اور اس سے معاشی ترقی رونما ہوتی ہے۔

پھر معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر سرمایہ کاری اور قوت صرف میں عدم توازن کی بناء پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز تر کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے۔ اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا ایک خود کار آلہ بن جاتی ہے۔

زکوٰۃ ایک انقلابی معاشی تصور ہے اور یہ حقیقت بڑی افسوسناک ہے کہ خود مسلمانوں نے ابھی تک اس کے ہمہ جہتی معاشی پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اگر اس کے معاشی فوائد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ پورے نظام معاشی کی قلب ماہیت کر دیتی ہے۔ اسے صحت مند اور انسانی بنیادوں پر قائم کرتی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں جد و جہد کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اور زندگی کی نعمتیں تمام انسانوں کے لئے عام ہوں۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ صوم

روزے کا مقصد نماز کی طرح روزہ بھی زمانۂ قدیم سے انبیاء کی شریعتوں کا لازمی جزو رہا ہے۔ نماز روزمرّہ کا عمومی نظام تربیت ہے۔ اور روزہ سال بھر میں ایک ماہ کا غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۰۔۷ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی تربیت سے جو خرابیاں رہ گئی ہوں وہ دُور ہو جائیں۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ شام آتے ہی حرمت کا بند اچانک ٹوٹ جاتا ہے، جو چیزیں ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں اب حلال ہو جاتی ہیں تا آنکہ دوسرے روز کی مقررّہ ساعت آجاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے گویا پورے تیس دن انسان ایک شدید ترین ڈسپلن کے تحت رہتا ہے۔

۱۔ احساس بندگی: اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات پہلی نظر میں واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقے سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ احکام الٰہی کے روبرو انسان اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعد الطبیعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کارفرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو خود مختار محسوس کرے اور اس کے مقابلے میں اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور محکوم محسوس کرے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نماز کا مقصد اس شعور بندگی کی یاد دہانی ہے، اسی طرح رمضان کے روزے سال میں ایک مرتبہ پورے ۲۰۔۷ گھنٹے بہیم اس شعور کو ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر اس کے اثرات قائم رہیں۔

۲۔ اطاعت امر: احساس بندگی کے ساتھ ساتھ جو چیز لازمی پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو جس خدا کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کی اطاعت کرے۔ ان دونوں میں فطری طور پر ایسا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ آپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ اور احساس بندگی جس طرح شدید ہوگا اطاعت امر بھی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتنی ہی شدت سے ہوگی۔ چنانچہ روزے کا مقصد احساس بندگی کی یاد دہانی کے ساتھ ہی ساتھ اطاعت امر کی تربیت دینا بھی ہے۔ روزہ انسان کو مہینہ مہینہ بھر کئی کئی گھنٹے اس حالت میں رکھتا ہے کہ اس کو اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی خداوند عالم سے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہش ہو یا دوسروں کی، انسان بلا اذن خداوندی روزہ نہیں چھوڑ سکتا! اس طرح اس کی اطاعتیں ہر طرف سے سمٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی طرف پھر جاتی ہیں۔

روزے میں اگرچہ بہ ظاہر صرف دو خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس پوری طرح طاری رہے۔ اس کے بغیر اگر انسان محض بھوکا پیاسا رہے تو یہ روزہ لاش کی طرح بے روح ہوگا۔ نبیؐ نے فرمایا ہے کہ "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔ اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا"۔

ان دونوں احادیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا مقصد بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ تقویٰ اور طہارت ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت: روزے کا تیسرا مقصد انسان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ اس سیرت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ سے مراد کوئی خاص شکل و صورت اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن اس کو بڑے وسیع مضمون میں استعمال کرتا ہے۔ وہ پوری انسانی زندگی کے ایسے رویے کو تقویٰ کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد احساس بندگی اور ذمہ داری پر ہو (اس کے مخالف رویے کا نام قرآن کی رو سے فجور ہے)۔ دنیا کے فساد کا سبب فجور ہے۔ اور دیگر عبادات کی طرح روزے کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان میں فجور کے رجحانات ختم کئے جائیں اور تقویٰ کو نشوونما دیا جائے۔ اب دیکھئے کہ روزہ کس طریقے سے اس کام کے سرانجام دینے میں مدد دیتا ہے۔

ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تم پر پابندی لگائی ہے کہ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ۔ نہ صرف جلوت میں بلکہ خلوت میں بھی اکل و شرب سے پرہیز کرو۔ اب ایسی صورت میں اگر کوئی شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے تو غور کیجئے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں۔

اول، تو یہ کہ اسے خدا کے عالم الغیب ہونے کا پورا یقین ہے اور یہی یقین ہے جو اسے تنہائی میں بھی روزے کے حدود کا پابند رکھتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دوم ۔ اس کو آخرت اور حساب و کتاب پر پورا ایمان ہے اس لئے کہ اس کے بغیر کوئی ۱۲، ۱۴ گھنٹے بھوکا نہیں رہ سکتا ہے۔

سوم ۔ اس کے اندر اپنے فرض کا احساس ہے۔ بغیر اس کے کوئی شخص اس پر کھانے پینے کی پابندی لگائے اس نے خود سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی۔

چہارم ۔ مادیت اور روحانیت کے انتخاب میں اس نے روحانیت کو منتخب کرلیا اور دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان برداشت کرلیا۔

پنجم : وہ اپنے آپ کو اس معاملے میں آزاد نہیں سمجھتا کہ سہولت دیکھ کر مناسب موسم میں روزے رکھ لے بلکہ جو بھی وقت مقرر کیا گیا ہے، اس نے اس کی پابندی کی ہے۔

ششم : اس میں صبر و استقامت، تحمل، یکسوئی اور دنیوی تحریصات کے مقابلے کی طاقت کم از کم اتنی ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کردیا گیا ہے۔

یہ کیفیات، جو روزہ رکھنے کے ساتھ انسان کی زندگی میں ابھرتی ہیں، روزوں میں عملاً ایک طاقت بن جاتی ہیں اور ہر سال ایک ماہ روزہ رکھتے رکھتے یہ انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں۔

۴۔ ضبطِ نفس : اس تربیت کے ضابطے میں کسنے کے لئے دو خواہشوں کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ یعنی بھوک اور جنسی خواہش ــــ اور ان کے ساتھ تیسری خواہش، آرام کرنے کی خواہش، بھی اس کی زد میں آجاتی ہے اس لئے کہ تراویح پڑھنے اور سحری کے لئے اٹھنے سے اس پر بھی کافی ضرب پڑتی ہے۔

بقائے نفس کے لئے غذا اور آرام اور بقائے نسل کے لئے توالد و تناسل حیوانی زندگی کے مطالبات میں اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ انسان کے حیوانی جسم کے اہم ترین مطالبات یہی ہیں اور چوں کہ وہ ذرا اونچے قسم کا حیوان ہے لہٰذا وہ صرف غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اونچی قسم کی اور نت نئی غذائیں تلاش کرتا ہے۔ یہی حال دیگر خواہشات کا ہے کہ ان میں بھی انسان کا مطالبہ محض جسمانی تسکین نہیں رہ جاتا، ہزاروں نزاکتیں اور باریکیاں نکل آتی ہیں۔ اب اگر انسان کا مطمح نظر یہ بن جائے کہ کسی طرح ان خواہشات کی تسکین کرتا رہے تو یہ خواہشات نفس انسانی پر سوار ہو جاتی ہیں۔ اس کے برخلاف اگر انسان ارادے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رہے تو ان خواہشات کو اپنے پیچھے اور مرضی کے مطابق چلا سکتا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر اقتدار بخشنا ہے۔ مذکورہ بالا تین خواہشات، جو انسان کی تمام حیوانی خواہشات میں سب سے زیادہ اہم ہیں، روزہ ان تینوں کو گرفت میں لے لیتا ہے اور ان کے منہ میں مضبوط لگام دے کر راسیں ہمارے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ تیس دن کی مسلسل مشق کا مقصد یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہمارا نفس ہم پر غلبہ حاصل کرے ہم اپنے خادم پر پورا اقتدار حاصل کر لیں، جس خواہش کو چاہیں روک دیں اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لے سکیں اس لئے کہ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت نہ رہی ہو اور جو نفس کے ہر مطالبے پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو اور جس کے لئے حیوانی جبلت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔

یہاں روزے اور غیر اسلامی نفس کشی کی مشقوں کا اصولی فرق ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ اس لئے کہ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو در ایسی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع اور کسی ضابطہ و قانون کی پابند نہیں ہے۔ اس اقتدار کے لئے انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ہے اور جسم اور نفس سے ان کے جائز حقوق چھینتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی روزہ جس خودی کو نفس اور جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ ایسی خودی جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایت، علم اور کتاب مُنیر کی رہنمائی میں چلنے والی ہے۔ وُہ خدا کے دیئے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ اسے خدا کی امانت مان کر اس پر خدا کی منشا کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ ایسی خودی کا حامل اپنے جسم پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام جائز راحتیں بہم پہنچاتا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ حدود اللہ کو توڑ ڈالے۔

انفرادی اثرات

یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ افراد کی تربیت سے متعلق تھا۔ ہم نے دیکھا کہ

اوّل : اس تربیت کے ذریعے جماعت کے ہر فرد کو خداوندِ عالم کی حاکمیت کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لئے تیار کیا جائے۔

دوم : ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی مرداری کے احساس کی بنا پر (نہ کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے) قانون الٰہی کی اطاعت کرنے لگے۔

سوم : ہر فرد میں روح پھونک دی جائے کہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چہارم: ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طرح کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر مکمل اقتدار حاصل ہو جائے اور اس میں صبر و تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ، ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کردار میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور میلانات نفس کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ روزے ہر عاقل و بالغ فرد پر فرض کئے گئے ہیں۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ تمام افراد میں مندرجہ بالا خصوصیات بدرجۂ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں۔ اس لئے خارجی عوامل کے علاوہ ذاتی استعداد اور خواہش بھی ضروری ہے، لیکن خارجی طور پر اس سے بہتر نظام تربیت، دنیا میں ممکن نہیں ہے۔

اجتماعی فوائد

اگرچہ روزہ انفرادی فعل ہے لیکن نماز کے باجماعت ہونے کی وجہ سے جس طرح نماز اجتماعی فعل بن جاتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے کے لئے ایک خاص مہینے کے تقرر نے اس فعل کو ایک اجتماعی عمل بنا دیا ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کئے جاتے ہیں۔

۱۔ تقویٰ اور پاکیزگی کی فضا

اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں وہ ذہنی کیفیت نہ ہو تو وہ اس ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اور ماحول نہ صرف یہ کہ اس کے بڑھانے میں کوئی مدد نہ دے گا بلکہ اس کی کیفیات کو گھٹا دے گا لیکن اگر پورے ماحول پر وہی فضا طاری ہو اور تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذائے کربے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالک جنگ کا برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے؟ لیکن جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہادت و حماست کا ایک طوفان اُمنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔

روزے کے لئے رمضان کا مہینہ مقرر کر کے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی اور نیکیاں پھلتی پھولتی ہیں۔ اسی لئے احادیث میں آیا ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بند کر دیئے جاتے ہیں۔

۲۔ جماعتی احساس اجتماعی عمل کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل یا زبان کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتی۔ آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہے۔ یہی وہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی ذہنیت اور عمل میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی عمل کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں۔ تو ان میں باہمی یگانگت، رفاقت، یکجہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں نیکی ہو یا بدی دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہے مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستے میں افراد کی نفسیات کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس بنا پر برادری مستحکم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف نیکی کے راستے میں نفسیات دبتی ہے اور نیک خیالات و افعال کا اشتراک بہترین رشتۂ اخوت پیدا کر دیتا ہے۔

۳۔ امداد باہمی کی رُوح اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی اُخوت کے طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے، اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لئے امیر پر بھی وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے اور خدا کی رضا کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد و نفرت کے بجائے محبت اور شکر گزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ طبقاتی کشمکش کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے اور جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے رہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں۔ انہیں روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴- حجّ

حج کی اہمیت اور اس کا مقصد

حج بھی اسلام کا ایک ضروری رُکن ہے۔ حج کے لغوی معنی "زیارت کا ارادہ کرنے" کے ہیں۔ کعبہ کی زیارت کو اسی لئے یہ نام دیا گیا ہے کہ اس میں انسان بیت اللہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہے۔ حج ہر اس بالغ مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض ہے جو مکہ تک آنے جانے کی قدرت رکھتا ہو اگر کوئی شخص قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ"

(آل عمران - ۹۷)

لوگوں پر اللہ کا حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچ سکتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سب اہلِ جہان سے بے نیاز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

"جس شخص کو کسی بیماری نے یا کسی واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمران نے روک نہ رکھا ہو اور وہ اس کے باوجود حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی۔" (سنن کبریٰ جلد ۴)

حج کی فضیلت ان الفاظ میں بیان فرمائی:

"اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهٗ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ۔"

مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (مسلم کتاب الحج)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

"مَنْ حَجَّ هٰذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ أُمُّهٗ"

(صحیح بخاری)

جس نے اس گھر کا حج کیا اور اس دوران اس نے نہ تو کوئی شہوانی حرکت کی نہ کسی گناہ کا ارتکاب کیا وہ جب حج کر کے لوٹتا ہے تو یوں ہوتا ہے گویا آج ہی پیدا ہوا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ اللہ و رسول نے حج کعبہ کو ایسی آخری درجہ کی اہمیت کیوں دی ہے؟ اس کے بغیر اسلام کی پیروی کا دعویٰ کیونکر درست نہیں؟ اور وہ جنت کی ضمانت کیوں اور کس طرح ہے؟ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ حج کیا چیز ہے؟ دین کی روح سے اس کا کیا ربط ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی ذہن، اسلامی سیرت اور اسلامی کردار پیدا کرنے میں وہ کیا حصّہ لیتا ہے؟ حج کے بارے میں یہ باتیں ہمیں دو چیزوں سے معلوم ہو سکیں گی۔

۱۔ ایک تو یہ خود کعبہ کیا چیز ہے جس کا حج کیا جاتا ہے؟ وہ کس لئے بنایا گیا؟ اسلام سے اس کا کیا رشتہ ہے؟

۲۔ دوسری یہ کہ حج میں جو مراسم ادا کئے جاتے ہیں وہ کیا ہیں؟ اور ان کے پیچھے کون سے تصورات کام کرتے ہیں؟

اگر ان باتوں کی وضاحت ہو جائے تو وہ سب کچھ آپ سے آپ نظر آ جائے گا جو حج کی اس بلند ترین اہمیت کا سبب ہے۔

تاریخ کعبہ

کعبہ کی تعمیر آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس قبل حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ تعمیر کا حکم اور جگہ کا تعین دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوئے تھے اور اسی وقت انہیں یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ جب یہ گھر بن جائے تو لوگوں میں منادی کر دینا کہ اس کا حج فرض ہے۔ اس گھر کی جو حیثیت اور غرض و غایت اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اس کا اظہار ان آیتوں سے ہوتا ہے۔

"وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى" (سورہ بقرہ۔۱۲۵)

اور جب کہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کیلئے مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔

نیز فرمایا:

"إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ"

(آل عمران۔۹۶)

یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کیلئے (مرکز عبادت کی حیثیت سے) بنایا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے جس کا حال یہ ہے کہ وہ برکتوں والا اور سارے جہاں کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوا کہ یہ گھر سراپا خیر و برکت ہے، ساری دنیا کے لئے ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ کے پرستاروں کا مرجع ہے۔ نماز قائم کئے جانے کی اصل جگہ اور توحید کا خالص مرکز ہے۔ ذرا غور کیجئے تو محسوس ہو گا کہ یہ صفتیں آپس میں گہری مناسبت رکھتی ہیں۔ جو چیز توحید خالص کا مرکز ہو گی، درحقیقت نماز کی اصل جگہ بھی وہی ہو گی اور جو چیز توحید اور نماز کا مرکز ہو کوئی شک نہیں کہ وہ سراپا ہدایت اور مجسم برکت ہی ہو گی۔

قبل ازیں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اعتقادی طور پر توحید اور عملی طور پر نماز۔ یہی دونوں چیزیں پورے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

دین کا مغز ہیں۔ اس لئے کعبہ اگر توحید اور نماز دونوں کا مرکز ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ پورے دین کا مرکز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے صراحۃً "بَیْتِیَ" (اپنا گھر) فرمایا ہے جس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ وہ اللہ کے دین کا گھر یا مرکز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری جگہ جہاں کہیں بھی نماز پڑھی جائے ضروری ہے کہ رُخ اسی گھر کی طرف ہو تاکہ اگر نماز کے اس اصل مقام پر نماز پڑھنے کی آسانی میسّر نہیں تو کم از کم چہرے کا رُخ تو اس طرف رہے۔ اصل "مُصلّٰی" یعنی حقیقی مسجد یہی ہے اور دنیا کی دوسری تمام مسجدیں اس کی قائم مقام ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا بنایا ہوا یہ کعبہ اللہ کے دین کا گھر اور اسلام کا مرکز کیوں اور کس طرح ہے؟ یہ سمجھنے کے لئے ایک طرف تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کی تعمیر کے بعد اس کے مقصدِ تعمیر کی خاطر عملی قدم کیا اُٹھایا گیا؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا جہاں کلدانیوں کی حکومت تھی۔ یہاں بدستور ستاروں کی پُوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ جب منصبِ نبوت سے سرفراز ہوئے تو ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی۔ ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو تکلیفیں دیں۔ ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ آپ مختلف علاقوں میں دعوتِ حق کی منادی کرتے ہوئے مکّہ کی چٹیل وادی میں پہنچے۔ یہیں اس مشہور خواب کا واقعہ پیش آیا جس میں آپ نے اپنے اکلوتے فرزند حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنے ہاتھوں ذبح کرتے دیکھا تھا۔ یہ خواب جب آپ نے اپنے لختِ جگر کو سنایا تو سعادت مند بچے نے کہا کہ: "ابّا جان اللہ کا جو حکم ہو اس پر بے دریغ عمل کیجئے، یہ گردن انشاء اللہ صبر و رضا کی گردن ثابت ہوگی"۔ باپ نے بیٹے کو زمین پر پچھاڑ کر چھُری گردن پر رکھ دی۔ ہاتھ چلنے کو ہی تھے کہ اوپر سے ندا آئی "ابراہیمؑ! بس ہاتھ روک لے، تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نے اسمٰعیل کو ایک بھاری قربانی کے عوض چھُڑا لیا"۔ حضرت ابراہیمؑ کی پوری زندگی مثالی آزمائشوں کی زندگی تھی۔ یہ ذبح کا واقعہ ان آزمائشوں کی آخری کڑی تھی۔ اس آخری اور سب سے بڑی آزمائش میں بھی جب آپ پُورے اُتر چکے تو اب اجر پانے کا دور شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی۔

"اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ (سورۂ بقرہ ۔ ۱۲۴)	ابراہیم! میں تمہیں سارے انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔

پھر اس امام بنانے کی کارروائی کا آغاز اس طرح ہوا کہ ان اعلانوں اور ہدایتوں کے ساتھ جن کے حوالے ابھی گذر چکے ہیں۔ کعبہ کی تعمیر کا حکم ہوا۔ اس پس منظر کی دو باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھنے کی ہیں:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۔ ذبح کا واقعہ مَروہ کے مقام پر پیش آیا جو مکّہ کے قریب واقع ہے اور کعبہ اس مقام سے صاف نظر آتا ہے۔

۲۔ خواب کے بعد باپ اور بیٹے دونوں نے تسلیم و رضا کے جس جذبے کے ساتھ اس اشارۂ غیبی پر عمل پیرا ہونے کا عزم کیا تھا۔ اس کی تعبیر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لفظ سے کی ہے۔

"فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ" (الصّافّات۔۱۰۳)

جب دونوں نے گردن جھکا دی اور اسے (اسمٰعیل کو) پیشانی کے بل لٹا لیا۔

جس وقت کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی اسی وقت اس کے مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں اس کے مقدّس معماروں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دُعا کی۔

"رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ" (البقرہ ۱۲۷-۱۲۸)

خدایا! ہمارے عمل کو قبول فرما یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اے مالک ہمیں سچّا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسا گروہ پیدا کر جو تیرا فرمانبردار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا۔ ہم پر کرم کی نظر رکھ تو بلاشبہ نظرِ کرم فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

جب خانہ کعبہ بن چکا تو ایسا نہیں ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کو لے کر اپنے باقی اہل و عیال کے پاس یا کسی اور آباد مقام پر چلے گئے ہوں۔ بلکہ انہوں نے کیا یہ کہ اسی چٹیل میدان میں اور اسی کعبہ کے پاس انہیں بسا دیا۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کا وہ سچّا فرمانبردار گروہ (اُمّۃً مُّسْلِمَۃً) جس کے پیدا کئے جانے کی انہوں نے دُعا کی تھی۔ جب پیدا کیا جائے تو اس کعبہ کے پاس وجود میں آئے۔

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے خود کہا تھا۔

"رَبَّنَآ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ" (سورۂ ابراہیم۔۳۷)

پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے ایک شاخ کو ایک چٹیل میدان میں تیرے باعزت گھر کے پاس بسا دیا ہے۔ خدایا انہیں اس لئے بسایا ہے کہ وہ نماز قائم کریں۔

اولاد اسمٰعیل میں سے اللہ کا یہ سچّا فرماں بردار گروہ (اُمّۃً مُّسْلِمَۃً) عملاً کس طرح وجود میں آئے گا۔ یعنی اگلے اللہ ربّ العزّت کی سچّی فرمانبرداری (اسلام) کا طریقہ کیسے معلوم ہوگا؟ اس کیلئے ان حضرات نے یہ دُعا کی تھی۔

"رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا

اے ہمارے پروردگار ان کے اندر انہی میں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ" (سورہ بقرہ - ۱۲۸)	ایک ایسا رسول بھی مبعوث کر جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، تیرے احکام بتائے حکمت سکھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت ابراہیم خلیلؑ کی یہی دونوں دعائیں تھیں جو اللہ کے حضور مقبول ہو کر پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شکل میں ظاہر ہوئیں چنانچہ اس مقدس گروہ کا نام ہی مُسلم اور اُمّتِ مسلمہ پڑا۔ اور اسی لئے پڑا کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی اس دعا میں اسے اسی لفظ اور نام سے یاد کر چکے تھے دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہی اس کا یہ نام رکھ چکے تھے۔ جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے۔

"هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ" (الحج - ۷۸)	(اس (ابراہیمؑ) نے تمہارا نام مُسلم تجویز کیا۔

تعمیر کعبہ کے سلسلہ میں ان ساری باتوں کو بہ یک نظر دیکھئے کعبہ کا مرکز دین و سرچشمۂ اسلام ہونا دوپہر کے سورج کی طرح خود بخود روشن ہو جائے گا۔

مناسکِ حج

۱- احرام: جب کوئی شخص حج کے لئے روانہ ہوتا ہے تو مکّہ سے کافی دُور پہلے ایک متعین مقام پر پہنچکر باقاعدہ نیت باندھتا ہے جس کو احرام کہتے ہیں۔ احرام باندھتے وقت وہ پہلے غسل یا وضو کرتا ہے پھر عام استعمال کے کپڑوں کے بجائے ایک تہبند اور ایک چادر پہن لیتا ہے۔ اس کے بعد دو رکعت نماز پڑھتا ہے نماز پڑھ کر حج کی باضابطہ نیت کا اعلان و اظہار کرتے ہوئے اپنے خدا کو مخاطب کرتا اور بلند آواز سے پکارتا ہے۔

لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔	حاضر ہوں میرے اللہ! میں حاضر ہوں۔ حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں۔ کوئی شک نہیں کہ حمد تیرے لئے ہے نعمت تیری ہے بادشاہی تیری ہے۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔

لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ کی پکار اس کی وردِ زبان بن جاتی ہے اور وہ ہر لمحہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے یہ کلمات دہراتا رہتا ہے۔ احرام باندھ چکنے کے بعد اس کے لئے زیب و زینت اور عیش و عشرت کی ایک ایک چیز ممنوع ہو جاتی ہے۔ اپنے عام استعمال کے کپڑے وہ اتار ہی چکا ہے جو دو کپڑے چادر اور تہبند اس کے جسم پر ہیں، ضروری ہے کہ وہ سلے ہوئے نہ ہوں اور نہ کسی خوشبو اور رنگ سے رنگے ہوئے ہوں۔ اسی طرح اب وہ ٹوپی یا عمامے یا اور کسی چیز سے اپنے سر کو ڈھک نہیں سکتا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ مُنہ چھپا سکتا ہے نہ بال بنوا سکتا ہے نہ ناخن ترشوا سکتا ہے نہ خوشبو استعمال کر سکتا ہے۔ جنسی تعلقات کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ حتیٰ کہ اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح اسے شکار کرنے کی اجازت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ کسی اور کو بھی شکار کی طرف اشارہ نہیں کر سکتا۔ اس حالت میں وہ مکّے کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ جونہی کعبہ دکھائی دیتا ہے پکار اُٹھتا ہے "اَللّٰہُ اَکْبَرُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ" مکّہ میں داخل ہو کر سیدھا کعبہ پہنچتا ہے۔

۲۔ طواف: یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر دعائیں مانگنا۔ یہ وہ رسم ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں نذر اور قربانی کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی چونکہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے اس لئے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔

حجرِ اسود: حجرِ اسود کے لفظی معنی "کالے پتھر" کے ہیں۔ یہ سیاہ رنگ کا ایک پتھر ہے جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قدِ آدم بلند نصب کیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا۔ کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں جل گیا۔ اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں پڑی تھی ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں۔ اس عہدِ قدیم کی یادگار صرف یہی ایک پتھر رہ گیا تھا جس کو اہلِ عرب نے جاہلیت میں بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور تقریباً چودہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے۔ ۳۱۷ھ میں باطنیہ فرقہ کے لوگ کچھ دنوں کے لئے اس کو نکال کر لے گئے تھے اور پھر واپس کر گئے۔ ہر طواف کے ختم ہونے کے بعد اس پتھر کو بوسہ دیتے اور سینے سے لگاتے ہیں۔ ہاتھ یا کسی لکڑی یا کسی چیز سے اس کو چھُو کر بھی اس چیز کو چوم سکتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس کو چُوم کر فرمایا تھا:

"اے کالے پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے۔ نہ تو نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان لیکن میں اس لئے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔" (مسلم و ترمذی و مستدرک حاکم)

صفا اور مروہ کے بارے میں فرمایا:

"اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ" (البقرۃ - ۱۵۸) | بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔

۳۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی: صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں۔ جو اب برائے نام باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ اپنی سواریوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسمٰعیلؑ کو لے کر آگے بڑھے تھے۔ مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کرنی تھی اور آخر غیبی ندا کے باعث رُک گئے اور اسمٰعیل کی جگہ مینڈھا قربان کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ حضرت اسمٰعیل کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں۔ آخر زمزم کا چشمہ نظر آیا۔ صفا و مروہ کے درمیان دوڑنا ان ہی کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔ حج کرتے وقت پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں۔

۴۔ **وقوف عرفہ**: عرفات کے میدان میں ذوالحجہ کی نویں تاریخ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال آفتاب سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے۔ حج کا اصلی رکن یہی ہے۔ یہاں کوہ نمک جہاں تک نظر کام کرتی ہے۔ ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں یہاں "جبل رحمت" کے پاس کھڑے ہو کر مسلمانوں کا امیر تمام دنیا سے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس قیام میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع روز حشر کی یاد دلاتا ہے۔

۵۔ **قیام مزدلفہ**: حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے۔ اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہ راست چلے جاتے تو تھک کر چور ہو جاتے اس لئے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام لینے کے لئے مزدلفہ کو ایک درمیانی منزل قرار دے لیا تھا۔ اسلام نے اس کو اس لئے باقی رکھا کہ یہیں وہ مسجد واقع ہے جس کو "مشعر حرام" کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا۔ اس لئے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

۶۔ **منیٰ کا قیام**: منیٰ مکہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک میدان ہے۔ یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے ہیں اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں یہیں قربانی کی جاتی ہے۔ باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

۷۔ **قربانی**:۔ یہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقراء و مساکین کو کھانا کھلائیں۔

۸۔ **حلق راس**: منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈواتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ پوشیدہ ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں یہ دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا۔ اس کے سر کے بال منڈوا دیئے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی (سیرت ابن ہشام)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لئے انسانیت کی پرانی رسم باقی رکھی گئی۔

۹۔ رمی جمار: منیٰ کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیل کو قربانی کے لئے لے چلے تو شیطان نے اس موقعہ پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا۔ اسی لئے شیطان کو "رجیم" کنکریاں مارا گیا کہتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے اس لئے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بت پرستی کے سب سے بڑے مظاہر کو سنگسار کیا جاتا ہے۔

بہر حال تسبیح اور حمد پڑھ کر کنکریوں کو ان کے ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔

حج کی حقیقت

مذکورہ صدر تفصیلات سے معلوم ہوا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے خاص مقام میں حاضری حضرت ابراہیمؑ کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے یعنی ان برگزیدہ نبیوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرماں برداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اس طرح بجا لانا جس طرح وہ ہزاروں برس پہلے بجا لائے اور خدا کی رحمتوں اور برکتوں سے مالا مال ہوئے۔ یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی احساس و جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستور کے مطابق حج میں اپنے اعمال اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو حضرت اسمٰعیل کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں۔ اس لئے احرام کے زمانے میں سر کے بال نہ منڈوائے جاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں نہ سلے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں، نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں، نہ شکار کرتے ہیں نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں اور حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کی طرح تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے خدا کے گھر میں آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کے لبوں پر ہوتا ہے۔ پس یہی حج کی حقیقت ہے اور یہ اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی شانِ جامعیت

۱۔ مرکز یت: خانہ کعبہ اس دنیا میں عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ منبع ہے۔ جس کی کرنوں نے زمین کے ذرّہ ذرّہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ شیرازہ ہے جس میں ملّت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف لباس پہنتے، مختلف تمدّنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر وہ سب کے سب ان فطری اختلاف کے باوجود ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکّر لگاتے ہیں، اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں۔ یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔ ایّام حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں، ایک قوم بلکہ ایک خاندان کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے۔ اس لئے یہ حرم ربّانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی برادری قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو، جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہے مٹا دیتا ہے۔

۲۔ **حج کی جامعیّت**: اگر حج کے مراسم کو ایک اور پہلو سے دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ یہ حج اگرچہ کہنے کو ایک عبادت ہے لیکن فی الواقع اس میں ہر عبادت اور نیک کام کی رُوح موجود ہے۔

الف = حج نماز بھی ہے۔ اس لئے کہ نماز کی حقیقت ذکر یا یاد دہانی ہے اور حج میں آدمی مسلسل زبان سے ذکر کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ان مقامات کی زیارت کرتا ہے جو اس کے اظہار عبدیت کو اُبھار دیتی ہے۔

ب = وہ زکوٰۃ بھی ہے۔ اس لئے کہ ہر حج کرنے والے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کا گوشت غریبوں کو کھلائے۔ مالی قربانی کے بغیر حج کیا ہی نہیں جا سکتا زکوٰۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ رضائے الٰہی کی خاطر اپنی دولت صرف کی جائے۔

ج = وہ روزہ بھی ہے، اس لئے کہ جنسی اختلاط روزے میں اگر صرف دن کو ممنوع ہے تو حج کے دوران راتوں کو بھی ممنوع ہے۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا پینا منع نہیں ہے۔ مگر اس کے بجائے اس میں زیب و زینت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی پابندیاں عائد ہوتی ہیں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قائم مقام بن جاتی ہیں۔ اسی طرح نفس کی خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی مشق بھی جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے۔

د = مراسم حج کے پیچھے کام کرنے والی سب حقیقتوں کو دیکھئے عبادتِ خداوندی کا کون سا جذبہ ہے۔ جو اس میں لہریں نہیں لے رہا۔ خصوصاً جذبۂ جہاد جو بندگی کی معراجِ کمال ہے، وہ تو ان سارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعمال میں اس طرح سمویا ہوا ہے کہ پورا حج جہاد کی علامتی مشق معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عورتوں نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا "کہ تمہارا بہترین جہاد حج ہے"۔

اقتصادی فوائد ظہورِ اسلام سے قبل حج کے ایام ایک میلہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسلام نے بھی اسے باقی رکھا۔ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لئے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے چنانچہ سال کے دو تین مہینوں میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو ادھر اُدھر کے بدو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید و فروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں۔ تمام حاجی کھانا پینا، مکان، سواری اور دیگر ضروریات مکہ اور آس پاس سے حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور یہی رزمعاوضہ ان کی روزی کا باعث بن جاتا ہے۔ قرآن پاک کے محاورہ میں "خدا کا فضل تلاش کرنے" سے مقصود تجارت اور حصولِ رزق بھی قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا" (مائدہ-۲)	اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔

یعنی ان کے مال و اسباب کو لوٹنا جائز نہیں کیونکہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر ایک دنیا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام لانے کے بعد بعض صحابہؓ نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ کسی دنیوی غرض کو شامل کرنا اچھا خیال نہ کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو اچھا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا:

" وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ۔ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ" (سورۃ البقرہ-۱۹۷)	اور سفر خرچ لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو۔

روحانی و اخلاقی فوائد ۱۔ حج دراصل ان ظاہری مراسم کا نام نہیں بلکہ یہ حج کی صرف جسمانی اور ظاہری شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں۔ اسی لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلی اور صحیح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ "حج مبرور" (پاکیزہ اور مقبول حج) رکھا ہے۔ یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ اور گذشتہ کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لئے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے۔

اس کا اشارہ دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

"رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ط وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (سورۂ بقرہ-۲۸)

اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار گروہ بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور طریقے سکھا اور ہماری طرف رجوع کر بیشک تو رجوع کرنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبولیت سے آراستہ ہوئی۔ اس سے واضح ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر جہاں اکثر نبیوں اور رسولوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت کا اعتراف کیا۔ اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے۔ ان مقامات پر کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولا کو منانا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں، جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن عرفہ کا دن احرام کی حالت میں گذارتا ہے جب اس دن کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔ (نسائی۔ ترمذی)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ آپ نے یہ بشارت دی کہ عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہو۔ وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جو انہوں نے مانگا ہم نے قبول کیا۔ (صحیح مسلم و نسائی)

۲۔ حج کے ذریعے انسان اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے۔ اس لئے آدمی حج کے لئے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے۔ اس لئے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں۔ معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے۔ اس لئے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔

۳۔ عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے پہلے بری الذمہ ہو کر جانا چاہتا ہے۔ اس لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے۔ روٹھوں کو مناتا ہے۔ قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے۔ اس لحاظ سے حج معاشرتی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

۴۔ اسلام آج ہر ملک میں ہے۔ اس لئے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے۔ تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے جو اس ملک کی زبان ہے جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں۔ اس کا اثر یہ کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے نہ سہی الفاظ سے تو آشنا ہوتی ہے۔ اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

۵۔ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے۔ اگرچہ نماز بھی محدود طریقے پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے۔ جب امیر و غریب۔ عالم و جاہل، بادشاہ اور رعایا ایک لباس میں ایک صورت میں ایک میدان میں ایک ہی خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہ کسی کے لئے خصوصیت ہوتی ہے نہ آگے پیچھے کی قید۔

۶۔ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے خود حلال و حرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن ہی نہیں بلکہ وہ اخلاقی معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی و ملی زندگی کے ہر رُخ اور ہر پہلو پر حاوی اور مسلمانوں کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند مینار ہے۔

ارکانِ اسلام پر ایک نظر

یہ ہیں اسلام کے بنیادی اعمال اور ان کی حقیقتیں اور حکمتیں۔ ان پر جو شخص بھی گہری نظر ڈالے گا محسوس کرے گا کہ یہ اعمال صرف چند نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہیں بلکہ نیکی اور عبادت کے سرچشمے بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کے اندر بندگی کا احساس ابھارنے اور اسے مکمل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیتا ہے جو اسی کے لئے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا عمل اس کی قائم مقامی نہیں کر سکتا اور پھر یہ سب مل کر مومن کو ایک ایسا ذہن عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان لگائے رکھتا ہے۔ ایک ایسی رُوح عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے۔

اس طرح وہ شخص اللہ کی اطاعت گزاری کے لئے ایسا مستعد ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لئے دوڑ پڑے۔ اس کے دل کی زمین جُت کر اور کھاد اور پانی پا کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس طرح تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو تخم بھی اس میں ڈالا جائے اسے فوراً قبول کرلے اور نشو و نما دینے کے لئے اپنا عمل شروع کردے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں "اسلام کے ستون" کہا گیا ہے یعنی دین کے باقی اجزاء کے لئے مدارِ حیات قرار دیا گیا ہے۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو ان اعمال کے لئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی ہے۔

{ اسلام ایک نظر میں از صدر الدین اصلاحی
اسلامی عبادات پر ایک نظر }

سوالات متعلقہ باب سوم

۱۔ اسلام کے تصورِ عبادات پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم کیجئے۔

۲۔ اسلامی عبادات کی فلاسفی اور حکمت و مصلحت کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کیجئے۔

۳۔ نماز کو دینِ اسلام میں کیا اہمیت حاصل ہے۔ اس کے انفرادی و اجتماعی غایات و مقاصد تفصیلاً تحریر کیجئے۔

۴۔ اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو کیا اہمیت حاصل ہے اور کیوں؟

۵۔ زکوٰۃ کے مصارف پر قرآن کریم کے پیشِ نظر روشنی ڈالئے۔

۶۔ زکوٰۃ اشتراکیت کے پھیلاؤ میں سنگِ راہ ہے۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے۔

۷۔ روزہ کے اسرار و حِکَم پر ایک شذرہ قلمبند کیجئے۔

۸۔ حج کی شانِ جامعیت پر تفصیلی تبصرہ کیجئے۔

۹۔ حج کی اہمیت اور اس کے غایات و مقاصد کتاب و سنت کی روشنی میں ثابت کیجئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

اسلامی نظامِ زندگی

۱۔ شریعت کے مآخذ (قرآن و حدیث)

۲۔ تہذیبِ اخلاق (تصورِ اخلاق۔ تعمیرِ سیرت کے اسلامی اصول)

۳۔ تدبیرِ منزل (خاندان کا نظام۔ نظامِ معاشرت)

۴۔ تعلیم (تعلیم کے اسلامی اصول تعلیم کی اہمیت اور مقصد)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب چہارم

اسلامی نظامِ زندگی

۱۔ دینی زندگی

اسلامی نظامِ زندگی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کریں کہ اسلامی شریعت کے ماخذ کیا ہیں؟ اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے وہ محض انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا۔ یہاں ابتدائی اور اولین رہنمائی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے اور پھر اس کی روشنی میں عقل اور تجربے کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اس نظامِ زندگی کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہدایت پر مبنی ہے اس لئے نظامِ زندگی کے مختلف شعبوں اور ان میں اسلام کے مخصوص مزاج کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کی حقیقت، اور اصلاح کے لئے اسلام کے طریق کار کا مطالعہ کر لیا جائے اور قدرے تفصیل سے یہ دیکھ لیا جائے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کر رہے ہیں وہ کتنے قابلِ اعتماد ہیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں یہی بحث کی گئی ہے۔

۲۔ شریعت معنی و مفہوم

(شرعۃ اور شرع) کے لغوی معنی "کھلے ہوئے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ" کے ہیں۔ لیکن مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین و احکام ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی بندگی اور فرماں برداری کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے:

"لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَاجًا" (المائدہ ۔ ۴۸)

"ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی"۔

یعنی، تمام انبیاء اور تمام سابقہ کتب الٰہیہ کا دین تو یہی اسلام تھا۔ لیکن شریعت، یعنی عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول، باہمی معاملات اور تعلقات کے قوانین، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیلات کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اختلاف رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے پاس مختلف شریعتیں بھیجی تھیں، اور جب تک دنیا نے تمدن اور اجتماعی زندگی کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ سارے وسائل پیدا نہیں کر لئے کہ ساری دنیا کو ایک رسول اور ایک شریعت پر جمع کیا جا سکے، اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو، الگ الگ، شائستگی اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیاء مختلف خطہ ہائے ارضی میں دعوت حق کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ جب ان انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور بیدار ہو گیا اور انسانی معاشرہ اور تمدن کے مادی وسائل اتنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے لئے ایک ہی رسول و نبی کی بعثت کا وقت آ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا کہ آپ کے ذریعے ساری انسانیت کو وہ مکمل نظام زندگی عطا فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات کے مطابق ہے اور اب اسی پر عمل پیرا ہو کر خدا کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس طرح اب دین تو وہی ہے جس کی طرف سلسلۂ رسالت کی پہلی کڑی سے سبھی انسانوں کو بلایا گیا، لیکن پرانی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں، اور ان کی جگہ ایسی شریعت قائم کی گئی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین اور حلال و حرام کی حدود یکساں ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الٰہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں تک پہنچا ہے، اور اسی لئے شریعت کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

"القانون الالٰہی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم العقاید والاعمال وتہذیب الاخلاق وتدبیر المنزل وسیاست المدن"

عقیدوں کی تقویم اور اعمال کی درستگی اور اخلاق کی تہذیب اور خاندانی زندگی کی بہتری اور ملکی سیاست کی استواری کے لئے وہ الٰہی قانون جو نبی سے ثابت ہو

۳۔ شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری

"اسلام" تسلیم و اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ اور جو لوگ تسلیم و اطاعت کا یہ فعل کرتے ہیں اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ "مسلم" کہلاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی۔ اپنی خود مختاری سے اُس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کئے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے "مسلم سوسائٹی" کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجے میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ارادی فعل سے ہوتی ہے اور اس کی تنظیم ایسے معاہدے کے ذریعے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اس کی ہدایات ان کے لئے دستور زندگی ہے، اس کے احکام ان کے لئے قانون ہیں۔ وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا، اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و جائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے۔ اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لئے کھینچ دے گا۔ نتیجہ یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں "کیا ہونا چاہیئے" کا جواب خود تجویز نہیں کرے گی۔ بلکہ اُس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔ اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک سوسائٹی بن جاتی ہے تو خدا کی طرف سے "الکتاب" اور "الرسول" اسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے۔ اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی کو اس نظام اور اس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے۔

جس زمانے میں جس رسول کی جو شریعت تھی اس کا اصل مقصود معروفات کا پروان چڑھانا اور منکرات کا استیصال تھا، اور شریعت محمدیہ کا مقصود بھی انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو بھلا لگتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں "معروف" فطرت انسانی سے مناسب رکھنے والی چیز ہے جو خالق فطرت ہی کی طرف سے اس کی تابناکی کے لئے تجویز کردہ ہے۔ اور "منکر" اس کے خلاف ہے۔

"شریعت" ہمارے لئے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے۔ جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔ وہ بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف (بھلائیوں) پر قائم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں۔ اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیئے جائیں۔ اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرتی ہے جن سے وہ قائم ہو سکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سد راہ ہو سکتے ہیں اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے قیام و ترقی کے وسائل بھی معروف شمار ہو جاتے ہیں، اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشو و نما کا ذریعہ ہیں۔ معاشرے کے پورے نظام کو شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی حقیقی صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلقہ شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشو و نما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے، اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں میں تقسیم کرتی ہے:

(۱) واجب یا فرض: یعنی وہ معروفات جو مسلم معاشرے پر لازم کئے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مندوب یعنی مطلوب: یعنی وہ معروفات جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے کہ وہ معاشرے میں قائم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کو صاف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشو و نما کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) مباح: شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملے میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر، دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے یہی مباحات کا وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادیٔ عمل دی ہے۔ اور اسی دائرے میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریقۂ کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) حرام یعنی قطعی ممنوع: جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا ہے اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیئے گئے ہیں۔

(۲) مکروہ: یعنی اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتاً یا کنایتاً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے جس سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجے میں ناپسندیدہ ہے بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے، اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ معاشرہ خود یا اس کے صالح عناصر سدباب کریں

معروف و منکر کے یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات، کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیئے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا اور نشو و نما دینا ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن کو دبانا اور مٹانا ہے۔ کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیئے اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

یہ پورا نقشۂ زندگی ایک ہی نقشۂ زندگی ہے۔ اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔

۴۔ شریعت اسلامی کے مصادر

شریعت کی اصطلاحی تعریف اوپر گذر چکی ہے، جس سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ صاحب شریعت رسول ہوتا ہے نہ کہ کوئی امام یا مجتہد۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصطلاحاً شریعت موسوی اور شریعت محمدی وغیرہ تو کہہ سکتے ہیں، لیکن شریعت حنفی اور شریعت مالکی وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی وغیرہ کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کیوں کہ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ:

حکمۃ شرعیۃ فرعیۃ عملیۃ | وہ علم جس کا تعلق ایسے امور سے ہو جو عملی ہوں فروعی ہوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور شریعت کی طرف منسوب اور اس سے ماخوذ ہوں۔

جیسا کہ اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ:

"علم بقواعد یتوسل بها إلى کیفیة استنباط المسائل عن دلائلها التفصیلة"

ان قواعد وضوابط کا علم جو ذریعہ و وسیلہ بنتے ہیں اس بات کے معلوم کرنے کے کہ مسائل کو اُن کے تفصیلی دلائل سے کس طرح مستنبط کیا جانا چاہیئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اور فقہ (اور اصول فقہ) خالص اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہیں۔ شریعت اور فقہ کے درمیان فرق ان کی تعریفوں کے الفاظ پر ذرا گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے، کیوں کہ فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے امر و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور شریعت سے ماخوذ و مستنبط ہوتے ہیں (شرعیۃ)۔ دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرۂ بحث میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فروعی ہوتے ہیں (فرعیۃ) اور جو صرف عملی ہوتے ہیں (عملیۃ)۔ لیکن شریعت کی اصطلاحی تعریف میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا "عقائد و اعمال" دونوں داخل ہیں۔

یہ تو ہیں شریعت اور فقہ کے اصطلاحی معنی، لیکن عوامی استعمال کی رو سے فقہ اور شریعت کو مترادف یعنی ایک ہی مفہوم کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر جب "شریعت اسلامیہ کے ماخذ" کا فقرہ بولا جاتا ہے تو اس وقت لفظ "شریعت" علمی و فنی اصطلاح میں نہیں بلکہ عوامی استعمال کی حیثیت سے بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب دراصل "فقہ اسلامی کے ماخذ" ہوتا ہے۔

۵۔ ماخذِ اوّل الکتاب

شریعت، یعنی اسلامی قانون کا پہلا ماخذ سب سے پہلی دلیل، سرچشمۂ اول اور ماخذ اسلامی "الکتاب" یعنی قرآن کریم ہے، جو خدا کا کلام ہے۔

"تَنْزِيلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝" (السجدہ۔۲)

(یہ) کتاب یقیناً خدائے رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

"كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ" (ص۔۲۹)

(یہ) کتاب ہے، جسے ہم نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں)

"تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝" (طٰہٰ۔۱۴)

(یہ کتاب) زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی نازل کردہ ہے۔

اور یہ اسلامی شریعت و قانون کا اصل الاصول ہے۔ اس میں شریعت کی بنیادیں بیان کی گئی ہیں۔ عقائد کے باب میں اس کے اندر پوری تفصیل و وضاحت ہے اور عبادات و حقوق کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلامی شریعت میں اس قرآن کی وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے۔ یہ قرآن خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سارے مسلمانوں کے لئے پیشوا ہے۔

"قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ"

(الاعراف - ۲۰۳)

(اے نبی) آپ کہدیں کہ میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کیا گیا ہے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں۔ اور (یہ) ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

"وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ"

(الزخرف - ۴۴)

اور بے شک یہ (قرآن۔ الکتاب) تیرے اور تیری قوم کے لئے نصیحت ہے

"اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ"

(النساء - ۱۰۵)

بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھائے۔

اس لئے یہ قانون شرعی کا اصل سرچشمہ ہے۔

"وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ" (الاعراف - ۵۲)

اور بے شک ہم ان کے پاس (ایک) ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مفصل بیان کیا ہے۔

"اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ" (بنی اسرائیل - ۹)

بے شک یہ قرآن اس (راہ) کی ہدایت کرتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے۔

اس قرآن کی وہی خصوصیت وصفت ہے جو ایک دستور کی ہوتی ہے، یعنی یہ کہ اس میں مخصوص احکام کا بیان مجملاً ہے۔ جزئیات وتفاصیل سے اس میں بہت کم بحث کی گئی ہے اس کا اصل یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے۔ وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بناتا بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑا کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل وتعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیئے ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں امور ہی اس لئے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی سیرت وکردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھا دیں جو قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی عملی تعبیر وتفسیر ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ قرآن: موضوعات، مقصد اور انداز تخاطب

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر جب کوئی شخص پہلی مرتبہ قرآن کا مطالعہ اس توقع کے ساتھ کرتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل مضمون کو ابواب اور حصص میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو لے کر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل برخلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔

یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایت، شرعی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آجاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کے طریقہ پر نہیں، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو عوامی عمرانی کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف، چناں چہ یہ کتاب فی الحقیقت تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے۔ اس کی ترتیب دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے۔ اپنے موضوع اور مضمون و ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے۔

مدعا۔ مرکزی مضمون اور قرآن کے موضوع کو معلوم کرنے کے لئے اس کی اصل کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اس ترتیب کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب انسان کا شعور کلی ہے اس کا کوئی شعبہ نہیں ہے، وہ بیک وقت وجدان و عقل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک عام مصنف اپنے خیالات کو کسی منطقی تقسیم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو ابواب قائم کرتا ہے، وجدان و کیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو انداز بیان دوسرا ہوتا ہے اور اس میں منطق کو دخل کم ہوتا ہے اور ترتیب بھی دوسری ہوتی ہے۔ افسانہ یا تاریخ لکھتا ہے تو اس میں واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتا ہے، غرض کتاب کی ترتیب، کا تعلق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نفس مضمون سے ہے۔ اخلاق کی کتاب میں ابواب داخل کئے جا سکتے ہیں لیکن جو کتاب بیک وقت انسان کی جملہ شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ کسی ایسی تقسیم کو مفید نہیں پا سکتی۔ اس لئے قرآن کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف ہے، قرآن پڑھنے والے کو قلب و دماغ، ہوش و وجدان سب کو بیک وقت حاضر رکھنا چاہیئے ورنہ وہ پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

اس کتاب کو سمجھنے کے لیئے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس کے پیش کرنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے۔ اور مختصراً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلی و ارادی قوتوں سے مالا مال کر کے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ خدا ہی کو اپنا حاکم و آقا تسلیم کرے اور اس عطا کردہ اختیارات سے سرمو تجاوز نہ کرے کیوں کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس ہر رویہ غلط اور مختلف ہوگا (جسے اختیار کرنے کے لئے انسان آزاد ہے)۔ پھر اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جو ہمیشہ رہے گی اور وہاں ابدی راحت یا ابدی رنج و مصیبت کے علاوہ کچھ نہ ملے گا جس کا مدار اس بات پر ہے کہ انسان دنیا میں کون سا رویہ اختیار کرتا ہے۔ پھر انسانی فلاح و بہبود اور اس کی ہدایات کے لیئے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے۔ جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویے کی طرف انسان کو دعوت دیں۔ جس ہدایت کو انسانوں نے گم کر دیا ہے یا مسخ کر دیا ہے اسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں۔ پیغمبر ہزار ہا برس تک دنیا میں آتے رہے اور وہی ایک دعوت اور ایک ہدایت پیش کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لیئے مبعوث فرمایا جس کے لئے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ عام انسان اور پچھلے انبیاء کی بگڑی ہوئی امتیں سب ان کے مخاطب تھے۔ سب کو صحیح رویے کی دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایات کو قبول کریں انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف اصلاح دنیا کی جدوجہد کرے۔ پس اسی دعوت اور اسی ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے لئے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ گم ہو سکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

اس اصل کی وضاحت کے بعد آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کا موضوع "انسان" ہے۔ اس اعتبار سے کہ بلحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور حیات دنیوی کے مآل و انجام وغیرہ کے متعلق جو نظریات قائم کئے ہیں، اور ان کی بنا پر جو رویے اختیار کئے ہیں، وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لئے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لئے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جس کی تعلیم اللہ کے برگزیدہ رسول نے دی ہے اور جسے "صراط مستقیم" کہا جاتا ہے۔

ان بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون سے مربوط ہیں۔ خواہ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثار کائنات کے مشاہدات پیش کرے، خواہ گزری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرے، وہ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

پھر قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اُسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس مرتب و تدریجی طریقے پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کو پیغمبری کی خدمت کے لئے منتخب کیا۔ اس کام کے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضامین پر مشتمل تھیں۔ ایک پیغمبر کو خود اس عظیم الشان کام کی تیاری کے لئے تعلیم۔ دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں غلط فہمیوں کی مجمل تردید۔ تیسرے، "صحیح رویہ" کی طرف دعوت اور ہدایت الٰہی کے بنیادی اصول اخلاق کا بیان۔

شروع شروع کے یہ پیغامات بہت چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، پُر اثر، اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لئے ہوئے تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پُر جوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کئے، جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ، فضیلت اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دین کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں جدوجہد کرنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر ابھارا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والے اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو ان پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔ پھر ہجرت کے بعد سے تو حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔

امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہوگئی، پچھلے انبیاء کی امتوں سے سابقہ پیش آیا پرانی جاہلیت کے علم برداروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگیں ہوگیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ اس مرحلے اور ان ادوار کی بھی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی عالمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ریاست و مدنیت صالحہ کی تعمیر، زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و ضوابط، کفار، منافقین، اہل کتاب سے سلوک، مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیلی ہدایت دی گئی۔ غرض ایک طرف عالمگیر دعوت و اصلاح کی اور دوسری طرف جماعت مسلمین کے سردار کی اور تیسری طرف رئیس حکومت کی مختلف حیثیتوں کا تعین کیا گیا۔

غرض، اسی طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تیس سال کی مدت میں تکمیل ہوئی۔ (مقدمہ تفہیم القرآن)

۲۔ تدوین، جمع و ترتیب اور حفاظت

یہ بات صرف قرآن سے ہی مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، من و عن بغیر کسی تبدل و تغیر اور تحریف و تقسیم یا ترمیم و تنسیخ کے بالکل اصلی و محفوظ حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے، حالاں کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں اب تو اپنی شکل و صورت اور اصلیت بالکل کھو چکی ہیں۔ پھر چوں کہ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے برعکس اس کتاب (قرآن) کی حفاظت کی ضمانت خود اس کے نازل کرنے والے نے لے لی ہے، تو پھر اس میں ادنیٰ تغیر، تبدل اور سرمو تفاوت کی بھی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔

"لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ"

(حم السجدہ ۵-۴۲)

قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ" (القیامہ۔۱۷)	بلاشبہ ہم پر قرآن کے جمع رکھنے کی ذمہ داری ہے۔
"اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" (الحجر۔۹)	بے شک ہم نے اس الذکر (قرآن) کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت کرنے والے ہیں۔
"بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ" (البروج۔۲۱-۲۲)	بلکہ وہ تو بلند و بالا، برتر قرآن لوح محفوظ میں ہے۔

اور قرآن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی حفاظت، جمع و ترتیب اور کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ ہی جاری ہوا اور آخری مرحلے تک جاری رہا، جب کہ اس کے پہلے کی آسمانی کتابیں ابتداً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور قصوں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں۔ لیکن قرآن اوّل تا آخر ابتدائی دور ہی میں لکھ لیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ (البقرۃ) کی پہلی آیت میں اوّلین شہادت ہے:۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ	یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں ہے۔
(البقرہ۔۲)	

پیش کرنے والا اس کو ابتدا ہی سے نوشتہ اور مکتوبہ (کتاب) شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن کی ہر بڑی سورۃ کتاباً نوشتہ ہونے کا مسلسل ذکر ملتا چلا جائے گا۔ پھر:

لَا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ	اس (قرآن) کو صرف پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔
(الواقعہ۔۷۹)	

کا فقرہ بھی اس بات پر کافی دلیل ہے کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے چھو جانے کا بھی امکان تھا۔

پھر اس کی کتابت و حفاظت کا اہتمام دیکھئے کہ دوشنبہ ربیع الاول سنہ ۴ نبوی کو دوسری وحی اور تبلیغ کا حکم ہوا۔ پنج شنبہ کو خالد بن سعید مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت شروع کرائی۔ ان کی دختر ام خالد بنت سعد نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ میرے باپ نے لکھی۔ اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی۔ اور ایک دو نہیں بہت سے اصحاب سے کتابت وحی کا کام لیا جاتا تھا بلکہ مورخین نے ان کی تعداد ۴۲ تک بتائی ہے (وکُتّابہٗ اثنان واربعون) اور کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے۔ حتیٰ کہ ایک صحابی حنظلہ بن ربیعؓ تمام کاتبوں کے خلیفہ اور سردار تھے اور ان کو حکم یہ تھا کہ کوئی رہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلم بند ہو جاتی تھی۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے۔

مزید احتیاط یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف لکھوانے پر ہی قناعت نہ فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھوا کر سنتے۔ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا تب اشاعت عام کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کے الفاظ میں "جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ محمد کو بلاتے تھے، میں تختی اور دوات قلم لے کر حاضر ہوتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھلاتے، لکھا کر پھر سنتے اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحیح کرا دیتے۔" پھر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی کتابت کے لئے بغایت احتیاط بہترین چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن میں رقاع[1]، لخاف[2]، کتف[3]، عسیب[4]، ادیم[5]، اقتاب[6]، وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ایک طویل مدت تک آفات و حوادث سے حفاظت رہے۔

غرض، اس حزم و احتیاط، اور انتظام و انصرام کے ساتھ قرآن کریم اپنی مدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا۔ اور آیات و سُوَر کی جمع و ترتیب کی تکمیل بحکم خداوندی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پورا قرآن موجودہ ترتیب آیات و سُوَر کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر ہدایت و نگرانی قید تحریر میں آگیا۔ چناں چہ تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ آج تک اسی نبوی جمع و ترتیب کے مطابق ایک نقطہ اور شوشہ کی بھی کمی بیشی کے بغیر قرآن محفوظ و موجود ہے، جیسا کہ مولانا بحر العلوم "شرح مسلم الثبوت" میں لکھتے ہیں:

"قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔"

---

[1] چمڑا (چرمی قطعات) [2] پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں [3] اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی (طشتری کی طرح) [4] کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے۔ [5] باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا (اور عرب میں گوشت خور ملک ہونے کی وجہ سے ان کا کافی ذخیرہ تھا۔ چنانچہ خیمہ بھی صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا) [6] قتب کی جمع۔ اونٹ کے کجاوہ کے چوڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور مشہور شیعی فاضل علامہ سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں مشہور شیعہ مجتہد علم القرآن علامہ سید مرتضیٰ سے ناقل ہیں کہ :

" قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا، اور اسی طرح سے اس وقت پڑھا جاتا تھا، اور اسی طرح سے یاد کیا گیا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پڑھا جاتا اور صحابہ کی بڑی جماعت نے اکثر بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن اسی طرح سنایا، جس سے صاف روشن ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا نہ کہ متفرق و غیر مرتب۔"

پھر نہ صرف یہ کہ اس کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لکھا گیا تھا، جس کو سرکاری جلد کہا جا سکتا ہے، بلکہ بہت سے صحابہ کے پاس بھی پورا قرآن مکتوبہ شکل میں تھا اور بہت سے ایسے صحابہ بھی تھے جن کے پاس اگرچہ مکمل قرآن لکھا ہوا نہ تھا لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تحریری شکل میں تھا، اور یہ سب ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں کہ وقت کے بڑے بڑے مستشرقین تک ان کا اعتراف کرتے اور ان کی شہادت دیتے ہیں، چنانچہ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ :

" اس بات کے ماننے کی زبردست وجوہ ہیں کہ رسول کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے، اور ان نسخوں میں پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا تھا۔"

اور ڈاکٹر راڈ ویل رقم طراز ہیں کہ :

" قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر استعمال تھے۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قرآن کے لکھے جانے اور اس کی نشر و اشاعت میں جتنی عظیم الشان وسعت ہوئی ہے اسے علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب " اَلْفِصَلُ بَیْنَ الْمِلَلِ وَالنِّحَلِ" میں اس طرح بیان کرتے ہیں :

" جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت کا کل جزیرۂ عرب مسلمان ہو گیا تھا، جو مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے اور مشرق میں بحر فارس سے دریائے فرات پر گذرتا ہوا شام کے کنارے بحر قلزم پر ختم ہوتا ہے اس جزیرۂ عرب میں بے شمار شہر اور مواضعات ہیں، جیسے یمن، بحرین، عمان، نجد، قبیلۂ طے کے دو پہاڑ (اجا۔سلمیٰ) قبائل مُضَر و ربیعہ و قضاعہ کے قصبات، طائف، مدینہ غیرہ، غرض

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ تمام جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا، اور اس میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں اور کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو، اور ان تمام مسجدوں میں پانچوں وقت نماز میں قرآن پڑھا جاتا تھا، اور مسلمان اپنے بچوں اور عورتوں اور مردوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور ڈھائی سال خلیفہ رہے، فارس اور روم سے جہاد کیا، یمامہ کو از سر نو فتح کیا اور اب قرآن کو جاننے والے اور زیادہ ہو گئے۔ بے شمار صحابہ نے جس طرح قرآن کو لکھا تھا، اسی طرح بعد میں دیگر بلاد اسلامیہ میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے قرآن لکھا، اور کوئی شہر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے ہوئے نہ ہوں پھر خلیفہ اول کا انتقال ہوا اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے اور تمام فارس، تمام شام، جزیرہ اور تمام مصر کو فتح کیا۔

ان تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے نہ گئے ہوں، ہر ہر قریہ میں ائمہ نے قرآن سکھایا، مشرق و مغرب کے بے شمار مکتبوں میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی۔ اس طرح قرآن کے بے شمار نسخے لکھے گئے، بدستور قرآن پڑھایا جاتا رہا، اور دس سال کچھ مہینے یہی حالت رہی، اور عہد عمر میں مصر و عراق اور شام و یمن کی وسیع و عریض سرزمین میں ایک لاکھ سے کم نسخے قرآن کے مسلمانوں کے پاس نہ ہونگے۔ پھر حضرت عمرؓ کا انتقال ہوا اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور فتوحاتِ اسلام بہت زیادہ ہوئیں اور اسی کے ساتھ قرآنی نسخوں اور مساجد وغیرہ تمام باتوں میں اضافہ ہوا۔ اس زمانے میں قرآن کے اس قدر نسخے لکھے گئے اور مسلمانوں کے پاس موجود تھے کہ کوئی اس پر قادر نہیں کہ اس کا شمار بتا سکے اور اس کی تعداد کا اندازہ لگا سکے۔"

۱۔ ماخذِ دوم السنّۃ

تعریف۔ معنی: "سنت" کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی۔" لیکن عرف میں اس لفظ (سنت) سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر پابند رہے۔ اور پھر محدثین کی اصطلاح میں آ کر اس لفظ (سنت) کے مفہوم کا دائرہ پھیل گیا، اور اس سے رسولؐ کا قول، فعل، تقریر[1] اور آپ کی صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے مراد لیا گیا۔ اس اصطلاح کی رو سے "سنت" لفظ "حدیث" کا مترادف ہے۔

---

[1] وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا اور آپؐ نے اس سے منع نہیں فرمایا، اصطلاح میں "تقریر" کہلاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ اور قرآن کے بعد اس کا درجہ آتا ہے۔ کیونکہ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے۔ لیکن قرآن سے مرتبہ میں موخر ہونے کے اعتبار سے سنت بجائے خود ایک مستقل مصدر قانون ہے۔ کیوں کہ سنت میں ایسے احکام بھی وارد ہوئے ہیں جن پر قرآن خاموش ہے۔ مگر اس لحاظ سے مستقل قانون سازی کا منبع ہونے کے باوجود سنت قرآن کے تابع ٹھہرتی ہے۔ کیوں کہ وہ قرآن کا بیان و تفسیر ہونے کے علاوہ ان مقامات پر بھی قرآن کے مبادی اور اس کے قواعد عامہ سے متجاوز نہیں ہوتی جہاں قرآن خاموش ہے۔

۲۔ حجیّت حدیث و سنّت

حدیث اور سُنّت دونوں مترادف ہیں، جیسا کہ محدثین کی اصطلاح ہے، یا سنّت کو رسول کے طریق عمل کے لئے خاص سمجھا جائے اور حدیث کو قول رسول کے لئے۔ بہر حال حدیث و سنّت کی حیثیت دین میں سند اور حجت ہونے کی ہے، اور ہر ثابت شدہ سنت اور ہر وہ ارشاد یا عمل جس کی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نسبت ہو اور وہ قرآنی معیار اور اصول روایت و درایت کی رو سے بظن غالب بھی صحیح ٹھہرے، تو وہ جمہور امت مسلمہ کے عقیدے میں واجب التسلیم ہے اور یہ بات ایسی نہیں جس کے لئے کسی قسم کی باریک بینی اور علم و بصیرت کی ضرورت ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کو خدا مان لینے کے بعد اس کی فرماں برداری ضروری ہو جاتی ہے، کیونکہ عقل عام تک اس بات کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتی کہ ایمان تو ہو مگر وہ اپنے اندر کسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسول کے ہر قول اور ہر عمل کو رضائے الٰہی کی یقینی اور واحد کلید باور کرنا ضروری ہے۔ اور رسول پر ایمان بھی اپنے اندر رسول کی اطاعت و اتباع کا مطالبہ رکھتا ہے، خواہ رسول کا جسمانی وجود بھی ہو یا اس کا صرف ارشاد یا طریق عمل سامنے ہو۔

تاہم حدیث و سنّت کی حُجیّت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق بنیادی نکات کے طور پر چند دلائل درج ذیل ہیں۔ ان دلائل کو ہم آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(الف) قرآن کی اندرونی شہادت

(ب) خارجی شہادت

اور پھر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں:

(۱) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابۂ کرام کے بعد علمائے امت کی حدیث و سنّت کے حجت ہونے کی شہادت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۲) عقلی حیثیت سے اس کی حجیت

۳۔ اندرونی شہادت جہاں تک قرآنی تصریحات کا تعلق ہے، تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے قرآن کی بے شمار آیات میں سے چند یہ ہیں۔

"لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج"

(آل عمران - ۱۶۴)

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا، جب کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فریضۂ رسالت محض اللہ کی آیات کا دوسروں تک پہنچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ جو لوگ ایمان لے آئیں ان کے معاملے میں رسول کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان کو ان آیات الٰہی کی تعلیم بھی دیں۔ اور تعلیم الفاظ کے سنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ مشکل مطالب کا حل کرنا اور مجمل و مبہم باتوں کی تفصیل و تشریح کو تعلیم کہتے ہیں۔ اور تعلیم کبھی صرف زبان سے ہوتی ہے، کبھی صرف عمل سے ہوتی ہے اور کبھی زبان و عمل دونوں سے ہوتی ہے۔ اور یہی وہ "تعلیم کتاب وحکمت" ہے جو احادیث وسنن کے نام سے مشہور ہے۔ لہٰذا اللہ کی جانب سے مامور کئے ہوئے اس معلم الکتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو درمیان سے ہٹا کر محض اپنی عقل وفکر کے بل بوتے پر الکتاب (قرآن) کا کوئی مفہوم متعین کیا جائے گا تو اس کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ وہ یقیناً خدا کی مراد و منشاء کے مطابق ہے۔ لیکن رسول کی زبان و عمل سے بیان کئے ہوئے قرآنی مفہوم کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدا کی مراد و منشا کے ٹھیک ٹھیک مطابق نہ ہو کیوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام وحی کی نگرانی میں کرتے تھے:

"اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ط"

(النساء - ۱۰۵)

(اے محمدؐ) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم اس طرح فیصلے کرو جس طرح اللہ تم کو دکھائے۔

اس آیت میں "بما ارٰىك الله" کا جملہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ بما رَأَيْتَ (جیسا کہ تم دیکھو) نہیں کہا گیا ہے، بلکہ بما اراك الله (جیسا کہ اللہ تم کو دکھائے) کہا گیا ہے، اِرَاءَۃ (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال و مفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں۔ تنزیل کا تعلق اس وحی سے ہے جو الفاظ میں نازل ہو، اور اراءۃ میں وہ الہام و القا داخل ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے جو بذریعۂ الفاظ نہ ہو ۔ لفظ وحی لغت اور حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور اراءۃ دونوں کو شامل ہے۔ یہی وہ "بما اراك الله" ہے جس کو محدثین اور ائمۂ مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وحی خفی" یا "وحی غیر متلو" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی وہ "اراءۃ" (دکھانا) جس کا اظہار و بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ و اعمال (حدیث و سنت) کے ذریعے و توسط سے کیا، اللہ کی اراءۃ تو ہے، مگر الفاظ نہیں جس کی تلاوت کی جائے۔ لہٰذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم، کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل و تشریح اور کسی معاملے سے متعلق رسول کا فیصلہ محض ایک بشر کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی اراءۃ کا نتیجہ اور فراست نبوی کا وہ فیصلہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسول کا شریک و سہیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

پس یہ آیت اس بات پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تو تنزیل (انا انزلنا....) ہوئی، اور اس کا مصداق قرآن ہے، اور دوسری چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اراءۃ الٰہی (بما اراك الله) عطا ہوئی، جو اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے تنزیل سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، لہٰذا اس اراءۃ الٰہی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہیئے اور وہ یہی حدیث و سنت ہے۔

اور پھر اس "اراءۃ الٰہی" کی شہادت خود قرآن میں بکثرت ہے، بطور مثال صرف دو آیتیں درج ذیل ہیں:

سورۃ القیامہ میں ارشاد ہوا ہے:

"إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۖ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۞ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" (القیامہ ۱۷-۱۸-۱۹)

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے جب ہم پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ پڑھیں۔ پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں، اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱) جمع قرآن (۲) قرآن کا پڑھوانا (۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعۂ تنزیل یہ ہدایت دی ہو کہ فلاں فلاں آیت کو فلاں فلاں مقام پر رکھو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تنزیل کے کیا، لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام محض نجی حیثیت سے تھا اور اس کو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا، اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کو جس ترتیب سے جمع کیا، اس کی نگرانی و رہنمائی خدا نے نہیں کی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرمایا۔ اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (ثم ان علینا بیانہ)، اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریح کو۔ مجمل کی تفصیل کو، اس کے منشا کی تعیین کو اور اشارات کی وضاحت کو۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو اصولی اور مجمل احکام ہیں، اس آیت کی رو سے ان کا بیان اور ان کی تفصیل و تشریح من جانب اللہ ہونی چاہیئے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ جواب اثبات میں ہوگا۔ کیوں کہ ان کے بیان و تفصیل اور تشریح کو اللہ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے لیکن قرآن ان کی تفصیل و تشریح سے خاموش ہے، اور حدیث و سنت ان کی تفصیل و تشریح پیش کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث و سنت تنزیل نہ ہونے کے باوجود اراءۃ الٰہی اور وحی میں داخل ہے۔ جب ہی قرآن کے مجمل اور اصولی احکام کی تشریح و بیان کی نسبت اللہ کی طرف (ثم ان علینا بیانہ) صحیح ہوگی یا وجود یکہ وہ تشریح و بیان حدیث و سنت میں ہے۔

حدیث و سنت کا بیان القرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، مثلاً:

"وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ" (النحل - ۴۴)	ہم نے آپ کی طرف الذکر (قرآن) نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے آپ اس چیز کی وضاحت کردیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔
"وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ" (النحل - ۶۴)	اور ہم نے تم پر یہ کتاب محض اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کے سامنے وہ اصل حقیقت کھول دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔

بنو نضیر جب اپنے مکانات سے نکال دیئے گئے اور ان کے کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دیئے گئے اور کچھ چھوڑ دیئے گئے تو اس واقعے سے متعلق قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ:

"مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ" (الحشر - ۵)	کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا اُن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، سو وہ خدا کے اذن سے تھا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس موقع پر درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا از روئے وحی تھا، مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اس حکم خداوندی پر دلالت کر رہی ہو۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم خداوندی بذریعہ تنزیل نہ تھا، بلکہ بذریعہ اراءۃ الٰہی یا دوسرے لفظوں میں بذریعۂ وحی خفی تھا۔

اب اخیر میں سورۂ آل عمران کی وہ آیت بھی پیش نظر رکھنے کی ہے جس میں صحابۂ کرام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اہل کتاب کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ :

" وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَ اَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَ فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ " (آل عمران - ۱۰۱)	اور تم کس طرح کفر سکتے ہو جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے ۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں ہیں۔ ایک تو اللہ کی آیات اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم و تلقین اور فیض صحبت اور اثر سے لوگوں کو بھٹکنے نہیں دیتا۔ لہٰذا آج جب کہ اللہ کی آیات، یعنی قرآن تو ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا وہ دوسرا سرچشمہ حدیث و سنت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟

پس جب حدیث و سنت کا یہ مقام و مرتبہ متعین ہو گیا کہ وہ تعلیم الکتاب ہے، بیان و توضیح کتاب ہے اور اراءۃ الٰہی کی مصداق ہے، تو اب اس میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ حدیث و سنت کی حیثیت محض تاریخی نظائر کی نہیں ہے، بلکہ وہ دینی مقام رکھتی ہے، دینی سند ہے اور دین میں حجت ہے ۔

رہا حدیث و سنت کا واجب التسلیم ہونا، تو اگرچہ ان کے دینی سند و حجت کے ثبوت کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کے واجب التسلیم ہونے کے بھی دلائل ذکر کئے جائیں، پھر بھی چند قرآنی تصریحات درج ذیل ہیں :-

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ (النساء - ۶۴)	ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ باذن الٰہی اس کی اطاعت کی جائے ۔

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) ہونا لازم و ملزوم ہے، کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب الاطاعت یقین کرنا ہے ۔

دوسری بات یہاں یہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اطاعت کے لئے اصل وسیلے کی حیثیت سے مرکزی اہمیت نبی کی ذات، اس کے اسوہ اور مثال کو دی جا رہی ہے یعنی یوں نہیں کہا گیا ہے کہ وما انزلنا من کتاب الا لیعمل بہ (ہم نے کسی کتاب کو نہیں نازل کیا مگر اس لئے کہ اس پر عمل کیا جائے)۔ بلکہ فرمایا گیا ہے کہ " وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ " ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتب واجب الاتباع ہوتی ہیں، اسی طرح انبیاء و رسل کی ہستیاں بھی بالاستقلال واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہوتی ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے کتاب کے بغیر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے مگر نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے۔ اور ہر نبی، عام ازیں کہ اس پر کتاب نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعثت ہوئی ہو چوں کہ وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے، اس لئے فرمایا کہ " وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ ۔

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر " اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول" اور " اطیعوا اللہ و رسولہ" جیسے جملوں کے ذریعہ اطاعت الٰہی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم ہے، لہٰذا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الرسول اور رسولہ کا اطلاق ہوگا جتنے لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی تصدیق کریں گے، ان پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت واجب ہوگی اور اطاعت رسول کے الفاظ بولیں، یا حدیث و سنّت پر عمل کہیں، بات ایک ہی ہے محض لفظی تعبیر کا فرق ہے۔

" وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ "
(الاحزاب - ۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کیلئے گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی امر کا فیصلہ کردیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملے میں (اس فیصلے کے قبول و عدم قبول کا) کوئی اختیار باقی رہے۔

یہ آیت اس امر کے لئے نص ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسولہٗ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا (اور قیامت تک ہوگا) اس وقت تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر اُس بات کو بے چون وچرا تسلیم کرنا لازم ہے جس پر " ما قضیٰ رسولہٗ " (جو اللہ کا رسول فیصلہ کردے) صادق آتا ہے، اور کسی مومن اور مومنہ کو حق استرداد حاصل نہیں، اور حدیث و سنت یہی ما قضیٰ رسولہ ہی تو ہے۔

نہ صرف رسول کی اطاعت کا حکم ہے، بلکہ رسول کے اتباع کا بھی حکم ہے۔

اطاعت: حکم کی تعمیل کرنے اور سر تسلیم خم کردینے کو کہتے ہیں اور اتباع کے معنی ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا، نہ صرف کسی کے عمل کی طرح عمل کرنا بلکہ اس لئے اس کے عمل کی طرح عمل کرنا کہ اس نے وہ عمل کیا ہے۔

" لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۔ " (الاحزاب - ۲۱)

(مسلمانو!) تمہاری پیروی کیلئے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اُسوہ ہے۔

اور یہ تاکید اس لئے کی گئی کہ قرآن پر پوری طرح عمل کرکے ہی خدا کی فرماں برداری کا حق ادا کیا جا سکتا ہے، ——— اور خدا کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فرماں برداری ہی کر کے کوئی شخص خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے۔ اور خدا کا محبوب بندہ بننے کے لئے اتباع رسول کو شرط لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ (آل عمران - ۳۱)

(اے نبی) کہدو، کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ تب اللہ تم کو اپنی محبت سے نوازے گا۔

لہٰذا اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی اطاعت کی واحد شکل اتباعِ رسول، یعنی سُنّتِ رسول کی پیروی ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ۔ (الاعراف - ۱۵۸)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو خدا اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو۔

اس آیت میں اللہ پر ایمان کا مطالبہ ہے اور رسول کے اتباع کا حکم ہے، اس میں باریک نکتہ یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد آپ سے آپ اطاعت الٰہی لازم ٹھہر جاتی ہے۔

اس اطاعت الٰہی کے باب میں بتایا کہ اس کی واحد شکل اتباع رسُول ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت کہا ہے اور اس کے مرتکب کو وعید سنائی ہے اسی طرح رسول کی معصیت کے ارتکاب کو بھی ضلالت قرار دیا ہے اور ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب ٹھہرایا ہے۔

"وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا" (الاحزاب - ۳۶)

اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

"وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا" (الجن - ۲۳)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو ایسے شخص کے لئے نارِ جہنم ہے، جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

"يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ" (النساء - ۴۲)

اس (قیامت کے) دن وہ سب لوگ جو رسول سے سرکشی کرتے ہوئے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں۔

ان آیات، خصوصاً آخر الذکر آیت سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انحراف ضلالت اور باعث سزا ہے، اسی طرح حدیث و سنّت سے بے نیازی اور اعراض بھی ضلالت ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ دردناک عذاب اور آخرت میں رسوائی ہے۔

۴۔ خارجی شہادت

قرآن کی اندرونی شہادت کے بعد خارجی شہادت کے "تاریخی شواہد" والے شعبے پر بھی اس لئے طائرانہ نظر ڈال لینی مناسب ہے کہ قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ:

" وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝

(النساء - ۱۱۵)

جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے جہنّم میں جھونکیں گے۔

صحابۂ کرامؓ اور ان کے بعد دینی روش پر چلنے والے علماء و صلحاء نے حدیث و سنّت کو دینی حجّت و سند باور کیا اور چوں کہ حدیث و سنّت کا دین میں سند و حجّت باور کرنا بھی ایک "سبیل المومنین" ہے، اور چوں کہ صحابہ اور ان کے بعد جمہور علماء حدیث و سنّت کو سرمایۂ دین سمجھتے تھے تو پھر حدیث و سنّت کی حجّت سے انکار کرنا "سبیل المومنین" سے روگردانی کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویے کو دیکھئے۔ صحابہ ہر معاملے میں یہ دیکھتے تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ کیا رہا ہے اور ہر موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ کی پیروی کرتے تھے اور انسانیت کے یگانۂ سرسبد جس کو صاحب امر بناتے تھے وہ پہلی بات یہ کہتا تھا کہ "میری اطاعت کرو اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے سرمو بھی انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ تقلید"۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر دور کی معتبر و معتمد تاریخ کا ناطق فیصلہ ہے کہ محدّثین و فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے حدیث و سنّت کو دینی سند تسلیم کیا ہے اور وہ حدیث و سنّت کو قرآن کے بعد اسلامی قانون کا ایک مستقل ماخذ قرار دیتے رہے ہیں، چناں چہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جس نے بجائے خود حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

اب رہ جاتا ہے عقلی ثبوت، تو جیسا کہ ابتداء میں اشارہ کیا جا چکا ہے، عقل عام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تک کا تقاضا اور فیصلہ یہ ہے کہ حدیث و سنت کو حجت اور سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ اور محض تاریخی یا علمی نظائر کی حد تک اس پر توجہ نہ دی جائے، کیونکہ سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا؟ — یقیناً وہ اس پر قادر تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ کیوں کہ یہ تو بظاہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ اُنہی کے نمونے کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔

"وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔ (النساء - ۶۴)

(یعنی) ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا، لوگ احکام کے منشاء سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشاء بتانے والا نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے۔ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی اسی طرح لازم ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لیں گے وہ دراصل رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے اور وہ اُس واسطے کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطے کے طور قائم فرمایا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لئے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ (معاذ اللہ) کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے نازل فرمایا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجئے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک تھی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لئے تھی جس میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے جسم مبارک کے ساتھ زندہ تھے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحلت فرما جانے پر ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی، تو جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہی نہ تھی یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا، بلکہ بلا واسطہ بھی ممکن تھا۔ (سیرۃ النبی جلد چہارم)

لیکن، اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اس کے لئے اتباع کے احکام دیئے گئے تھے، اور اگر ہدایت نوع بشری کے لئے قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر یہ سب صرف تیئیس یا چوبیس سال کے لئے ہونا کیا معنی رکھتا ہے محض ایک صدی کے چوتھائی حصے کے لئے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لئے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا اور ایک چیز کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لئے غیر ضروری ہو جانے والی تھی، اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعۂ ہدایت قرار دینا، یہ سب کچھ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے جو (معاذ اللہ) خدائے حکیم و دانا کے ہرگز شایان شان نہیں ہے۔ اور جب ایسا ہے (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لئے ہے) تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لئے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات کو اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کو رضائے الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ کہا گیا ہے۔ اور ہدایت کا دامن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ (وان تطیعوہ تھتدوا) تو رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت ظاہر ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو بھی رہے گی۔

کتنی موٹی سی بات ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول دینی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کے بارے میں یہ کہنا بھی حجت ہونا نہ چاہیئے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ پس جب قرآن کے علاوہ نبی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟ حجت کا دروازہ ایک قول کے لئے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کھلتا ہے تو سب کے لئے کھلے گا اور بند ہوگا تو ہر قول کے لئے بند ہو جائے گا۔ اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے، جس کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے کہ حدیث و سنّت کے بغیر تو در اصل قرآن سے بھی اکتساب ہدایت ممکن نہیں ہے۔ احادیث و آثار اور روایات کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی پیروی جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاف تاکید ہے کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں، جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور میری سنّت"۔ حضرت ابن عباس کے واسطے سے یہ فرمان نبوی قابل غور ہے: "جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمیل ہے۔ اس کے ترک میں کسی کے لئے عذر جائز نہیں، اگر کوئی چیز کتاب اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنت سے ہو تو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمیل ہے"۔ ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنّت اور میرے راستہ رو ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے پر جمے رہنا اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے"۔

ان تفصیلات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جب اسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کی تاکید فرمائی، جب اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا محبوب بندہ بننے کے لئے شرط لازم قرار دیا، جب معصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعید سنائی، جب اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دیا، جب حدیث و سنت کو بیان القرآن اور تعلیم الکتاب قرار دیا تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو محفوظ ہونا چاہیئے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع اور تعلیم و تشریح قرآن پر عمل ایک ناقابل عمل حکم ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ خدا نے اس کی حفاظت کے سامان بھی فراہم کر دئے اور وہ آج تک محفوظ ہے۔ یہ (سنت) قرآن میں محفوظ ہے۔ امّت کے تعامل کی شکل میں محفوظ ہے، تواتر کی صورت میں محفوظ ہے، اور ان روایات و آثار کے اندر محفوظ ہے جو قرآنی معیار اور روایت و درایت کے مسلمہ اصول پر پوری اتریں۔

۵۔ کتابت، حفاظت، تدوین

اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہو گی کہ حدیث کا تعلق براہ راست ایک خاص تخلیقی وجود یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور صرف ایک واحد شخص کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

زندگی کے واقعات کا بیان اس کا اصل دائرہ کار ہے۔ جب کہ عام تاریخی ذخیروں کا تعلق کسی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ وغیرہ یا اسی قسم کی اور منتشر اور پراگندہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ احادیث کے برخلاف آسان نہیں ہے۔

یہ بات بھی بالکل روشن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخین یعنی صحابۂ کرام کا باہمی تعلق ایک عینی شاہد کا تھا جس کی بنیادیں عشق و سرمستی، والہانہ محبت، اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں، ہر جگہ ملتے تھے اسی لئے اس تاریخ (حدیث) کے ہر ہر واقعہ اور چیز و کو، اور ایک ایک خد و خال کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو بتلاتا تھا۔ کیوں کہ منیٰ کے میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اعلان فرما چکے تھے "اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا"

پھر حکم تھا "الا فلیبلغ الشاھد الغائب" (تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا جائے) اور "ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہنا" کیوں کہ "تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے" (حدیث) چنانچہ یہ صحابہ کرام جن حقائق و تعلیمات (حدیث) کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا وہ گناہ خیال کرتے تھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انہیں یاد تھا کہ "جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی"۔ اس کا نتیجہ تھا کہ سکرات میں مبتلا ہیں لیکن بعض سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ "علم چھپانے" کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے اس نے بار بار بہ کثرت ان کی فطرت میں یہ تہدیدی خوف اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ "جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا، اس کا ٹھکانا آگ (جہنم) میں ہوگا"۔ عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ جس قسم کے ایمان و ایقان کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس کی موجودگی میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی جرأت ان کو نہیں ہو سکتی تھی۔ اور جس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے اس سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا تھا۔ جبکہ قرآن نے بھی مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ بعض صحابہ اپنی اس تاریخی ذمہ داری کا احساس اس طرح کرتے کہ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا، چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے۔" پھر جو کچھ بیان کرنا چاہتے بیان فرماتے۔

جن موضوعین کا تعلق اپنی تاریخ سے اس قدر ہو اور جن لوگوں کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی نگہداشت میں جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیئے گئے تھے، کس اہتمام و انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا۔ ایک ایک "موئے مبارک" جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا۔ ان کے نزدیک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں عام تاریخی ذخیرے کیسے غیر معتبر نظر آتے ہیں جن کی بنیاد صرف پرانی قبروں کے کتبوں، سکوں کے ٹھپوں، کھنڈرات، سنگی یا برنجی تختیوں یا خود نوشت سوانح عمریوں پر قائم کی گئی ہے جن کے سند کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ روایت اس قسم کی بھی پائی جاتی ہے "کہ یہ پرانی تختی کچھ دن ہوئے گاڑ دی گئی تھی" پھر اس سے قطع نظر معاملہ ایک شخصی بیان سے آگے نہیں بڑھتا۔ یعنی شاہدوں کا تو سوال ہی پیچیدہ ہے۔

لیکن مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ "حدیث" ایک امتیازی شان رکھتا ہے جس کو قدرتی عوامل نے تدوین و تحفظ میں پوری مدد دی تھی۔ اس کے چشم دید گواہوں اور اس کے موضعین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرتی ہے جس میں مرد اور عورت دونوں کا حصہ ہے۔ جو زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور باسورتھ اسمتھ کے الفاظ میں "یہاں پورے دن کی روشنی سے ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔"

جہاں تک حدیث کی کتابت کا تعلق ہے ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ حدیث کی تدوین و ترتیب دو ڈھائی سو سال بعد صحاح ستہ[1] کے زمانے سے پہلے یا بہت آگے بڑھایا تو

---

[1] صحاح ستہ سے مراد حدیث کی چھ صحیح ترین اور قابل اعتماد کتابیں ہیں۔ (دیباچہ اردو ترجمہ کے نیچے)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ابن شہاب زہری سے سلسلہ ملا دیا جاتا ہے لیکن یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی ہی غلط ہے۔ حدیث کی تدوین، جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزہ سے معلوم ہو گیا ہوگا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی اور بعد کی پیداوار بالکل نہیں ہے۔

صحابۂ کرام جن کا تعلق اوپر بتایا جا چکا ہے، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قسم کا تھا، حدیث کے زندہ نسخے تھے اور تدوین حدیث کی پہلی صورت وہی قرار پاتے ہیں اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ دراصل ان ہی کی حفاظت و روایت کا مرہون منت ہے۔ اگر کتابی صورت میں احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہ کیا جاتا تو یہ ذریعہ بھی دراصل بہت کافی تھا۔ ہمارے یہاں حدیث کا بڑا حصہ تواتر ہی کے ذریعے پہنچا ہے۔

حفاظت حدیث کے اس ذریعے کے علاوہ دوسرا ذریعۂ حفاظت کتابی شکل میں تدوین ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی چند شہادتیں کافی ہوں گی۔

ہجرت مدینہ کے فوراً بعد ہی "پہلا تحریری دستور مملکت" کتابت حدیث کا پہلا ثبوت ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ریاست مدینہ میں نافذ فرمایا اور جس میں قریش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و یہود کے حقوق کا تعین ہے۔ اسی طرح ہجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مردم شماری کرائی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ میں "مجھے ان لوگوں کے نام لکھ دو جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں"۔ سرکاری دستاویزوں اور معاہدوں، پروانوں وغیرہ کا آغاز تو ہجرت سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چنانچہ تمیم داری کو فلسطین کا شہر جبرون بذریعۂ پروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاگیر میں دیا تھا۔ سفر ہجرت میں سراقہ بن مالک کو پروانۂ امن عطا فرمایا۔ اس سے قطع نظر سنہ ۱ ہجری میں قبیلۂ جُہینہ سے حلیفی کا معاہدہ، اور بنی صفرہ سے معاہدہ کا مخطوطہ اب تک ملتا ہے، یہ معاہدوں کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔

سنہ ۵ ہجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور غطفان سے آپؐ نے ایک توثیق طلب یا مسودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا یا سنہ ۶ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعض الفاظ پر آپس کا بحث مباحثہ مشہور ہے سنہ ۹ ہجری میں آل اُکیدر دُومۃ الجندل سے اطاعت کا معاہدہ، اور قیصر و کسریٰ، مقوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روانگی معروف چیزیں ہیں۔ کسریٰ نے نامۂ مبارک کو جو تحریری صورت میں تھا، چاک کر دیا تھا۔ انتظامی ضرورتوں

(بقیہ حاشیہ سابقہ صفحہ) اپنے مؤلفین کے نام سے جانی جاتی ہیں یعنی بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سے اکثر مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نما عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کئے، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خطوط پر ثبت کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہر تیار کرانا بھی معروف واقعہ ہے۔ غرض ایسی سیاسی و غیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ میں شروع ہو چکا تھا۔

عہد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نجی طور پر اور اتفاقی حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی بہ کثرت شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اہم خطبہ دیا تھا ایک یمنی شخص ابو شاہ کی درخواست پر انہیں لکھوا کر دے دیا۔ یا عتبان بن مالک انصاری کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک خطبے کی بات بڑی اچھی لگی انہوں نے اسے لکھ لیا۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کے سوا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنی ہوئی کسی چیز کے لکھنے کی ممانعت فرمائی، جس پر لکھی ہوئی چیزیں مٹا دی گئیں بلکہ ایک مرتبہ تو کہتے ہیں کہ خاصی تعداد میں جلا بھی دی گئیں۔ لیکن غور سے چھان بین کرنے پر نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو ابتدائے اسلام سے تھا یا ایسے لوگوں کے متعلق تھا جو تازہ مسلمان ہوئے تھے اور قرآن و حدیث میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ جنہیں قرآن خوب یاد تھا اور جن کی صلاحیتوں پر اطمینان تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حدیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب بھی دی ہے۔ مثلاً ایک انصاری نے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لو" (لکھ لو)۔

اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ملفوظات نبوی لکھا کرتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ لیں؛ لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں کبھی خوشی اور کبھی خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں، اس لئے بلا امتیاز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات کو لکھ لینا مناسب نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اس پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "کیا رضامندی اور غضب ہر حالت میں جو آپ کہیں لکھ لیا کروں؟" تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "ہاں، بخدا اس سے (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہی ہوتا ہے۔" چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "صادقہ" لکھا۔ اسی طرح حضرت علی، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سعد بن عبادہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت معدن ربیع، حضرت سمرۃ بن جُندب، حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں اور مجموعے مرتب کئے۔

وہب بن منبہ شاگرد حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، ہمام بن منبہ شاگرد حضرت ابوہریرہؓ، سلمان بن قیس شاگرد جابرؓ وغیرہ کے مجموعے مشہور و معروف ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پڑھنا تو آتا تھا مگر خود لکھتی نہ تھیں چناں چہ ان کے بھانجے عروۃ بن زبیر نے ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی حدیثیں بھی لکھی تھیں جو جنگ حرّہ میں تلف ہوگئیں جن کا انہیں ساری عمر رہا۔ حضرت عائشہ رضؓ کے دوسرے شاگرد عمرۃ بن عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد تھے۔ ان کے پاس بھی احادیث کا ذخیرہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کوئی پانچ سو احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر تلف کر دیا کہ کہیں سہو سے کوئی غلط لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو گیا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث نبویہ کو حکومت کی جانب سے جمع کرنے کا اہتمام کیا اور صحابۂ کرام نے اس کی حمایت میں مشورہ بھی دیا لیکن پھر آپ نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے تو وفات کے بعد ایک بار شتر تالیفات کا چھوڑا تھا۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع بھی حدیثیں لکھا کرتے تھے۔

غرض حدیث کی کتابت، اس کی حفاظت، اور جمع و تدوین کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا جسے صحابۂ کرام نے وسعت دی اور تابعین نے اضافے کئے لیکن صحاح ستہ کے مرتبین نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا اور آج خدا کی کتاب کے بعد انسانی ذخیرۂ علم میں جو چیز سب سے زیادہ معتبر اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

{تدوین حدیث مولانا مناظر احسن گیلانی
وصحیفہ ہمام بن منبہ}

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ تہذیبِ اخلاق

۱۔ اسلام کا تصورِ اخلاق

جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیئے، اس کو بیان کرے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصدِ عظمیٰ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اس کو واضح کرے۔ نیز مفید اور کارآمد باتوں کے لئے دلیل راہ بنے، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشے اور یہ بتائے کہ انسان جس طرح فضائل سے مزین اور رذائل سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس کو "علم اخلاق" کہتے ہیں۔

لیکن بہ ادنیٰ غور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی اعمال اس قسم کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جا سکے۔ مثلاً سانس لینا، دل کا حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجانے سے پلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں، اس لئے ان امور کے پیشِ نظر انسان کو نہ نیکوکار کہہ سکتے ہیں اور نہ غلط کار۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوئی محاسبہ کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علم اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام پاتے ہیں اور وہ ان کو ان کے نتائج و ثمرات پر غور کرنے کے بعد کرتا ہے، مثلاً شفاخانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تدابیر میں کامیابی وغیرہ۔ چوں کہ یہ "ارادی اعمال" ہیں اس لئے ان پر ہی اچھے یا بُرے ہونے کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ انسان اس قسم کے اعمال کے لئے خدا اور مخلوق کے سامنے جوابدہ ہے، اور یہی علم اخلاق کا موضوع قرار پاتے ہیں۔

ہر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شغف رکھنے والے کو ان امور کے بارے میں جن پر اس علم میں بحث ہوتی ہے ناقدانہ نظر عطا کرتا ہے۔ چناں چہ علم اخلاق کی بھی یہی شان ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شغف رکھتا ہے یہ اس کو اعمال کے کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدرت عطا کرتا ہے اور ان کی صحیح اور پائدار تقویم پر اُسے ایسا حاوی کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق حکم نافذ کرنے میں وہ لوگوں کے رجحانات اور تقلیدات کے زیر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے فیصلے میں علم الاخلاق کے نظریات، قواعد و قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت کے اندر ہی محصور نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد عظیٰ میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور ہدایت کارفرما ہو، کہ یہی تاثیر ارادے کو عمل خیر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں، اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں اور حیات انسانی کے لئے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دیں یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال اور اخوت و مواسات عامہ جیسے فضائل پیدا کریں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ "تاثیر" کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور فطرت انسانی اس سے متأثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیکی و بدی کو واضح کر دیتا ہے۔ اور اس طرح نیکی اور سچائی کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا کام جبری طور پر صالح بنا دینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے یا نہ چلنے کا انحصار فرد کے ارادے پر ہے۔ یہ علم ایک طبیب کی طرح انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کرا دیتا ہے اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آگے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اوامر (احکام) کے اختیار اور اس کے نواہی (ممنوعات) سے پرہیز پر آمادہ کر سکے۔

انسان کے اندر اخلاقی حسّ ایک فطری حسّ ہے جس کی بنا پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گذرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی، سنگ دلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھچھورا پن، تلوّن مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات در اصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو "معروف" اور بدی کو "منکر" کہتا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فالھمھا فجورھا و تقواھا (سورۃ الشمس)، یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برائی اور بھلائی جانی اور پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں مختلف اخلاقی نظام اور نظریئے کیوں ہیں؟ اور اخلاق کے معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لئے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاق صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے، اور ان کی حد، ان کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں، یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوت نافذہ کون سی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں، جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لگاتے ہیں تو آخر کار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیئے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان، کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لے کر شاخوں تک ان کی روح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و ناظم ہے۔ وہی ہم سب انسانوں کا آقا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبّوح و قدّوس ہے اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قائم ہے جس میں ٹیڑھ نہیں ہے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور اسے یہ جواب دہی اپنی مکمل ترین شکل میں آخرت میں کرنی ہے۔ چنانچہ انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیئے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہو۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے اس کے ذریعے لاگ جانچ ہوتی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت گزاری کے لئے مسخر کر دیا ہے اور جس نے خود انسان کو اُس کے دل و دماغ پر اور دست و پا پر اختیار بخشا ہے اور اُس ہستی کو انسان کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں، اُس کے خیالات اور ارادوں تک کا پورا پورا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل اُس ہستی کے پاس محفوظ ہے۔

مقصد: یہ تصوّر کائنات و انسان اُس اصلی بھلائی کو متعین کرتا ہے جس کا حصول انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیئے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آجاتا ہے جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقاء کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلے پر بھی اغراض پرستوں کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں۔

ماخذ: معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصوّر کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے۔ یعنی خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعۂ علم کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

قوّتِ نافذہ: پھر اسلام کے اسی تصورِ کائنات و انسان میں وہ قوّت نافذہ بھی موجود ہے جس کا قانونِ اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی بازپُرس کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصولِ اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزورِ نافذ کرے۔ لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھُپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا، دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بہر حال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے۔ اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزیں کر کے اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ خواہ باہر ان کے احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانونِ اخلاق کی پشت پر اصل قوت یہی ہے جو اسے نافذ کراتی ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نُورٌ علیٰ نُور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

محرّکات: اسلام کا یہ تصورِ کائنات و انسان وہ محرّکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانونِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لئے اُبھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرائے، یہ اس بات کے لئے کافی محرّک ہے کہ وہ ان کے احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک طاقتور محرّک ہے کہ جو شخص احکامِ الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے۔ خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہُوا جائے گا، اسے ابدی سزا بھگتنا پڑے گی، چاہے دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے، جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا ہُوا نظر آتا ہے اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پرلطف اور نفع بخش دکھائی دے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصورِ کائنات، اپنا معیارِ خیر و شر، اپنا ماخذِ علم اخلاق، اپنی قوتِ نافذہ اور اپنی قوتِ محرکہ الگ رکھتا ہے۔ ان ہی چیزوں کے ذریعے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بناء پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

۲۔ اخلاق و ایمان کا باہمی تعلق

ایمان اگرچہ مذہب کا اصل الاصول ہے مگر وہ ایک باطنی چیز ہے جس کو کوئی دوسرا نہیں جانتا اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے۔ اس لئے اخلاقِ حسنہ کو ایمان کی پہچان قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہلِ ایمان کی ان ضروری صفات میں شمار کیا گیا ہے جن پر اُن کی کامیابی کا مدار ہے۔ قرآن میں فرمایا:

"بے شک وہ ایمان والے کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع و خضوع کرتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں، اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔" (مومنون - ۱ - ۵)

ان آیات میں اہلِ ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے۔ ان میں وقار و تمکنت، لغویات سے اعراض، فیاضی، پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں اللہ کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے ہیں جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی باتیں اللہ کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں۔

www.KitaboSunnat.com

قرآن میں فرمایا:

اہلِ ایمان کے اوصاف

"اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب بے عقل اُن سے بات کریں تو وہ سلام کہتے ہیں۔ اور جو اپنے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پروردگار کی عبادت کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات گذارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب دُور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے۔ اور جہنم بُرا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ دونوں کے درمیان سے وہ سیدھے گذریں اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہیں پکارتے اور جو کسی کا بے گناہ خون نہیں کرتے جس سے خدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے آلودہ ہوگا۔ اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کسی لغو بات پر گذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے گذر جاتے ہیں۔ اور جب اللہ کی نشانیاں اُن کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں۔ اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا کر اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔"

(الفرقان ۶۳ - ۶۸)

وہ لوگ جو اللہ کے پیارے اور مقبول بندے ہیں اُن کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں:-

" اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں اور اُن کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں، اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ اللہ کی راہ میں دیتے ہیں، اور جب اُن پر حملہ ہو تو بدلہ لیتے ہیں اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے، تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمے ہے۔ اللہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو اُن پر ہے جو لوگوں پر ازخود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں، ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور بے شک جو مظلوم ہونے پر بھی ظالم کو معاف کر دے اور صبر کرے تو یہ ہمت کا کام ہے۔ (شوریٰ)

ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات کی جو تشریح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے۔ ہم چند احادیث ذکر کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اَخلاق و ایمان کے مابین کیا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔

اَخلاق و ایمان میں جو ربط پایا جاتا ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ نماز میں جو دعا مانگتے تھے اس میں یہ فقرہ بھی شامل ہوتا تھا:-

"اے میرے پروردگار تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر، تیرے سوا کوئی یہ راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اَخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور تیرے سوا اُن کو کوئی نہیں پھیر سکتا۔"

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے۔ فرمایا

"اکمل المؤمنین ایمانًا احسنھم | مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خُلقا" (ترمذی۔ ابوداؤد)	اخلاق سب سے اچھا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔ اسلام میں نماز اور روزے کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اَخلاقِ حَسنہ کو بھی اُن کی قائم مقامی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

" انّ الرجل لیدرك بحسن خلقه درجة قائم اللیل وصائم النّهار (ابوداؤد۔ طبرانی۔ ابن حبّان)	انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث سے مستفاد ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفلی روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہو سکتا ہے، وہی درجہ حُسنِ خُلق سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ حسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔ اسلام میں اَخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رُتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

" خیارکم احسنکم اخلاقاً (بخاری کتاب الادب)	تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ارشاد ہوا:

" احبّ عباد الله الی الله احسنهم اخلاقًا" (طبرانی)	اللہ کے بندوں میں اللہ کو سب سے عزیز وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے عہد مبارک میں دو صحابیات تھیں۔ ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں، مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں۔ دوسری صحابیہ صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں مگر کسی کو تکلیف نہ دیتیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ" اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بدخُلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ وُہ جنّتی ہے"۔

(ادب المفرد امام بخاری)

ان دونوں صحابیات کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے رسُولِ کریمؐ کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنّت میں لے جائے۔ فرمایا" انسان کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

غلامی سے آزاد کرو، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑاؤ، اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑو۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ اور نیکی بتاؤ اور برائی سے روکو۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان بند رکھو"۔ غور کیجئے کہ یہ حدیث اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔

(مشکل الآثار طحاوی ج ۴ ص ۲)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن وہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں، مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ مہاجر وہ ہے جس نے برائی کو چھوڑ دیا ہو، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی اُس وقت تک جنّت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصّہ سے محفوظ نہ رہا ہو"

(کنز العمال ج ۱ کتاب الایمان)

مذکورہ صدر احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اخلاق میں کس قدر گہرا ربط و تعلّق پایا جاتا ہے۔

۳۔ اسلامی تصوّر کی امتیازی خصوصیّات

۱۔ اسلام رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقاء کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ پھر ایک ماخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور بے ربطگی کی گنجائش نہیں ہے۔ نیز خوف خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

۲۔ اسلام خواہ مخواہ کی اپج سے کام لے کر نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ اسلام کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلا وجہ گھٹانے اور بعض کو بلا سبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان ہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں، جن کو انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی محض چند کو نہیں، بلکہ سب کو لیتا ہے۔ پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس، بین الاقوامی معاملات، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ ہر جگہ، ہر شعبۂ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمراں بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں۔

۳۔ اسلام انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے، جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے انہیں قائم کرے اور پروان چڑھائے، اور جن بھلائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے بُرا سمجھتی چلی آئی ہے اس کی بیخ کنی کرے۔ اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا ان کو جمع کر کے اس نے ایک امت بنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے۔ اور ان کو ایک امت بنانے کی واحد غرض یہی ہے کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لئے منظم سعی کرے۔ اب اگر کسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو مقام افسوس ہے، خود اس امت کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

۴۔ اسلام نے اخلاق کی تنظیم ایسے طریقے سے کی ہے کہ فضائل میں سے ہر اچھے خلق اور رذائل میں سے ہر بُرے خلق کا وہ اصلی مقام اجاگر ہو گیا ہے جو فی الحقیقت ہونا چاہیئے تھا اسلام کے سوا کسی اور مذہبی یا اخلاقی نظام نے یہ کام نہیں کیا۔

۵۔ اسلام نے اخلاق اور قانون میں وہ توازن و تناسب قائم کیا ہے جو دوسرے کسی اخلاقی نظام میں ہمیں نظر نہیں آتا۔ وہ اخلاق کو ایمان اور عبادت سے جُدا نہیں کرتا بلکہ ان کے باہمی تلازم کا قائل ہے۔ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ لا ایمان لمن لاعھد لہٗ ولا ایمان لمن لا امانۃ لہٗ "جس میں پابندیٔ عہد نہیں اس میں ایمان نہیں اور جو دیانت و امانت سے خالی ہے۔ اس میں کوئی ایمان نہیں" ایک اور حدیث میں ہے کہ:-

آیۃ المنافق ثلاثۃ اذا حدّث کذب و اذا عاھد غدر و اذا اتمن خان۔ (صحیح بخاری)	منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب عہد کرے تو غداری کرے اور جب اسے امانت دی جائے تو خیانت کرے۔

ایک اور مقام پر حضورؐ نے ان تین پر ایک چوتھی علامت کا اضافہ کر کے چار علامات نفاق شمار کی ہیں۔ وہ چوتھی یہ ہے: وَ اِذَا خَاصَمَ فَجَرَ "اور جب جھگڑے تو گالیاں بکے"۔ ان احادیث سے اخلاق و ایمان کے باہمی روابط کا پتہ چلتا ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اخلاق کی جو قدر و قیمت ہے، وہ کسی اور اخلاقی نظام یا مذہب میں نہیں ہے یہیں سے اس امر کی حقیقت بھی کھل جائیگی کہ اسلامی قانون بد اخلاقی کے لئے شدید سزائیں کیوں تجویز کرتا ہے؟

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ اسلامی نظریۂ اخلاق میں سادگی اور عملیت کا پہلو بہت واضح ہے۔ اس کے پیش کردہ اخلاق تکلف اور ریاکاری سے پاک ہیں۔ وہ ہر ایک کیلئے قابل عمل ہیں۔ ان میں ترک دنیا اور رہبانیت کی تعلیم کیلئے کوئی گنجائش نہیں۔ اسی دنیا میں رہ کر اور اس کے ہنگاموں سے دو چار ہو کر انسان ان پر عمل پیرا ہو سکتا ہے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے لوگ بلا تکلف ان پر چل سکتے ہیں۔ مختلف طبقوں کے لئے مختلف معیار نہیں بلکہ ہر مسلمان کے لئے ایک ہی معیار اخلاق ہے۔

۷۔ اسلام نے خوش اخلاق کا مقصد ان دیکھے خالق کی رضا ٹھہرا کر اخلاق میں سے ریاکاری اور خود غرضی کے عنصر کو یکسر خارج کر دیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی اصلاح میں جتنا یہ تصوّر عمیق اور مؤثر ہے، دوسرا کوئی نظریہ اس کی گہرائی اور گیرائی کو نہیں پا سکتا۔

۸۔ یہ نظریۂ اخلاق کسی غیر فطری اور سطحی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ ایک واضح اور روشن معیار اس کے سامنے موجود ہے، یعنی کتاب و سنّت حضورؐ کا خلق عظیم جسے قرآن مجید نے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ کہہ کر سراہا ہے اس نظریے کا عملی معیار ہے۔ مسلمانوں کو اس معیار پر اپنے آپ کو پرکھنے کا حکم یوں دیا گیا ہے۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں تمہارے لئے بہتر نمونہ موجود ہے!) ایسا کامل اور بلند معیاری نمونہ دنیا کے اور کسی نظریۂ اخلاق کے سامنے موجود نہ تھا۔

۹۔ اسلام نے اخلاق کی انفرادی اصلاح سے آگے گزر کر مسلمانوں کو ایک معیاری جماعت بننے کا حکم دیا ہے۔ اس جماعت کا مقصد یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ: يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ، (وہ نیکی کا حکم دیں اور بدی کی بیخ کنی کریں) پس یہاں انفرادی اصلاح ہی مدّنظر نہیں بلکہ اصل مقصود ایک اصلاح یافتہ معاشرے کا قیام ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے اخلاقی نظریے نے اخلاق کی بنیاد پر تہذیب و معاشرے کے قیام کو اپنا مقصد نہیں بنایا۔ یہ خصوصیت اسی نظریۂ اخلاق کو دوسرے نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔

تلخیص مطالب صالح انسان کا وجود ہر خیر و برکت کی کنجی اور ہر مشکل کا حل ہے۔ سب انبیاء اسی مقصد کو لے کر دنیا میں مبعوث ہوئے کہ انسان کو انسان بنایا جائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعمیر سیرت اور مردم سازی کا کام اس سطح سے شروع کیا۔ جہاں سے کسی نبی یا مصلح کو نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس لئے کہ دیگر انبیاء کی قوموں کی معاشرتی سطح، زمانۂ جاہلیت سے بلند تھی، اس کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس عظیم کام کو اس سطح تک پہنچا دیا۔ جہاں تک کسی نبی نے نہیں پہنچایا تھا۔ آپؐ نے اس سطح سے کام شروع کیا۔ جہاں حیوانیت کی انتہا اور انسانیت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اس اعلیٰ سطح پر پہنچا دیا جو انسانیت کی انتہائی منزل ہے اور جس کے بعد نبوت کے سوا کوئی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور درجہ نہیں اور جسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔

اُمتِ محمدیہ کا ہر فرد اپنی ذات سے ایک مستقل معجزۂ نبوت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور نوعِ انسانی کے اشرف و افضل ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت و رسالت کے ذریعے ایسے صالح افراد پیدا کئے۔ جو خدا پر ایمان رکھنے والے اللہ سے ڈرنے والے دیندار و امانتدار اور دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے والے تھے، گویا دنیا ان کیلئے پیدا کی گئی ہے اور وہ آخرت کیلئے خلق ہوئے ہیں۔ چنانچہ جب یہ فرد تجارت کے میدان میں آتا تو راست باز اور امانت دار تاجر ہوتا اگر اس کو فقر و فاقہ سے واسطہ پڑتا تو وہ ایک شریف و محنتی انسان نظر آتا۔ وہ جب مالدار ہوتا تو سخی و ہمدرد مالدار ہوتا۔ جب وہ عدالت کی کرسی پر بیٹھتا تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتا۔ وہ حاکم ہوتا تو مخلص اور امانت دار حاکم ہوتا اور جب وہ عوام کے مال کا امین بنتا تو ایماندار محافظ ثابت ہوتا۔

انہی اینٹوں سے اسلامی معاشرت کی عمارت بنی تھی اور اسلامی حکومت انہی بنیادوں پر قائم ہوئی تھی۔ یہ معاشرہ جسے آپ کی تربیت نے کندن بنا دیا تھا انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی معاشرہ ثابت ہوا۔ اور یہ تمام انسانی محاسن کا جامع تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس کے ایک فرد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت بلیغ اور جامع الفاظ میں اس طرح کرایا ہے:۔

"وہ لوگ تمام لوگوں میں پاکیزہ ترین دل، عمیق ترین علم، اور کم سے کم تکلف والے تھے۔ ان کو اللہ نے اپنے نبی کی صحبت بابرکت اور دین کی سربلندی کے لئے منتخب فرمایا تھا۔" (مسند دارمی)

۴۔ تعمیرِ سیرت کے اسلامی اصول اور طریقے

۱۔ اسلام اور تعمیرِ سیرت

جملہ مذاہب کی غرض و غایت یہ بتائی جاتی ہے کہ انسان کی سیرت و کردار کی تشکیل و تعمیر کی جائے اور اُسے صحیح معنی میں انسان بنایا جائے۔ دینِ اسلام جس طرح دیگر امور میں مذاہب عالم پر برتری رکھتا ہے اسی طرح تعمیرِ سیرت و کردار کے سلسلہ میں بھی یہ فوقیت اُسے حاصل ہے۔ دین اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے جس داعیٔ اعظم کو مبعوث کیا گیا اُس کی شان میں فرمایا "وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ" (القلم-۴) (آپ عظیم اخلاق کے مالک ہیں)

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے بارے میں فرمایا کہ "مجھے تکمیلِ اخلاق کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ دینِ اسلام تعمیرِ سیرت و اخلاق کو کیا اہمیت دیتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضمن میں مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت معلم اخلاق کون سی خدمات جلیلہ انجام دیں۔

رسولِ اکرمؐ بحیثیت معلمِ اخلاق جو بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیگر معلمین و مصلحین سے ممتاز کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے زیادہ عمل سے تبلیغ فرمائی۔ انسان کی عملی سیرت کا نام خُلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا کسی اور مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بدرجہا بلند انسان تھا؟ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے بحیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر خود عمل کر کے دکھایا۔

آپ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کا درس دیا تو شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ کا دل اور خدا کے ذکر سے آپ کی زبان غافل ہو، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ہر وقت اور ہر لمحہ خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے، آپ نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ کا حال کیا تھا؟ عام پیروؤں کو پانچ وقت کی نماز کا حکم تھا مگر خود آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے طلوع آفتاب کے بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، عصر، مغرب، عشاء پھر تہجد پھر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز بھی کیسی کہ رات رات بھر خدا کے حضور میں کھڑے ہیں۔ حتیٰ کہ کھڑے کھڑے پائے مبارک میں ورم آجاتا۔ حضرت عائشہؓ عرض کرتیں "اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے، پھر اس قدر تکلیف کیوں اُٹھاتے ہیں" فرماتے "اے عائشہ! کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں"۔ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ سجدہ کرنا بھول گئے۔

آپؐ نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں مگر خود آپ کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے"۔ آپؐ نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو تین تین دن بغیر کھائے پیئے متصل روزے رکھتے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔

آپؐ نے لوگوں کو زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت مشہور ہے "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قرابت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

والوں کا حق پورا کرتے ہیں، مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں، ہمیشہ یہ آپؐ کا عمل رہا کہ جو کچھ آتا سب خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے حالاں کہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں کمی نہ تھی مگر وہ سب غیروں کیلئے تھا اپنے لئے کچھ تھا تو بس وہی فقر و فاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپؐ تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور سب سے زیادہ سخاوت آپ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں "نہیں" کا لفظ نہیں فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپؐ کے ساتھ ایک راستے سے گزر رہا تھا۔ راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ابوذر اگر اُحد کا یہ پہاڑ میرے لئے سونا ہو جائے تو کبھی میں پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لئے کچھ چھوڑ دوں۔" یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے، بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول اندر تشریف لے گئے اور باہر آ گئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا "مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے۔"

اس سے بڑھ کر یہ کہ آپؐ مرض الموت میں ہیں، بیماری کی سخت تکلیف اور بے چینی ہے، لیکن اُسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ "انہیں خیرات کر دو کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔"

آپؐ نے زہد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ آپ سُن چکے ہیں کہ عرب کے گوشہ گوشہ سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ و صدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کیا کرتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپؐ کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ جب آپؐ نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لئے تھوڑے سے جَو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جَو کے بدلے میں آپ کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رہن تھی۔" آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ "فرزند آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں۔ رہنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانکنے کو کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی۔" یہ محض الفاظ کی خوشنما بندش نہ تھی۔ بلکہ یہی آپ کی طرز زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حجرہ تھا، جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، آپ کا کپڑا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا۔ یعنی جو بدن مبارک پر کپڑا ہوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہہ کیا جاتا۔ ایک دفعہ ایک سائل خدمتِ اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواج مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو بھیج دیں۔ ہر جگہ سے یہی جواب آیا کہ "گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ۹ھ میں جب اسلام کی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ہوئی تھی، آپؐ کے توشہ خانہ کی مالیت یہ تھی کہ جسم مبارک پر ایک تہبند، ایک کھری چارپائی، سرہانے ایک تکیہ جس میں خرمے کی چھال بھری تھی۔ ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ اور بس!

آپؐ نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ کی محبت معلوم ہے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور تنگدستی کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو کاشانۂ نبوت سے جواب ملا۔ "اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے"۔ ایک دفعہ آپؐ کے پاس چادر نہ تھی۔ ایک صحابیہ نے لا کر پیش کی۔ اس وقت ایک صاحب نے کہا، کیسی اچھی چادر ہے۔ آپؐ نے فوراً اتار کر ان کی نذر کر دی۔ ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا۔ ان سے کہا، عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ۔ وہ گئے اور جا کر لے آئے، حالاں کہ آپ کے گھر میں اس آٹے کے سوا رات کے کھانے تک کو کچھ نہ تھا۔

غرض، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ آخری حج کے موقع پر جب کہ شمع نبوت کے گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم تھا، انسانوں کو خدا کا آخری پیغام سنایا جاتا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جاتی ہے:

"آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو، اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں"۔

بہرحال آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصالحانہ زندگی کا جائزہ لیا جائے لیکن ایسا معلم اخلاق جو ان صفات کا حامل ہو آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۔ حضورؐ کی سیرت کے اثرات ونتائج

اخلاقی معلّم کے کمال کی ایک شرط یہ ہے کہ اُس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی پاک وصاف کر دیتا ہو۔ تمام معلمین اخلاق کی فہرست پر ایک نظر ڈال جائیے اور دیکھئے کہ تکمیل کی یہ شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اُس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا۔ (یعنی حضرت موسیٰ علیہ السّلام) کیا اس میں جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُترے (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام) یا اُس میں تھی، جس کی نسبت اُس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا:

"یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ" (الجمعہ۔۱۲)

وُہ اُن کو خدا کی آیتیں سُناتا، اُن پاک وصاف کرتا اور اُن کو کتاب وحکمت سکھلاتا ہے۔

اس اعلان میں صرف یہی بات نہیں کہ دین اسلام کا معلّمِ اعظم لوگوں کو اللہ کے احکام سناتا ہے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اُن کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف بھی بنا دیتا ہے، وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے، چناں چہ جس وقت اُس نے اپنی حیات طیّبہ کا کارنامہ ختم کیا کم از کم ایک لاکھ انسان اُس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے۔ اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئس برس کے بعد وہ اخلاق کے اُس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

ایک معلّم کا فرض صرف اپنی ذات ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ" یعنی تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمّہ دار اور نگران ہے اور اُس سے اس کی ذمّہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیّت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا، اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے۔

(صحیح بخاری ج ۲ کتاب النکاح ص ۷۸۳)

۶۔ صحابہ کرام کی ایمانی تربیت

ان احکام کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کی ایمانی تربیت فرماتے رہے۔ قرآن برابر اُن کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنّت سے عشق، علم کی حرص دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی۔ مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی معاشرہ میں پیش آیا، انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اس انقلاب کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔

امانت و دیانت: تاریخ طبری کی روایت ہے کہ مسلمان جب مدائن پہنچے اور مالِ غنیمت جمع کرنے لگے تو ایک شخص اپنے حصہ کا مال غنیمت لایا اور خازن کے سپرد کر دیا۔ لوگوں نے کہا ایسا قیمتی سامان تو دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے پاس جو مال ہے اُس کو اس سے کچھ نسبت نہیں۔ اُن لوگوں نے اُس شخص سے دریافت کیا کہ تم نے اس مال میں سے کچھ لیا بھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم اگر اللہ کا ڈر نہ ہوتا تو تم کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ ان لوگوں نے اندازہ کر لیا کہ یہ معمولی شخص نہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ اُس نے کہا میں یہ نہیں بتا سکتا اس لئے کہ تم تعریف کرو گے۔ میری تعریف اللہ کی ہے۔ اسی لئے میں خدا کے دیئے ہوئے اجر و ثواب پر راضی ہوں۔ (تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۶)

شجاعت: آخرت کے عقیدے نے مسلمانوں کے قلوب میں ایسی شجاعت بھر دی تھی کہ گویا وہ جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ معرکۂ اُحد میں جب کہ بہت سے مسلمان میدان چھوڑ چکے تھے، حضرت انس بن نضر آگے بڑھے انہوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذ! خدا کی قسم جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کی طرف سے آ رہی ہے۔ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی سے زیادہ زخم اُن کے جسم پر پائے، کچھ تلوار کے تھے اور کچھ تیروں کے، ہم نے اُن کو اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے ۔۔ جس نے اُن کو اُنگلی کے پور سے شناخت کیا۔ اور کوئی نہ پہچان سکا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

غزوۂ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا "بڑھو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے" تو عُمیر بن حمام انصاری نے کہا یا رسول اللہ کیا اُس کی وسعت زمین و آسمان جیسی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں یا رسول اللہ میری یہ تمنا تھی کہ میں اُس کو پا لیتا۔ آپ نے فرمایا ہاں ہاں پا لو گے۔ وہ کھجور کے چند دانے نکال کر کھانے لگے، پھر بولے اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں تو بہت سا وقت لگے گا۔ پھر تمام کھجور الگ پھینکے اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی۔ (صحیح مسلم)

ابوبکر بن ابو موسیٰ اشعری راوی ہیں کہ میرے والد دشمن کے مقابل تھے اور فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ میں ہیں۔ یہ سن کر ایک شخص اُٹھا، اُس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا اُس نے کہا ابو موسیٰ تم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! وہ شخص اپنے ساتھیوں کے پاس گیا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور کہا میرا سلام قبول ہو اور تلوار کا غلاف توڑ کر ڈال دیا اور تلوار لے کر دشمن کے مقابلہ میں آ گئے اور شہادت پائی۔ (صحیح مسلم)

اُحد کے روز ابو دجانہ نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ کے لئے ڈھال بنا دیا تھا۔ تیر اس پر لگتے تھے اور وہ حرکت نہ کرتے۔ ابو سفیان جب مدینہ آئے اور اپنی بیٹی اُم المومنین حضرت اُم حبیبہؓ کے پاس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بستر پر بیٹھنا چاہا تو انہوں نے اس کو لپیٹ دیا۔ ابو سفیان نے کہا اے بیٹی! مجھ خبر نہیں کہ تم نے بستر میرے لائق نہ سمجھا۔ یا مجھ کو اس کے لائق نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا نہیں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر ہے اور تم مشرک ہو نے کی وجہ سے نجس ہو۔ (سیرت ابن ہشام)

عروہ بن مسعود ثقفی نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد مشرکین مکہ سے کہا اے لوگو! میں بادشاہوں کے یہاں گیا کسریٰ قیصر اور نجاشی کے دربار بھی دیکھے۔ خدا کی قسم میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمد کے ساتھی محمد کی۔ خدا کی قسم جب وہ تھوکتے ہیں تو اُن میں سے کسی شخص کے ہاتھ پر گرتا ہے وہ اپنے چہرے اور جسم پر مل لیتا ہے۔ اور جب وہ اُن کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب اُن کے حکم پر لپکتے ہیں۔ اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے رہ جاتے ہیں، اور جب بات کرتے ہیں تو وہ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں اور وہ فرط ادب سے آپ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۷۵)

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) دین کے بارے میں بڑے خوش قسمت واقع ہوئے تھے کہ دین کے بارے میں انہوں نے رسول اللہ کی تعلیم پر پورا اعتماد کیا اور اپنی محنت و کاوش کو پوری طرح کے ساتھ دین و دنیا کے مفید میدانوں میں صرف کیا۔ نوع انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے وہ سب ایک باپ کی اولاد تھے اور آدمؑ کی اصل مٹی سے ہے۔ نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی۔ ہاں اگر کسی کو کسی پر فضیلت تھی تو محض تقویٰ کی بناء پر۔

درحقیقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی کنجی انسانی فطرت کے قفل پر رکھ دی تھی، بس وہ کھل گیا اور اُس کے تمام خزانے عجائبات، طاقتیں اور کمالات دنیا کے سامنے آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کی رگ کاٹ دی اور اس کے طلسم کو پاش پاش کر دیا۔ آپؐ نے سرکش اور ضدی دنیا کو خدا کی طاقت سے مجبور کر دیا کہ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن اور تاریخ میں انسانیت کے ایک بالکل نئے دور کا آغاز کرے۔ یہ وہ اسلامی دور ہے جو تاریخ کی پیشانی پر ہمیشہ دمکتا رہے گا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ تدبیرِ منزل

۱۔ معاشرتی زندگی

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، یا یوں کہیئے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کر موت تک معاشرے کا محتاج ہے۔ اس کا جسم، عقل اور خُلق جیسے اہم عطیات بھی "خالق کائنات" جماعتی علائق ہی کے لئے عطا فرماتا ہے۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اپنی پرورش کے لئے دوسرے لوگوں (ماں، باپ، بھائی بہن یا رشتہ داروں) کا محتاج ہوتا ہے۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ نیز "فرد" یا "انسان" اپنی ہر متعلقہ شے مثلاً خوراک، لباس، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا "دست نگر" ہے۔ اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیئے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ انسان کے اعمال، اغراض، اور عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے۔

تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر ایک فرد یا انسان دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس لئے اس کو فطری طور پر مدنی الطبع تسلیم کر لینا بے دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ جماعت کا وجود افراد جماعت پر موقوف ہے اور افراد جماعت میں سے ہر فرد کا نفع و نقصان جماعت کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے قائم ہیں۔ چھوٹی جماعتوں سے لے کر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ یہ تعلق موجود ہے۔ مثلاً سب سے چھوٹی جماعت خاندان اور کنبہ ہے جو والدین، اولاد اور قریبی اعزہ سے بنتی ہے اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گذاری کا معاملہ رہتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو کو مضرت پہنچ جاتی ہے تو تمام اعضاء تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا بدطینت ہو جائے تو وہ سارے کنبہ کو سعادت و خوش بختی سے محروم کر دیتا ہے یا اگر باپ شرابی یا جواری ہو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تو اس کی یہ خصلت بد پورے کنبے کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے پورے مالی و انتظامی نظام اور ماحول کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ پھر کنبے سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مثلاً "مدرسہ" جہاں طلبہ، مدرسین، اور عملہ ایک "جسم واحد" ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے مدرسے کی عظمت و پستی کا باعث بن سکتا ہے۔

یہی حال ایک بڑی جماعت یا گروہ کا ہے کہ ایک فرد کا کوئی نمایاں کام ساری "جماعت" یا "جرگہ" کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے، اور ایک شخص کی ہی دناءت سے پوری جماعت یا جرگہ کی ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ "ایک مردہ مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے" پھر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک بڑا علاقہ ہے جو دین یا زبان یا تمدن کے ذریعے وحدت کا داعی ہے ۔ اس راہ سے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے، اور اس کے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے ۔ اس کے تمام افراد نفع و نقصان میں مشترک ہوتے ہیں۔ اور "ملت" جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور دین کے رشتے سے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کرتی ہے اس کی وحدت اجتماعی تو اس قدر دور رس ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بجا ہے۔ جس طرح جسم کو اس کا کوئی عضو فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح قوم اور امت کو بھی اپنے افراد سے نفع و نقصان حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ، مدرسین، تاجر، کاشت کار، صنعت کار، بڑھئی وغیرہ سب قوم کے اجزاء ہیں جو اس کا جسم سنوارتے اور بناتے ہیں اور اس کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر انسان کے اچھے اور برے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے ۔ قوم کی ترقی کا پیمانہ اس کے افراد کے مجموعۂ اعمال کے اعتبار سے ہی بنتا ہے۔ اب اس سے آگے بڑھیئے "تمام عالم انسانی" جنس، رنگ روپ، بول چال اور مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک ہی جسم "انسانیت" کے افراد و اعضاء ہیں۔ اسی لئے ہر قوم دوسری اقوام پر اثر ڈالتی ہے اور صنعت و حرفت، تجارت، معارف و علوم و اخلاق میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہے ۔ اقوام کے درمیان خصائل و عادات کا طبعی اختلاف فی الحقیقت ان کے درمیان الفت و محبت پیدا کرنے سے مانع نہیں ہے۔ جس طرح ایک کنبے کے افراد میں مرد و عورت کا تند و نرم ہونا ان کی یکتائی اور ان کے جسم کے واحد ہونے کے منافی نہیں ہے۔

غرض معاشرے کے یہ بے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے جوڑے ہوئے ہیں۔ ان ہی کی درستی پر، ایک ایک انسان کی، ایک ایک معاشرے کی اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لئے صحیح اور منصفانہ اور پائدار اصول اور حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا اور اس نے بزعم خود انصاف کرنا چاہا تو پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف و راستی۔ اس لئے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لئے رجوع کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینیت یا مذہب سے انحراف کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے، اس کے اصول غیر مستقل ہوتے ہیں اور روز بنتے یا ٹوٹتے رہتے ہیں۔ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، ناانصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خود غرضیاں اور انتشار رونما ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کجی نہ آجاتی ہو۔

۲۔ خاندان کا نظام

اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے اصول و ضوابط مستقل و محکم ہیں، جس کا پورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے، اور جس کے تمام اجزاء باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع و ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے اس لئے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہیں فرد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کا سدھار ہے۔ اس لئے اس کی نظر میں فرد اور سماج دونوں کی اصلاح و تربیت یکساں اہمیت رکھتی ہے۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے۔ وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان اور معطل پرزہ یا ماحول کا ایک پرتو محض نہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کا انتہائی اہم جزو اور اصل "تاریخ ساز" قرار دیتا ہے۔ وہ ایک طرف تو اس میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے۔ اور اس طرح خود معاشرے میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و ارتقا کا پورا پورا موقع ہونا چاہیئے:۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ (حٰمٓ سجدہ - ۴۶)	جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لئے کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود اس کے آگے آئے گی۔

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنایا گیا:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (بخاری)	تم میں سے سب گلہ بان (ذمہ دار اور نگران) ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اس کے گلہ (ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی۔

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ بندے کا ایمان خدا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور آخرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے۔ اس سلسلے میں علم دین سے واقفیت سب سے اہم ہے۔ چناں چہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ دعا مستقل طور پر سکھائی گئی کہ

"وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ (طٰہٰ - ۱۱۴)	اور کہیئے (دعا کیجئے) کہ پروردگار! میرے علم میں زیادتی فرما۔

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (ابن ماجہ)	علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لئے ضروری ہے۔ گویا اسلام ایک فرد کو ایسے خطوط پر چلانا چاہتا ہے جس پر اس کے استحکام اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے۔ اس لئے اسلام ہر فرد میں جذبۂ عمل بیدار کرتا ہے، اور سعی و جد و جہد کی اہمیت اس کے ذہن پر نقش کرتا ہے۔

"وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم - ۳۹)	انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو کوشش کرے گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ملے گا اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے"۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے "کوشش کرو، اس لئے کہ اللہ نے تم پر کوشش فرض کی ہے"۔ جذبۂ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اچھے اعمال کرے کیوں کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیج کی طرح ہے جو بارآور نہ ہو سکے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے "ایمان دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضاء سے عمل کا نام ہے" اور "اللہ ایمان کو بغیر عمل اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا" گویا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں۔

فرد کی اصلاح کا ایک مؤثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جس کا اسلام نے ایک مفصل پروگرام دیا ہے اور جس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں کیوں کہ افراط و تفریط سے بچانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیئے۔ دنیا داری اور دنیا سے اجتناب، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ اس لئے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں "ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے"۔ اسلام ہر فرد میں میانہ روی کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی نظر میں چوں کہ امت مسلمہ کی حیثیت "اُمّت وسط" اور "خیر اُمّت" کی ہے اس لئے وہ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے۔ اور اپنی زندگی کو دنیا کمانے کے بجائے دین کو قائم کرنے کے لئے وقف کر دے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔

سورۂ توبہ رکوع ۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اعلائے کلمۃ الحق کیلئے ہونی چاہیئے۔

"اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" توبہ۔ آیت (۴۱)

گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری ہو، اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے کوشش کرو (جہاد) کرو۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی پوری رعایت موجود ہے۔

یہ وہ موٹی موٹی باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کیلئے اسلام کو مطلوب ہیں۔

۳۔ معاشرتی اصلاح

جیسا کہ پہلے کہا گیا، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لئے بھی واضح ہدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح۔ اس کے برعکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کر کے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ نتیجتاً ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے نہ صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرف نظر کیا، اور نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے۔ لیکن اسلام دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے۔

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے پاک، تعصبات و مکروہات سے منزہ، نسل، رنگ، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے، مساوات، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالمگیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو اور ایک فکری، اخلاقی، نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی انسانیت، اور مواساۃ کا رشتہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

۴۔ نظامِ معاشرت کی بنیادیں

۱۔ مساوات: اسلامی معاشرے کی سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت اور اس کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے۔ رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک، قوم کی فطری تقسیم باہمی تعارف کے لئے ہے۔ لیکن ان اختلافات کی وجہ سے تعصب یا تفرق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے، کیوں کہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:

"یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ"

(الحجرات - ۱۳)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو، تم میں سب سے زیادہ باعزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

"یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّ نِسَآءً ۚ" (النساء - ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، وہ رب جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ایک حدیث میں ہے" لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ اور ہاں! عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ مگر (بجز) تقویٰ کے" (کہ وہی وجہ امتیاز ہے)۔ ایک دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا "لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے"۔

نظریہ توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصوّر پیش نہیں کرتا بلکہ وحدت انسان کا تصوّر بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادے کا فیض ہے۔ انسان اسی کائنات کا ایک جزو ہے۔ جو دوسرے اجزاء سے مربوط ہے۔ فرداً فرداً نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی باہم بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں۔ اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریے کا قائل ہے۔ اس وحدت کے اگر اجزاء مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر اور متفرق ہیں تو اسی لئے کہ مجتمع ہو سکیں مختلف راہیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے۔ غرض انسان بحیثیت ایک نوع بھی وحدت ہے اور بحیثیت فرد بھی۔

اسلام کے اس تصوّر انسانیت کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحب عزّ و شرف ہیں اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس لئے نہ تو یہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنایا جائے، نہ کسی قسم کا لونی، نسلی، وطنی، لسانی امتیاز کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہانہ خون کا دعویٰ آپ سے آپ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عصبیت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں آدمی کو بزرگی صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ اخوّت: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے:

"اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ"۔ (الحجرات - ۱۰)	وہ لوگ جو مومن (اللہ پر ایمان رکھنے والے) ہیں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران - ۱۰۳)	سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

ایک حدیث میں ہے۔" ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے"۔ "تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا، کہ جیسے بدن (کہ) ایک عضو (بدن کا)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شریک (مبتلا) ہو جاتے ہیں۔"

اس طرح ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرنے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد یہی عقیدہ و ضابطہ ہوتی ہے۔ جو انہیں تسلیم کرے تو وہ خواہ کسی نسل، کسی ملک، کسی رنگ، کسی زبان کا ہو اس معاشرے میں شامل ہو گا اور اس کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ یہ معاشرہ جغرافیائی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرتا ہے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں۔ ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے۔

۲۔ **رشتۂ نکاح**: عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے۔ ان دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگراں کی ہے۔ عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا رشتہ ہے، اور وہ ایک دوسرے کے لئے اس طرح حرام ہیں جس طرح سگے بھائی بہن۔ لیکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے جس کے ذریعے یہ ایک دوسرے کے لئے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۳۔ **خیر خواہانہ فضا**: معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، امداد، اشتراک عمل، مواساۃ، ایثار اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیئے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لئے وہی چاہے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ ظلم، غیبت، چغل خوری، کینہ پروری، سوءِ ظن، دھوکہ دہی، بُرا نام رکھنے، رشک، حسد، بغض، تجسس، الزام تراشی، بے حرمتی و بے عزتی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سے سب پرہیز کریں، نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔ چنانچہ قرآن کا حکم ہے کہ:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۔" (المائدہ - ۲)

بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور ظلم اور گناہوں کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون نہ کرو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سورۃ قصص رکوع ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ:

"وَ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ" (القصص - ۷۷)

لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالب فساد نہ ہو۔

"يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ" (الحجرات - ۱۱)

مومنو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور (اپنے مومن بھائی کو) عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔

آگے ارشاد ہوا کہ:

"وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا" (الحجرات - ۱۲)

اور ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو اور کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔

اسی طرح حدیث میں ہے کہ "الدین النصیحۃ" (دین تو خیر خواہی کا نام ہے) "مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں" (لقمان نہ اٹھائیں) "مسلمان کبھی طعنہ دینے والا، لگنے والا نہیں ہو سکتا" وغیرہ۔ گویا اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی نظر میں زندگی تعاون، ہمدردی اور مواساۃ کا نام ہے۔

۵۔ افراد خاندان کی ذمہ داری اور باہمی تعلق

جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انفرادی طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اسلام ان میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا کرتا ہے اور پورے معاشرے میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو رد کرنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو۔ ایسی انفرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو، اسلام کو مطلوب نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "وہ مسلمان جو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے (الگ تھلگ) گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے"۔ "تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امام حاکم ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پُرس کی جائے گی اور ہر شخص اپنے اہل و عیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔"

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق، حتیٰ کے جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو واضح اور متعین کر دیا گیا ہے، تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بہہ کر ناانصافی کا مرتکب نہ ہو اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قائم رہے اور ارتقائی مدارج طے کرتا رہے۔

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لئے مقرر کئے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کئے ہیں، جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

(۱) خاندان۔ یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے، اس لئے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ یہ نکاح ایک ایسا با حرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بدترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے۔ معاہدۂ نکاح کے ذریعے دونوں (مرد و عورت) اپنے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے پابند ہو جاتے ہیں۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے، مرد اس کا نگران اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل و عیال کی دنیوی ضرورتوں اور اُخروی فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کے لئے وہ جواب دہ ہے اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم و نسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کرے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے۔

عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے اس سے رشتے، کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی رشتے پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک جا پہنچتے ہیں۔ نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محبت، ایثار، دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ گویا یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھا انسان تیار کرنا چاہتا ہے۔ اور اخلاق کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے بچے میں اسلام کا احترام پیدا ہو اور اس کی تعلیمات سے ملاقی سانچے میں ڈھل جائے۔

(ب) قرابت: خاندان کے بعد رشتہ داری کا سرچشمہ ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ دو لوگ باہم دوسرے کے تعلق سے، یا بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں اس کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے یا قبیلے کی عصبیت یا رشتہ داری سے کام لیا جائے۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قائم رکھا ہے اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند و فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے۔

(ج) محلہ۔ رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ جس کے پاس بیٹھنے یا بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں۔ اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، مثلاً "مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔" "وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔" غرض اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد، مددگار اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں، اسلام کو مطلوب نہیں، وہ ہر محلے کو معاشرے کا ایک فعال اور موثر جزو مانتا ہے۔

(د) مسجد۔ معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے، اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہو سکیں۔

(ہ) احترام روایات۔ مسلم معاشرہ کی روایات مسجد (عرف) کا احترام اور اس کا استعمال بھی معاشرتی بالیدگی کا ایک ذریعہ ہے کیونکہ اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہونی چاہیے۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بنا پر [illegible] میں تبدیلی ضرور ہونی چاہیے لیکن یہ تبدیلی مستقل اور عام طور پر اتفاق کے ذریعے [illegible] جبری اور غیر معمولی حالات کے علاوہ زبردستی کے ذریعے نہیں۔

(و) نظام تعلیم۔ معاشرے کے سدھار میں اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور [illegible] زندگی کو صحیح سمت کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اور اسلامی روایات کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہے۔

(ز) حدود و تعزیرات۔ معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود و تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے جن کے ذریعہ معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی، ترغیبی اور اخلاقی ذریعہ سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے۔ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا۔ گو کہ ایک اسلامی معاشرے میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہوں گے اس لئے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہوگا۔ لیکن بہر حال قانون کی گرفت اسلام میں ناقابل شکست ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا۔ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ حکمران وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس فقیر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بخاری) (اخلاق اور فلسفہ اخلاق مولانا حفظ الرحمٰن)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ نظام قانون وعدل

اسلامی حکومت کی پہلی بنیاد اسلامی مساوات پر رکھی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

" خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً (النساء-۱)

(خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔

نیز فرمایا:

" وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ" (بنی اسرائیل-۷۰)

(اور ہم نے اولادِ آدم کو صاحب عزت بنایا اور خشکی و تری میں ان کو سوار کیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اَنَا شَهِيْدٌ اَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ (مسند احمد و ابوداؤد)

(اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

"خوب سُن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہلِ قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے تھے نسب کوئی قابل فخر چیز نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ حاکم و محکوم اور آمر و مامور میں اسلام کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا۔ قانون سب کے لئے ایک ہے۔ ایک بار ایک معزز خاتون کو چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جانے والی تھی۔ کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا۔

" وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" (صحیح مسلم)

(اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا)

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

عدل و مساوات اور اسلام

چونکہ عدل و مساوات ہی تمام احکام کی بنیاد اور قانون سازی کا صحیح معیار ہے اس لئے خدا تعالیٰ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نے مکی اور مدنی سورتوں میں اس پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

۱۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔ (النحل۔۹۰)	(بے شک اللہ تعالیٰ انصاف اور احسان کا حکم دیتا ہے۔
۲۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰى اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء۔۵۸)	(بے شک خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالے کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔

ان آیات میں حکم دیا گیا ہے کہ احسان اور امانتوں کے معاملے میں انصاف اور مکمل مساوات اختیار کی جائے، خواہ اپنا معاملہ ہو یا دوسروں کا۔ قریب والوں کا ہو یا دور والوں کا، امیر کا ہو یا غریب کا۔ انسان ایسے معاملات میں اپنے آپ کو دشمنوں کے مساوی سمجھے، خواہ حقارت و عداوت کا دینی یا دنیوی کوئی سبب ہو، مگر انصاف کا دامن کسی حالت میں ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

اولاد آدم پر رحمۃ للعالمین کا یہ احسان رہتی دنیا تک باقی رہے گا، کہ آپ نے انسانوں کی خود ساختہ اونچ نیچ کی تمام تفریقوں کو پاؤں تلے روند کر رکھ دیا۔ انسانی مساوات کا یہ عقیدہ دراصل اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں یقین رکھنے کا منطقی نتیجہ ہے، دین اسلام سے پہلے یونانیوں ایرانیوں اور ہندوؤں نے اپنے آپ کو مختلف دیوتاؤں کی اولاد قرار دے کر دوسری قوموں سے بلند تر قرار دے رکھا تھا۔ توحید کے عقیدے نے ان تمام خرافات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔

سرور کونین نے اسلامی معاشرے میں مساوات کی شان کو جس طرح قائم رکھا، وہ اسوۂ نبوی کا بے حد نمایاں پہلو ہے۔ قبا میں مسجد تعمیر ہو رہی ہو یا مدینہ میں آپ صحابہ کے ساتھ مزدوروں کی طرح کام کرتے نظر آتے ہیں۔ مدینہ کے محاصرے میں آپ دوسروں کے ساتھ خندق کھودتے اور قحط کے وقت پیٹ پر پتھر باندھتے نظر آتے ہیں۔

قرآن نے انسانی مساوات کا جو حکم دیا تھا یہ تھی اس کی عملی تفسیر جس نے اسلامی معاشرے سے رنگ نسل زبان ملک اور قوم کے تمام امتیازات جڑ سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔ یہ اس بات کا صدقہ ہے کہ اسلام کے جھنڈے تلے خدمات انجام دینے والوں پر جب نگاہ پڑتی ہے تو ان میں بہت سے غیر عربی نظر آتے ہیں علمی میدان میں نگاہ دوڑائی جائے، خواہ حکومت اور سیاست کے میدان میں ہر جگہ یہی رنگ نظر آتا ہے۔

دین اسلام نے نظریاتی طور پر انسانی مساوات کا جو درس دیا اسے عملاً برت کر بھی دکھایا۔ آج اس گئے گزرے زمانہ میں جب کہ اسلامی تعلیمات و ہدایات کو پامال کیا جا رہا ہے۔ ہر سو فواحش و

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

منکرات کا دور دورہ ہے، جب ہم مسجد میں جاتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ صدر پاکستان اور کارخانے کا ایک مزدور بلا فرق و امتیاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں بندہ و آقا اور امیر و غریب یکساں نظر آتے ہیں۔ اسلام پر یہ طعن توڑا جاتا ہے کہ اس نے غلامی کا انسداد نہیں کیا۔ مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ مغربی فکر کے باوا آدم افلاطون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "جمہوریہ" میں معاشرتی درجہ بندی اور غلامی کی صریح تائید کی ہے۔ خود یورپ نے تہذیب و شائستگی کے دور میں داخل ہونے کے مدتوں بعد غلاموں کی بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا اور نئے دریافت شدہ ملکوں کو غلاموں ہی کی محنت سے آباد کیا۔

دوسری طرف اسلام ہی وہ دین تھا جس نے تحت الثریٰ سے اُٹھا کر غلاموں کو اَوج ثریا پر فائز کر دیا۔ حضور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو زبان پر یہ لفظ تھے۔

" اَلصَّلٰوۃَ وَمَا مَلَکَتْ یَمِیْنُکُمْ " | (نماز پڑھتے رہنا اور غلاموں کا خیال رکھنا)

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام نے انسانیت کو جس معاشرتی اور قانونی مساوات کا درس دیا، دنیا اس سے قطعاً نا آشنا تھی۔ سچ ہے۔ ؎

بندۂ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے (اقبالؒ)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۱۴۔ تعلیم

۱۔ تعلیم کا تصوّر اور اس کی اہمیّت

اسلام میں تعلیم کی اہمیّت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیّت میں یہ منفرد مقام اسلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیام بر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے انسانیّت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسان اوّل کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیاء تھا۔ یہ اشیاء کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممیّز کرتا ہے اور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے۔ علم قیادت کا ایک خاصہ اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی تہذیب کے صحت مند ارتقا اور ان نشوونما کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اولین ضرورت قرار دیا۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (CULTURE) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی، لیکن وہ کبھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے، بلکہ اہل علم کے ایک طبقے پر ہی قانع ہو گئے تھے۔ افلاطون اپنی "جمہوریہ" (REPUBLIC) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیّت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیّت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم — پڑھنا اور لکھنا — کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں:۔

"اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ" | پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ (سورۂ علق، ۱-۵)

انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب کریم ہے۔ وہ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کئے گئے ہیں ان میں تلاوتِ کتاب، تعلیم کتاب و حکمت بتبیینِ احکام و آیات، تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا۔ (صحیح بخاری) (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

علم اور تعلیم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصولوں کا صحیح فہم حاصل کریں۔

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے۔ اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو اسے زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے تعلیم ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی اور ذہنی ورثے کو آئندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب یافتہ مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے۔ جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں۔ ہر دور کے ممتاز ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصور تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ علم (ع ل م) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں "تعلیم" آتا ہے تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

انگریزی زبان کا لفظ EDUC ATION لاطینی لفظ EDEX بہ معنی نکالنا اور DUCER - DUC بہ معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے لفظی طور پر اس کے معنی "معلومات کا جمع کر دینا" اور "مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں۔ بہر نوع اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لئے بولا جاتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے :

" تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بنا پر، تحصیلِ مقصد کی خاطر اپنے لیے وضع کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لئے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں۔ انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے اُن چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں"۔

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے :

" میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے تیار کرتی ہے"۔

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصور ہے۔

امریکی فلاسفر جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی رویّوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے۔ ڈاکٹر پارک کا خیال ہے کہ تعلیم رہنمائی یا مطالعہ سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے۔ پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے نئی نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشو و نما بھی ہوتی ہے اور وہ اپنے عقائد و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں۔ ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں۔

وسیع تر مفہوم میں لفظ ان تمام طبیعی و حیاتیاتی، اخلاقی و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے اسکولوں کالجوں اور دوسری درسگاہوں میں مرتب ہوتے ہیں۔

بہرکیف تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک قوم کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے۔ ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے :-

" تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لئے ہے تو فصل کاشت کرو، دس سال کے لئے ہے تو درخت اُگاؤ، دائمی ہے تو افراد پیدا کرو"۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ مقصدِ تعلیم اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں۔

(الف) "بے عقیدہ" تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی، اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹا دی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

ے مرگِ فرد از خشکی رود حیات
مرگِ قوم از ترک مقصود حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ وار ہی گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشو و نما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لئے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لا مرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ بے عقیدہ تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرتکز یا منظم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبہ اپنی زندگی اور اردگرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی، حقیقی، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی۔ قومی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نقطۂ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈاکٹر فرینک ایڈیلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے:

"مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے"۔

مشہور اہل قلم والٹر لپ مین نے "اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت" کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا:

"اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اُس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی ہنج رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے"۔

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشان دہی کرتی ہے:

"طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں۔ اگر ان کا زمانہ، ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد و تصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لئے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں"۔

سر والٹر موبرلے نے اپنی کتاب "یونیورسٹی میں بحران" میں، جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعے پر مشتمل ہے، لکھا ہے:

"ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبا تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقعہ نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں۔ تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دینے اور سوچ بچار کی زحمت نہ اُٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ لا دینیت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ اس لئے کہ تعلیم کے مختلف اجزاء میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں ذمہ دارانہ حیثیت مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں"۔

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ۔ ٹیٹس لکھتے ہیں:-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے۔ نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابلِ شکست ہمہ گیر نقطۂ نظر سے عاری ہیں"۔

ان نئے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۳۔ تعلیم کے اسلامی اصول

(ا) **تصورِ علم**۔ اسلام نے جو تصورِ علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ علم اشیاء اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے۔ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔ نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازماتِ حیات ہی سے نہیں، مقاصدِ حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیئے۔ یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے نظامِ تعلیم کا پورا مزاج بنتا ہے۔

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیۂ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظامِ تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاقِ حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

(ب) **مقصدِ تعلیم**۔ تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے۔ اے۔ این۔ وائٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ "تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو"۔ اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے۔ انہوں نے خواجہ غلام السیدین کو ایک خط میں لکھا تھا:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ مسلمان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔

بو لہب را حیدر کرار کن

اگر یہ بو لہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سراپا رحمت ہے۔"

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصدِ دنیا میں انسان کی حیثیت توحید، رسالت، آخرت اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔ انہیں بتایا جانا چاہیئے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لئے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں۔ تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں۔ اور اسے ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطۂ نظر پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں۔

قرآنِ حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں وہ تعلیم جس کا مقصد اہلِ علم پیدا کرنا ہو اسے اولین طور پر اسلام کا علم پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

"شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ" (آل عمران۔۱۸)

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبانِ علم بھی (اس حقیقت کے) شاہد ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں۔ اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لئے انبیاء مبعوث کئے گئے ہیں۔ ایک ایسا مشن جو صاحبان علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے قرآنِ حکیم کے مطابق اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے۔ قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے اُمیوں میں انہی میں سے (محمدؐ کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ۝ (جمعہ-۲)

سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

"لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید - ۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال پر قائم رہیں۔

پس اسلامی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لئے تیار کرنا ہے۔

یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشے میں اسلامی نظریۂ حیات کی روح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہوگا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطۂ نظر سے کی جائی ہوگی۔ اس کے لئے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل نو اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو۔

(ج) **انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن** تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقاء کو کیا اہمیت دی جائے۔ اس پر ہمارے سامنے متضاد نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک فرد کا ارتقاء بنیادی قدر ہے۔ وہ اجتماعی یا مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس کے برعکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے معیارات سے مطابقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشوونما پر کوئی زور نہیں دیا گیا۔ یہ دونوں حدیں غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے۔

اسلام فرد کی اپنی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھہراتا ہے۔ اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقاء اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے۔ یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینی چاہیئے۔ قرآن کریم کے مطابق:

وَأَنْ لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى ۝ (النجم - ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ" (الرعد - ۱۱)	بیشک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی پیدا نہیں کر لیتے۔
"لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ" (البقرہ - ۲۸۶)	اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کے لئے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔
"وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ" (البقرہ - ۱۳۹)	اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو تمہارے اعمال (کا)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو نشو و ارتقا دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی زندگی کے وظائف کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔

(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگی تعلیم کا ایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو۔ اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہیئے کہ وہ دنیا کی رنگا رنگ بوقلمونیوں کے درمیان زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے۔ اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر و ارتقا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق فکر اور عمل کا توازن نبوت کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس لئے تعلیم میں یہ بات لازماً پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اختصاص کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے طالب علم کو علم کے وسیع پس منظر سے واقفیت حاصل ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ متعین کر لے۔

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کُل ہے۔ یہ اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر متلاشی کا ذہن تشکیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز متعین کرے گی خواہ ان کے حصول علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے۔ اس بنیادی نقطے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان نفس علم کو چھوٹے چھوٹے غیر مربوط جزئیات میں تقسیم نہیں کریں گے، بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ رونما ہو جائے گا۔ اس سے جزو پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ اغلباً یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی تعلیم شروع کرنے کے نقطۂ نظر سے زیادہ قریب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہیئے۔ یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا۔

(ھ) **تعمیر کردار**۔ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونا چاہیئے۔ تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی یہ یک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر شامل ہے اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے امام غزالی لکھتے ہیں:

> "تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیئے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاقی کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہیئے۔"

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (الاحزاب - ۲۱)	رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے لئے۔

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں۔ اساتذہ کو خود اپنی زندگی اور اپنے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے اور درس گاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہیئے کہ اس سلسلے میں ممد و معاون ہو سکے۔

(و) **تکمیل حیات**۔ اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کو زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لئے تیار کرنا چاہیئے۔ انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیئے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہیئے۔

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکش کے درمیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حق و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے۔ قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصول کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایات سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں:

"ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے تخلیق کی ہیں۔ کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے جو اس نے ان کے لئے بنائیں۔" (الاعراف - ۳۲)

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے:

"کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ (الاعراف - ۳۱) | (کھاؤ پیو مگر حد سے زیادہ اسراف نہ کرو)

اسلام کی نظر میں انسانی محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے۔ پس تعلیم کو دیانت دارانہ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں ممد و معاون ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں۔ ان ضروریات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لئے مثبت طور پر کام کرنا چاہیئے۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیئے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی طرز حیات کا ترجمان ہوگا اور بنی آدم کے لئے رحمت ثابت ہوگا۔ (احیاء علوم الدین امام غزالی)

۴۔ مسلمانوں کی تعلیمی روایات

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم اپنی بنیادی اقدار کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ طریقے مختلف رہے ہیں۔ اصول تنظیم میں تنوع نظر آتا ہے، اداروں کی ہیئت بھی بدلتی رہی ہے لیکن بنیادی مقصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے۔

دورِ نبوی میں تعلیمی روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملتِ اسلامیہ کے سب سے پہلے معلّم تھے۔ آپ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے متعلم تھے۔ اس مدرسے میں ۷۰ یا ۸۰ تک طالب علم تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے علاوہ دوسرے صحابۂ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اصحابِ صفہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگران تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سپرد تھا۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لئے مامور کر دیئے جاتے تھے اور تعلیم و تبلیغ کے لئے تو خصوصیت سے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے۔ دوسرے اہل ثروت مسلمان بھی ان طلبا اور ان کے متعلمین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہِ راست ان کی مدد فرماتے۔ اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی نہج قائم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی :

(ا) اولین چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیئے۔

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اور مسلم معاشرے کی ہمہ ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ بنی اور اس کے ذریعے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنے۔

(د) متعلمین کے لئے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے خود محنت مزدوری کرنا اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا۔

(ھ) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لئے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔

اَدوارِ ما بعد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادی نہج پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقاء ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے بنے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے۔ جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ہمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی اور ایک قسم کی ہمہ رس اور ہمہ گیر تعلیم موجود تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علماء کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی۔ اور مساجد کے فن تعمیر پر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑا ہے۔ تینوں سمتوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر ہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں۔ مساجد کے علاوہ خانقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایہ تخت غزنی میں ۴۰۰ھ (بمطابق ۱۰۰۹ء) میں قائم کیا۔ بقول ابوالقاسم فرشتہ "مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسہ کے اخراجات کے لئے بہت سے دیہات وقف کئے۔" محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قائم کئے اور اس کے زیر اثر دوسرے اُمرا اور ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفریں اقدام اس نے کیا اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمینؒ اور امام غزالیؒ جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے۔

اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا جال بچھ گیا۔ ان میں ایسے ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفرما تھے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تمدن میں نہیں ملتی۔ (تاریخ فرشتہ جلد۔۱)

۵۔ برعظیم میں تعلیمی روایت کا ارتقاء

برعظیم پاک وہند میں اسلام کی دعوت دور رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی۔ پھر بنو امیہ کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ایک بڑا علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی۔ اس زمانہ میں علوم کو بڑا فروغ حاصل ہو۔ اس دور کے انمٹ اثرات یہاں کی تاریخ اور تمدن پر پڑے۔ لیکن بدقسمتی سے دولت اسلامیہ کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر محمود غزنوی کے حملوں نے خیبر سے سومنات تک ایک بار پھر اسلام کا غلغلہ بلند کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز معز الدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا۔ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں حکمراں رہے اور اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشو و نما دینے کی پوری کوشش کی۔ اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی سرگرمیوں کے مطالعے سے جو اہم چیزیں سامنے آتی ہیں ہم یہاں ان کا مختصر تذکرہ کریں گے۔

(۱) تعلیم کا جو مزاج قرون اُولیٰ میں تشکیل پایا تھا یہاں بھی اس کو بڑی حد تک قائم رکھا گیا۔ تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا۔ اور اہل علم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں، علم کی اشاعت کے ذریعہ اس کی "زکوٰۃ" برابر نکالتے رہے۔

(۲) برعظیم میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا، لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے۔ ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی، لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا۔ پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں۔ اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے۔ کتب خانے محض لائبریری کی حیثیت نہ رکھتے تھے۔ بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے۔ بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔

۳۔ ایک اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ گو دینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی، لیکن دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرف نظر نہیں کیا گیا۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا۔ تجارتی تعلیم کے لئے جہاجنی اسکول تھے۔ جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ فنون سپہ گری کی تعلیم کے لئے بے شمار ادارے اور اکیڈیمیاں تھیں۔ کتابت، خطاطی، طغریٰ نویسی، فن کوزہ گری، فن تعمیر، غرض ہر ایک اہل فن کے گرد طالبان علم کا ہجوم رہتا اور وہ اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار فن کار تیار کرتے۔ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے لئے باقاعدہ مدارس اور اکیڈیمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سے نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ کہ مدارس میں جو نظام تعلیم رائج تھا، اور جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ اس میں اگر ایک طرف قرآن فقہ، منطق اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ اور طبیعیات اور علم ہندسہ اور جغرافیہ کو ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس نصاب کا مقصد مسلمان حکومت کی سول سروس تیار کرنا تھا، خصوصیت سے قضاء و عدالت کی ضروریات کی تکمیل مسلمان اپنے نظام تعلیم کے مسائل پر جس ذہن سے غور کرتے تھے اس میں جہاں یہ فکر تھی کہ ہر چیز دین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو، وہاں انہیں اس کا بھی خیال تھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو وہ پورا کر رہی ہو اور جس کام کے لئے جو علم و مہارت درکار ہے وہ فراہم کر رہی ہو۔ اس کا اندازہ اورنگ زیب عالمگیر کی اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جس میں مخاطب ملا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے:۔

"کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی خصائص سے روشناس کراتا۔ مجھے علم ہونا چاہیئے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے، ان کے آداب و اطوار، مذاہب و طرز حکومت طریق جنگ وغیرہ۔ کیا ہیں اور وہ کون سے امور ہیں جن میں یہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ضروری ہے کہ باقاعدہ تعلیمی نصاب کے ذریعے بتایا جائے کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں، اور وہ کون کون سے اسباب و عوامل اور حوادث ہیں جن کی بناء پر عظیم تبدیلیاں اور مہتم بالشان انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں"

(۴) اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ہوئی تھی آج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے۔ ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جس میں تعلیم صرف پنڈتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شودر کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑ جاتے تو اس کی پاداش میں ان کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈالا جاتا تھا۔ ہر طرف تعلیم و تعلم کا چرچا تھا اور پورا ملک علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا سنہ ۷۵۲ھ بمطابق ۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانے کے بارے میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقریزی کی روایت ہے :

" سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا۔ مدرسین کے لئے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں۔ تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ہوتیں۔ مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔

صبح الاعشیٰ کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدارس جاری تھے۔ پھر یہ مدارس معمولی قسم کے مدارس نہ تھے بلکہ ان میں ایسے ایسے مدارس بھی تھے جو آج کی یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ عظیم الشان تھے۔ مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کا یہ قول قابل نقل ہے کہ :

" دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ مصارف کے لئے شاہی ظائف مقرر ہیں۔ پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع و محل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مدرسے کی عمارت بہت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع ہے۔ ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء و فضلاء یہاں موجود رہتے ہیں۔ طلبہ و اساتذہ کے مکانات بنے ہوئے ہیں اور وہ باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ اپنے مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں۔"

عہد عالمگیری کا مشہور مغربی کپتان الیگزنڈر ہملٹن اپنے سفرنامۂ سندھ میں صرف ایک شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے تھے۔ یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں، ہر شہر کی تھی، ایک علاقے کی نہیں ہر علاقے کی تھی اور ایک دور کی نہیں مسلمانوں کے پورے دور حکمرانی کی تھی۔ مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا۔ اس کی سہولتیں شہر شہر، قصبہ قصبہ، دیہات دیہات، محلہ محلہ، گھر گھر پہنچی ہوئی تھیں۔ اور اس سے بدرجہا بہتر حالت تھی جسے آج کے ماہرین ہمہ رس تعلیم (UNIVERSAL EDUCATION) کہتے ہیں۔

(۵) مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خالص عوامی تھا۔ حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لئے کثیر روپیہ خرچ کرتی تھیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا۔ کوئی ایک محکمہ ایسا نہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف سے نگرانی رکھتا ہو۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں "صدر الصدور" کے ایک عہدے کا نام ضرور ملتا ہے۔ اس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی نگرانی تھا لیکن صرف اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات پوری ہوں۔ مدرسوں کی آزاد فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ یہ نصاب تعلیم کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔ اس شعبے کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اچھے باصلاحیت نوجوان نظر آئیں ان کو فتاویٰ اور قضاء کی ذمہ داریوں کے لئے منتخب کرے مسلمانوں نے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو حکومت کے تابع نہیں کیا۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لئے آزاد تھا، حتیٰ کہ وہ مدارس جو صرف سرکاری خزانے سے قائم ہوتے تھے وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے۔ اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی تو اُسے اس کی صحت اور علمی برتری کی بناء پر تو قبول عام حاصل ہوا لیکن ریاست کی قوت کے ذریعے اسے مسلط نہیں کیا گیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی۔ اس آزادی کے باوجود اس طرح کی فطری یگانگت کی مثال بھی دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

(مسلمانوں کی قدیم درس گاہیں)

یونانیوں میں آزادی تھی مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی ورزش بنا دیا تھا۔ چین میں تعلیم پر خاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ ہندو تہذیب میں عمومی تعلیم کا تصور ہی نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قائم کیا، جس میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم وضبط کو قائم رکھنے والی قوت اخلاق کی قوت تھی۔ یہ ایک عجیب وغریب تجربہ تھا، جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج، اکرام انسانیت اور فرد کی آزادی کا اسلامی تصور، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اسلام کی قائم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے۔ جس سے دنیا کے دوسرے نظام آشنا نہیں۔

(۶) ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا عالم یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیجئے جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوقی کے جواب میں کہا تھا۔ ہوا یوں کہ شاہ کو ایک موقعہ پر تعلیم پر غیر معمولی اخراجات سے کچھ تشویش ہوئی اس نے کہا کہ اس زرکثیر سے تو ایک لشکر جرار تیار ہو سکتا ہے۔ نظام الملک نے کہا کہ "اے بادشاہ تیری فوج کے تیر تو فقط چند قدم پر کام دے سکتے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمانے کے سارے طول و عرض میں مؤثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سپر سے بھی نہیں رک سکتے۔" ارباب حکومت تعلیم کو ایک تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ یہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لئے ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

قطب الدین ایبک سے بلبن تک جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قائم کئے اور مساجد تعمیر کرائیں۔ فیروز تغلق کے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ تنکہ (جو روپے کے برابر تھا)[1] وظائف وغیرہ کے لئے تھا لیکن اس کا تقریباً ۲۵ فی صد یعنی ۳۶ لاکھ تنکہ صرف تعلیم کے فروغ کے لئے استعمال ہوتا تھا اس نے ۳۰ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچہ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا۔

بہمنی اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم پر کثیر رقوم خرچ کر رہی تھیں مغل بادشاہوں میں علم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول مصنف تاریخ جان جہان "اس نے اُن مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا جو تیس تیس سال سے پڑے تھے اور پرندوں اور جانوروں کی رہائش بن چکے تھے اور ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا۔" جہانگیر نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول۔ ایچ۔ جی کین (H. G. KEANE) "اس نے لاتعداد اسکول اور کالج قائم کئے۔" محمد شاہ بھی جسے تاریخ "رنگیلا" کے نام سے جانتی ہے تعلیم پر بے دریغ خرچ کرتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دارالعلوم اسی کی علمی فیاضیوں کا مرہون منت تھا۔

یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال۔ اسی روش پر مسلمان امراء، اعیانِ حکومت، زمیندار، جاگیردار اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی اسی صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"پورے صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصے میں پانچ پانچ کوس، زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفا اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں، اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں۔ انہوں نے طلبِ علم کا ایک جذبہ

---

[1] واضح رہے کہ اُس زمانے کے تنکہ کی قوت خرید موجودہ روپیہ کی قوت خرید سے تقریباً تیس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

و ولولہ پیدا کر رکھا ہے۔ طلبہ گروہ در گروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں اور جہاں موقعہ دیکھتے ہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر بستی کے اہل توفیق ان طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ شمار کرتے ہیں۔ صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ کا قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست"۔

(۷) ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔

پاک و ہند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبا کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا اور جیب خرچ کے لئے غریب طلبہ کو سرکاری ذرائع سے اور امراء کی طرف سے وظائف دیئے جاتے ہیں۔ کچھ مدرسے تو ایسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔ مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو طالب علموں کی رہائش کے کام آتے تھے۔

(۸) اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد و شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ تعلیم کے محور استاد تھے اور ان کی حیثیت معلم اور مربی کی تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ان کے ایثار و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کیسے کیسے نمونے تیار کر سکتا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند کے اس فقرہ سے کیجئے:

"پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے"۔

(ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے۔)

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ملک العلما مولانا عبد العلی بحر العلوم کو منشی صدر الدین نے بہار (بردوان) آنے کی تکلیف دی اور گراں قدر تنخواہ کی پیش کش کی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ میرے ساتھ ۱۰۰ طلبہ ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو میں نہیں آسکتا۔ پھر طلبا کا حال بھی یہ تھا کہ اپنے اساتذہ سے بے حد محبت کرتے تھے اور سعادت مندی، روحانی انبساط اور قلبی وابستگی کی آخری حدوں کو چھو جاتے تھے۔

(۹) اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے۔ اور انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں۔ اگر اس معاشرے میں تقویٰ، ایفائے عہد، عصمت و عفت، ایثار و قربانی، صلۂ رحمی، اخلاق و مروت اور ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی تھی۔

(۱۰) اس دور کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں جمود نہ تھا۔ یہ نظام نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض حجروں کی زینت نہ تھے، بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانش مندی کے ساتھ چلا رہے تھے۔ اگر درخت کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جا سکتا ہے جنہیں اس نے تیار کیا اور جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا۔

(مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت،
مولانا مناظر احسن گیلانی)

سوالات متعلقہ باب چہارم

(۱) قرآن کریم کی جمع و تدوین اور حفاظت پر ایک جامع مقالہ قلمبند کیجئے۔
(۲) حدیث نبوی کی حجیت و اہمیت دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیجئے۔
(۳) اخلاق و ایمان کے باہمی تعلق پر ایک شذرہ تحریر کیجئے۔
(۴) تعمیر سیرت کے اسلامی اصول کیا ہیں اور رسول کریمؐ نے کس طرح صحابہ کی تربیت فرمائی۔
(۵) اسلام کے نظام معاشرت پر ایک جامع مقالہ تحریر کیجئے۔
(۶) اسلام کا نظام قانون و عدل کیا ہے دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے۔
(۷) اسلام کے نظریۂ تعلیم پر مفصل بحث کیجئے۔
(۸) تعلیم کے اسلامی اصول کیا ہیں؟ تفصیلاً تحریر کیجئے۔
(۹) مسلمانوں کی تعلیمی روایات پر ایک جامع مقالہ لکھئے۔
(۱۰) تعلیم کا مقصد کیا ہے اور بے مقصد تعلیم سے کیا نقصان پہنچتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

(۱) ۔ اِسلام کے مَعاشی اصول

(۲) ۔ کفالتِ عامّہ

(۳) ۔ اُمّتِ مُسلمہ

(۴) ۔ اِسلامی ریاست کی ضرورت

(۵) ۔ اِسلام کے اصولِ حکمرانی

(۶) ۔ قیامِ پاکستان کے محرّکات

(۷) ۔ تاریخ تحریکِ پاکستان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

باب پنجم

۱۔ اسلام کے معاشی اصول

۱۔ تصورِ معیشت

آج کی دنیا میں معاشیات کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ یہ اہمیت صرف اس احساس کی پیداوار نہیں ہے کہ ایک فرد کے لئے معاشی آزادی کے بغیر سیاسی اور معاشرتی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرے کے لئے معاشی انصاف کے بغیر سکون، سلامتی اور یک جہتی کا حصول ناممکن رہتا ہے اور قوموں کے لئے معاشی استحکام کے بغیر سیاسی آزادی کو بھی برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے۔ بلکہ انسان اس حقیقت کے شعور پر بھی بے چین اور مضطرب ہے کہ دنیا میں دولت کی فراوانی، وسائل پیداوار کی محیر العقول ترقی اور بے مثال معاشی ارتقاء کے باوجود غربت، افلاس، بے روزگاری اور معاشی اور معاشرتی ظلم کا دور دورہ ہے۔ آج بھی انسانی آبادی کا ساٹھ فیصدی حصہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ افلاس و نکبت اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو روٹی ہے نہ بدن کو چھپانے کو لباس، اور نہ سر ڈھانپنے کو معقول مسکن! ۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور تمام ترقی کے باوجود ہم مجموعی خوش حالی سے کیوں محروم ہیں؟ معاشی ترقی انسان کیلئے فوز و فلاح کا باعث کیوں نہیں ہوئی؟ جب ہم ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں لازماً معاشی نظام کے مسئلے پر اور ان اصولوں پر، جن کی بنیاد پر معاشی زندگی کو مرتب کیا جاتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیں بحیثیت ایک ملک کے درپیش ہے، مسلمانوں کو پوری دنیا میں بہ حیثیت ایک ملت کے بھی اس سے سابقہ ہے اور پھر پوری انسانیت بھی اس مسئلے سے دوچار ہے۔ اس لئے ہم مسلمان دنیا کی، جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہے، مثال کو سامنے رکھ کر پہلے تو نوعیت مسئلہ کو واضح کریں گے اور پھر اسلام کے اصولوں پر گفتگو کریں گے۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آج کے انسان کا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی کا حصول یا پیداوار میں اضافہ ہے۔ بلاشبہ صنعتی ترقی اور معاشی پیداوار میں اضافہ بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ پورے معاشی نظام کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود معاشی ترقی کا انحصار بھی اس مجموعی نظام پر ہے جس کی آغوش میں یہ پروان چڑھتی ہے۔ نظام سے ہٹ کر ترقی کا کوئی تصور مشکل ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

معاشی ترقی اور خوش حالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ محض پیداوار میں اضافہ ہو جائے معاشی خوش حالی کا اصل مفہوم ایک بہتر اور خوشحال معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے۔ پروفیسر ڈی۔ اے۔ ڈیمنٹ کے الفاظ میں "صنعتی ترقی اُسی معاشرے کی خوش حالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو۔ اس کے باوجود ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ کر خوش حالی کی رو ماند پڑ جاتی ہے، افراد کے فطری تعلقات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور معیار زندگی بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتا ہے"۔ ایک صحت مند نظام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشی سرگرمیوں کو مناسب حدود اور تعمیری انداز میں روبہ عمل آنے کا موقع دے لیکن اس امر پر بھی نگاہ رکھے کہ یہ سرگرمیاں زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کے لئے نقصان دہ نہ بننے پائیں۔

یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیئے کہ "حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو، انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات اس طور پر نئے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی بھی معاشی یا مالی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے" اور نہ ہی انہیں پیداوار کے اعداد و شمار سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ پس ہمارا اصل کام یہ نہیں ہے کہ ہم جزوی اور نامکمل تبدیلیاں عمل میں لے آئیں۔ ہمارا اصل کام پورے نظام کی اصلاح و تبدیلی ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ حقیقت پسندانہ، انقلابی اور تخلیقی ہونا چاہیئے۔ اور اسی طرح ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ای۔ ڈی۔ ڈومر کے الفاظ ہیں "معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترقی کے کسی بھی تشریحی نظریے کو اپنے اندر معاشرے کے طبعی ماحول، سیاسی ڈھانچے، ترغیبات، تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیئے نیز اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس، معاشرتی تبدیلیوں اور ارتکاز دولت کے بارے میں رویہ کیا ہے؟"

یہ سمجھنا کسی پہلو سے بھی دانشمندانہ نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسی معاشی ترقی حاصل کی جائے جو صحیح سمت ہو تیز رفتار ہو، صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور صحیح نتائج بھی نکالے۔ اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ پورے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں نہ لائی جائیں۔ سامراجی دور کے فرسودہ معاشرتی اور اخلاقی تصورات کے مقابلے میں صحت مند تصورات ملک کے سامنے نہ رکھے جائیں، معاشی پالیسیوں کو بنیادی انسانی اقدار کی اساس پر استوار نہ کیا جائے۔ آجر اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مستاجر، محنت اور سرمائے، اور زمیندار اور کاشت کار کے درمیان اُن اقدار کی روشنی میں از سر نو تعلقات قائم نہ کئے جائیں جو ہمارے بنیادی نظریۂ حیات کا عطیہ ہیں۔ مندرجہ بالا تجربے سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں :

(ا) معاشی ترقی صرف بہتر معاشی نظام ہی میں ممکن ہے۔

(ب) پس ماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور ترقی کا باعث بننے کے بجائے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے حقیقی معاشی ترقی کی توقع عبث ہے۔

(ج) اس طرح ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس معاشی نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسے نظام کی بنا ڈالیں جو ہماری ضروریات کو پورا کر سکے اور جو ہمارے تمدن، ہماری اقدار حیات اور ہمارے نظریۂ زندگی کے مطابق ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیا نظام کیسا ہو؟ ہماری یہ ضرورت اسلامی نظام معیشت ہی پوری کر سکتا ہے اور ہم آئندہ صفحات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے اور یہ بتائیں گے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لئے کیا اصول دیئے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو عام فہم انداز میں بیان کریں۔ ان کو معاشیات کی اصطلاحی زبان میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لئے اصطلاحی زبان کے مقابلے میں عام انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

۲۔ پیدائش اور صرفِ دولت کے اصول

اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے وہ مختصراً مندرجۂ ذیل اصولوں پر مشتمل ہے۔

ا۔ معاشیات اور اخلاق و مذہب :۔ سب سے پہلے وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور "تجارت تو بس تجارت ہے!" قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ

مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو۔ اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لئے بہتر ہے۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (الجمعہ ۔ ۹ ۔ ۱۰)	اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر کثرت کے ساتھ کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو اور ان مقاصد کی تحصیل کے لئے استدلال کرے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے اسلام نے مقرر کئے ہیں، مسلمان اپنی معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کا پابند اور ان اخلاقی ضابطوں کا احترام کرنے والا ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عائد کئے ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ:

"رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" (النور ۔ ۳۷)	وہ لوگ جنہیں خرید و فروخت اور تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

خدا کے ذکر کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں وہ خدا کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ لکھنے اور صحیح گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطۂ نظر ہے جو اسلام دیتا ہے اور جس کی بنیاد معاشیات اور اخلاق کے ہم آہنگی پر ہے۔ اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز (APPROACH) اخلاقیاتی اور قدر شناسانہ (NORMATIVE) ہے۔

۲۔ معاشی جدّ و جہد اور اس کا مقصد و مقام: اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کے لئے فارغ البالی کے حصول کے لئے زیادہ سے زیادہ جدّ و جہد کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (MAXIMISATION OF PRODUCTION) پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں اصل اہمیت نفع کی تکثیر اور خدا کے بندوں کے لئے سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

"وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ۭ" (الاعراف ۔ ۱۰)	اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لئے سامان معاش پیدا کئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

"اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً"
(لقمان - ۲۰)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت معاشی جدّ و جہد اور حصولِ رزق کی کوشش پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لئے سرگرم عمل کر دیا ہے۔

(ا) بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سخت وعید سنائی گئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو زیب نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، اور رزق کی تلاش نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ "اللہ مجھے رزق عطا فرما" تم کو (دعا کے ساتھ) اس کے لئے جدّ و جہد بھی کرنی چاہیئے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں۔ (المدینۃ والسلام بحوالہ اساس تہذیب)

ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لئے کام کرنا بہتر ہے سے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لئے ہوئے آؤ۔ (ابوداؤد)

(ب) پھر مثبت طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو (کنز العمال) ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت غناء اور فراغ دستی ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔
(کنوز الحقائق)

اور خود قرآن پاک میں اللہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا
(القصص - ۷۷)

اور دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اُسے بھول نہ جاؤ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کسب حلال" کو فریضہ بعد الفریضہ، یعنی نماز کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے۔ اسلام کے نقطۂ نظر پر ایک واقعے سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو دیکھا جو خستہ حال تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن سے پوچھا، تمہارے پاس کچھ ہے؟ اُنہوں نے بتایا دو درہم ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان میں سے ایک درہم کی کلہاڑی خرید دی اور لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

محنت کرکے رزق حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"صنعت وحرفت کے ذریعے روزی کی تکمیل انسان پر فرض (کفایہ) ہے"

"بعض گناہوں کا کفارہ روزی کمانے میں مغموم ومتفکر رہنا ہے"۔

اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

"جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اٹھے گا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا"۔

(ابونعیم فی الحلیۃ بحوالہ اساس تہذیب)

ان آیات و احادیث سے محنت اور معاشی جدّوجہد کی اہمیت ہمارے سامنے آتی ہے اور انہی کی روشنی میں پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو تقویت دینے کی پالیسی اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو قرار پاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدّوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ (ایسا فرض جو لازم تو ہر شخص پر ہو البتہ اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو سب پر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو مواخذہ ہر فرد سے ہوگا) قرار دیا ہے۔ رد المختار میں ہے کہ

ومن فروض الکفایۃ الصناعۃ المحتاج الیھا (ردّ المختار ج ۱ ص ۳۲)	ضروری صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے۔

اسی طرح المنہاج میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ:

ومن فروض الکفایۃ الحرف والصنائع وما یتم بہ المعاش (المنہاج ج ۷، ص ۱۹۴)	فرض کفایہ میں صنعت وحرفت اور وہ تمام چیزیں جو معاش کی تکمیل کے لئے درکار ہیں شامل ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں مختلف فقہاء کا جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ المحبتہ فی الاسلام میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

قال غیر واحد من الفقہاء ومن اصحاب الشافعی واحمد بن حنبل وغیرھم کابی حامد الغزالی وابی الفرج الجوزی وغیرھم ان ھٰذہ	بہت سے فقہاء نے جن کا تعلق شافعی، حنبلی فکر سے ہے نیز دوسرے فقہاء جیسے امام غزالی اور امام جوزی وغیرہ نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان معاشات من حيث هي هي على الكفاية فانه لا يتم المعاش الا بها كما ان الجهاد فرض على الكفاية۔

صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے اس لئے کہ معاش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے اور (فرض کفایہ) کی حیثیت (ایسی ہی ہے جیسے) جہاد کی ہے وہ فرض کفایہ ہے۔

امام ابن تیمیہ کی روشنی میں یہ مثال بڑی اہم ہے۔ معاش کی تکمیل انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے اور اس طرح انسانیت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسے منکر سے بچانے، طاغوت کے غلبے سے نجات دلانے اور حقیقی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرنے کے لئے۔ یعنی انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اسی طرح انسانیت کی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صنعت و حرفت کا قیام اور وسائل معاش کی فراہمی ضروری ہے۔ اور ان دونوں کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

یہ وہ اہمیت ہے جو اسلام معاشی جد و جہد کو دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لئے معاشی سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت نے جو وسائل ودیعت کئے ہیں ان کو ترقی دی جائے، پیداوار کو امکانی حد تک بڑھایا جائے اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میں اس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔ اسے علم معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کی تکثیر اور وسائل پیداوار کی بہترین تقسیم کہا جا سکتا ہے۔

غربت کے انسداد کا مسئلہ بھی اسلام کی معاشی پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جد و جہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا سب سے اہم مقصد کفر کا استیصال ہے اور چوں کہ فقر و فاقہ انسان کو کفر کی طرف لے جاتے ہیں اس لئے اسلام ان کو اپنا بنیادی ہدف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لئے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے، اور کھانے کے لئے روٹی اور پینے کے لئے پانی ہو۔ (ترمذی)

اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے مواقع دے اور پھر مثبت طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے غربت و افلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع قرار دیتا ہے اور محض غربت، افلاس، معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واویلے سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلے کا اصل حل معیشت کو فروغ دینا ہے، انسان کی قطع و برید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

" وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

(بنی اسرائیل - ۳۱)

اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافۂ پیداوار کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

"رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں۔"

(کنوز الحقائق)

"عورت کو گھر میں خالی بیٹھے رہنے کی جگہ چرخہ کاتنا اچھی کمائی کا مشغلہ ہے۔"

(کنوز الحقائق)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں تاکہ فراغت حاصل کریں۔" (ابن ماجہ)

اس طرح اسلام ہر فرد اور پوری قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قائم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت و افلاس کا خاتمہ کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے مختلف ہے۔

۳۔ حلال و حرام کی تمیز: اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوشش ہوگی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے گا جو حرام ہیں اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا۔ (البقرہ۔ ۱۶۸)

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے"۔ (المدینۃ والاسلام)

"حلال روزی کا طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بہادری سے لڑنا اور جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرکے تھک کر سو جائے تو خدا اس سے راضی ہے۔" (المدینۃ والاسلام)

اور حرام سے کمائی ہوئی روزی کے متعلق فرمایا:

"حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آگ میں ڈالا جائے"۔

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل ناآشنا ہے چوں کہ اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا منصفانہ اور مصلحانہ استعمال ہے اس لئے اس نے معاشی جدوجہد کو حلال و حرام کا پابند کیا ہے۔ خالص معاشی نقطۂ نظر سے یہ وہ چیز ہے جو معاشیات کو محض افادی سطح سے بلند کرکے اصلاحی اور فلاحی سطح پر لے آتی ہے اور اس طرح ایک کی معاشی جدوجہد دوسرے کے لئے معاشی تکلیف یا معاشرہ کے لئے ظلم فساد کا ذریعہ نہیں بن پاتی۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے، اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد یا معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے درمیان حقیقی معاشی تعاون، مساوات، آزادی جدوجہد، عدل و انصاف اور قسط و توازن کا قیام مشکل کر دیتی ہیں۔ خالص معاشی اصطلاح میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی معیشت میں صرف کی تکثیر (MAXIMISATION OF CONSUMPTION) کی جگہ اس کی بہترین سطح کا حصول (OPTIMISATION) پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی معیشت ظہور میں آتی ہے۔

۴۔ **حرمت سود**:۔ اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے ایک حرمت سود ہے۔ جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے سود مفرد ہو یا مرکب، ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے، اور اس کے لینے والے کو

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران۔ ۱۳۰)

اے ایمان والو! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، سود کا کاغذ لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور ان سب کو برابر قرار دیا ہے۔ (صحیح مسلم) اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں ہی پر نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضمرات کی بنا پر بھی ہے۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدّ و جہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

۵۔ تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ۔ اسلام نے تجارتی اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا ہے تاکہ اہل تجارت اس کا اتباع کریں۔ یہ ضابطۂ اخلاق تجارتی لین دین میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے۔ تجارت کے معاملے میں قرآن کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ" (النساء۔ ۲۹)

اے ایمان والو! اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔

اس آیت ربانی کے ذریعے قرآن کریم نے معیشت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع قرار دیا ہے جو ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں۔ معیشت اور تجارت کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان نے نت نئے ظلم کئے ہیں اور خصوصیت سے اہل سرمایہ اور اہل قوت نے دوسرے فریق پر جو کمزور اور غریب ہو اکثر اپنی مرضی مسلط کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انتفاع (EXPLOITATION) کے یہ سارے دروازے بند کر دیئے اور فرمایا کہ معاشی معاملات کی بنیاد باہمی رضامندی اور تجارت کے حصول پر ہونی چاہیئے۔ تجارت میں امانت و دیانت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی اہمیت واضح کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"امانت دار تاجروں کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی)

مختصراً اسلام کے اصول تجارت حسب ذیل ہیں :-

(ا) باہمی رضامندی: تجارت باہمی رضامندی سے ہونی چاہیئے۔ دونوں فریق اپنی آزاد مرضی سے کسی جبر یا زبردستی کے بغیر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تجارت کی بنیاد "تعاون باہمی" پر ہے اور تجارت کی وہ تمام شکلیں جن میں دوسرے فریق کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر کچھ خاص شرائط یا معاملات اس پر تھوپ دیئے جاتے ہیں، وہ ناجائز ہیں۔ اس سے بھی یہ مستنبط ہو سکتا ہے کہ ایسی اشتہار بازی یا نفسیاتی حربوں کا ایسا استعمال جو عقل و فکر کو معطل کر دے اور ایک شخص اپنی مرضی کے خلاف محض نفسیاتی شعبدہ بازی کی وجہ سے کسی چیز کی خرید پر مجبور ہو جائے، اسلام کے مطابق نہیں۔ اسی طرح آزاد منڈی کو کمزور یا مفلوج کرنے والی وہ تمام قوتیں بھی اسلامی معیشت میں کوئی راہ نہیں پاتیں جن کی وجہ سے جدید دنیا کا منڈی کا نظام درہم برہم ہے اور شدید قسم کی دقتوں اور خامیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

(ب) دیانت: دوسرا اصول یہ ہے کہ تجارت دیانت کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا بدمعاملگی نہ ہو۔ مال کی اصل کیفیت لوگوں کے سامنے رکھ دی جائے۔ اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر خرید پر مجبور نہ کیا۔ اسی طرح جان بوجھ کر دوسرے کو نقصان پہنچانا، معاملے پر معاملہ کرنا، خیانت یا وعدہ خلافی کرنا، یہ سب اسلام کی نگاہ میں ممنوع ہیں۔ اسی طرح تاپ تول میں درست ہونا تجارتی دیانت کا ایک اہم پہلو ہے۔

(ج) جائز اور مباح کی تجارت: تیسرا اصول یہ ہے کہ تجارت صرف ان اشیاء میں کی جائے جو جائز یا مباح ہوں۔ وہ تمام اشیاء جن کا استعمال معصیت کی تعریف میں آتا ہے، یعنی شراب، بت، اصنام، خنزیر، وغیرہ، ان کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے۔

(د) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت: پھر اسلام میں اس بات کی بھی ممانعت ہے کہ ضروریات زندگی کو روک رکھا جائے تاکہ ان کے دام بڑھ جائیں اور اس طرح سے منافع میں اضافہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو اسلام نے سختی سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔

(ھ) جوا اور سٹہ وغیرہ کی ممانعت: اسلام نے تجارت کی وہ تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شکلیں بھی بند کر دی ہیں جن میں کسی دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہو یا جن میں مناسب محنت کئے بغیر دولت ہاتھ آ رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سٹہ، لاٹری اور جوئے کی ساری صورتیں اسلام میں ممنوع ہیں۔

(و) اہل تجارت کا ذاتی اخلاق: اسلام کی تمام تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل تجارت میں اعلیٰ اخلاقی کردار ہونا چاہیئے تاکہ وہ تجارت کا حق ادا کر سکیں اور اسلام کے سچے سفیر بن سکیں۔ ان میں خصوصیت سے دیانت اور خوش اخلاقی ہونی چاہیئے تاکہ یہ کیفیت نہ ہو کہ:

ع کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

اُنہیں قوم اور خصوصیت سے اپنے صارفین کی خدمت کے جذبے سے کام کرنا چاہیئے اور اپنے کاروبار میں پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرنا چاہیئے تاکہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید مقاصد کے لئے استعمال کر سکیں پھر سب سے بڑھ کر وہ مستقل مزاجی اور اعتدال کے ساتھ کام کریں اور بہت جلدی دولت جمع کرنے کی ہوس سے بچے رہیں۔

معاش اور اخلاق میں یہی وہ حسین توازن ہے جو اسلام کے معاشی نظام کا امتیاز ہے۔

۶۔ اسراف کی بندش: طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اسراف سے روکتا ہے اس وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاع رک جاتا ہے اور وہ تعمیری اور پیداواری مقاصد میں استعمال ہونے لگتی ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف-۳۱) | کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان دکھانے کے لئے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔

۷۔ ارتکاز دولت کی مُمانعت: پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز (ایک یا چند مقامات پر اس کا جمع ہونا) کو بھی پسند نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرے میں گردش کرے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر-۷) | ایسا نہ ہو کہ یہ (مال و دولت) تمہارے دولتمندوں ہی میں گردش کرتا رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضور کا ارشاد ہے کہ :

اقسموا المال بین الفرائض علیٰ کتاب اللہ (ابوداؤد)	اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اچھا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کیا گیا ہے۔

دولت کی تقسیم کے لئے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں :

(الف) **زکوٰۃ** :۔ زکوٰۃ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقراء و مساکین کا "حق" ہے۔

زکوٰۃ جہاں حبِ مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ وہیں معاشی نقطۂ نظر سے یہ سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے۔ جس کے ذریعے ملک و ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدّوجہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اسی ہی کے لئے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اُسے فنا ہو جانا چاہیئے۔ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں۔ نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے سے تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اُسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے ناداروں کو سہارا نہ دے اور گرتوں کو تھام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے۔

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے پہلے ہی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکوٰۃ کی شکل میں معاشرے کے کمزور اور مجبور انسانوں کی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دی۔ اسلامی حکومت نے ابتداء ہی سے اس نظام کو عملاً قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ضرورت مندوں کو سرکاری وظیفے دیئے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکوٰۃ دینے والے تو سینکڑوں تھے، مگر زکوٰۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔

پھر زکوٰۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ذریعے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکوٰۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر، سرمایہ کاری اور قوتِ صرف میں عدم توازن کی بناء پر رونما ہوتا ہے لیکن زکوٰۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوتِ خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا آلہ بن جاتی ہے۔

(ب) **صدقات واجبہ**: بہت سے ایسے صدقات مقرر کئے گئے ہیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ہوتے ہیں جیسے صدقۂ فطر وغیرہ۔ یہ بھی مندرجہ بالا مقصد پورا کرتے ہیں۔

(ج) **انفاق**: اسلام ہر مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

(د) **قانونِ وراثت**: اسلام نے وراثت کا جو قانون تجویز کیا ہے وہ اس طرح کا ہے کہ متوفی کا ترکہ پورے خاندان میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ تقسیم ہو جاتا ہے اور ساری جائداد مغربی ممالک کی طرح کسی ایک وارث کو نہیں ملتی۔ اس طرح دولت کے ارتکاز کے بجائے اس کی منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے۔

(ذ) **حق سوی الزکوٰۃ**: زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بطور ٹیکس لے اور اسے استحکام ریاست، قیام انصاف اور فلاح عامہ کے لئے صرف کرے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "بے شک مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی حق ہے۔" (ترمذی)

(ح) **الانفاق**: اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اسے خدا کی راہ میں اور دوسرے لوگوں کی بہتری کے لئے خرچ کر دے۔

يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ ۖ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲۱۹)

[illegible] طرح اسلام پورے معاشرے میں دولت [illegible] کی پالیسی کے دو بنیادی اصول فروغ پیدا [illegible] سے کسی [illegible]

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۸۔ ملکیت و تصرّف کا حق:۔ اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصوّر کے تحت، انفرادی ملکیت و تصوّر کا حق دیتا ہے یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلۂ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے۔ دراصل اسلام ملکیت کے اس محدود حق کو ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرّف کے اختیار کو بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے محدود کرتا ہے۔

۹۔ عدل اجتماعی کی ضمانت۔ اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اوّلین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ زکوٰۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے۔ معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرتی ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں، اس کی ریاست ولی ہے۔ ناداروں، اپاہجوں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی من لا ولی لہ (بخاری)	حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) جس کا کوئی ولی نہ ہو۔

ایک اور حدیث میں ہے، من ترک کلا فالینا (بخاری: مسلم) یعنی جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

ایک خلیفۂ راشد نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں حصہ پہنچے گا اور اس کے لئے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔"

اور یہ کہا:

"خدا کی قسم اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لئے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔"

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

حضرت علیؓ نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لئے کافی ہو سکے۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے ضروری قرار دیا ہے کہ ان اُمراء سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا۔"

ان احکام کے مطابق جو نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اُگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگدستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ لئے لئے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے۔" (یعنی اس کا حاجت مند ہو۔)

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام ــ اور درحقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے ــ وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اوّلین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۲۔ کفالتِ عامّہ

اسلامی ریاست کی معاشی ذمّہ داریاں

اسلامی ریاست کی معاشی ذمّہ داریوں میں کفالت عامّہ، معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے۔ اب مختصراً ان موضوعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ کفالتِ عامّہ

کفالتِ عامّہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیئے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمّہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ یا ضروری مقداریں بہم پہنچاتی رہے، بلا لحاظ اس کے کہ وہ خود اپنے مال سے، یا اپنی محنت کے ذریعے مال کما کر ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے بل بوتے پر پورا کرتے رہیں گے۔ بقدر ضرورت مال حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام افراد اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری، مرض، بڑھاپے یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جانے کی حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے امدادی وظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جا سکتا ہے جو ان کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔

سماجی تحفظ (SOCIAL SECURITY) کے انتظامات کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصول کا منشا یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بالآخر اسلامی ریاست اس بات کی ذمّہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لئے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسے انتظام قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کرکے بآسانی اور بلا تاخیر سرکاری خزانے سے بقدرِ ضرورت مال حاصل کرسکیں اور دارالاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا، پیاسا، ننگا، بے گھر اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔

رسول کریمؐ کے ارشادات: ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول واضح فرما دیا ہے کہ اصحابِ امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمّہ دار ہیں۔

آپؐ نے فرمایا:

"جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ رہا، اللہ تعالیٰ بھی اُس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔" راوی کہتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سن کر ایک آدمی کو عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مامور کر دیا۔ (ابوداؤد کتاب الخراج والفیٔ)

عمرو بن مُرّہ نے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ "جو حاکم ضرورت مندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ اللہ اُس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔" (ترمذی کتاب الاحکام)

اس حدیث سے واضح ہوا کہ اگر حاکم ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لئے کافی ہے کہ تکمیل ضروریات کو اسلامی ریاست کی ذمّہ داری قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس فرمانِ نبوی کے ذریعہ اُن کی ذمّہ داری یاد دلائی گئی تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ اس کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔ اسلامی ریاست کی اس ذمّہ داری کی اہمیّت کا اندازہ، خلافت کی اس تعریف سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ جسے سُن کر کعب اَحبار رضی اللہ عنہ نے اس کی تصویب فرمائی:

"حضرت سلمان فارسیؓ فرماتے ہیں کہ خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سن کر کعب احبار رضی اللہ عنہ نے کہا درست ہے۔" (کتاب الاموال ابوعبید ص ۶)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اُس کی خیر خواہی نہ برتی وہ جنّت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔" (صحیح بخاری کتاب الاحکام)

شریعت نے اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا سرپرست قرار دیا ہے۔ اس کی سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ مَوْلٰی مَنْ لَّا مَوْلٰی لَہٗ۔ (ترمذی۔ ابواب الفرائض)

(جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول ہے۔

نیز فرمایا:

"اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَّا وَلِیَّ لَہٗ" (ترمذی باب النکاح)

(جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اُس کا سرپرست سلطان ہے)

۲۔ خلفاء کا طرزِ عمل

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو اکابر اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے انہیں اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا احساس تھا۔ اس حقیقت پر خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔ جناب فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام خطبہ میں فرمایا تھا:

"اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰہَ کَلَّفَنِیْ اَنْ اَصْرِفَ عَنْہُ الدُّعَاءَ" (قواعد الاحکام فی مصالح الانام ج ۱ ص ۴۳)

لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اُس کے حضور جانے والی دعاؤں کو روکوں)

حضرت عمرؓ کے اس ارشاد کی تشریح کرتے ہوئے مشہور شافعی فقیہ ابو محمد عزّ الدین عبدالعزیز لکھتے ہیں:۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ حاکم ظالموں کے مقابلہ میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات پوری کرے تاکہ اُن کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ ربّ العالمین سے اُن کی تکمیل کے طالب ہوں۔" (حوالہ مذکورہ بالا)

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا حضرت عمرؓ کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا:۔

"مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ یہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کر دوں جب تک ہم سب مل کر اُسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعے گذر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکتے کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے لیکن میں یہ بات تمہیں عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنا کر رکھوں۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ حکومت کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ تمہاری

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

چیز سمجھ کر تمہاری طرف واپس کر دوں اور تمہاری خدمت کے لئے تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا۔ اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلتے اور اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعہ میرا انجام خراب ہوگا۔ میں دنیا میں کچھ عرصہ خوشی مناؤں گا، مگر آخرت میں عرصۂ دراز تک غمگین رہوں گا۔ میرا یہ حال ہوگا کہ نہ کوئی مجھ سے کچھ کہنے والا ہوگا، نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں۔" (البدایہ والنہایہ ابن کثیر ج ۷ ص ۴۶)

جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو آپ کفالت عامّہ کی ذمّہ داری محسوس کر کے رونے لگے۔ اُن کی بیوی فاطمہ کہتی ہیں کہ میں ایک بار آپ کے پاس گئی۔ آپ جائے نماز پر تھے اور آنسوؤں سے آپ کی داڑھی تر تھی۔ میں نے پوچھا کیا کوئی نئی بات ہو گئی ہے؟ آپ نے فرمایا میں نے پوری امت محمدیہ کی ذمّہ داری لے لی ہے۔ لہٰذا میں بھوکے فقیروں، بے سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، بہت بوڑھے افراد اور اُن تمام لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو کثیر العیال ہیں مگر مالدار نہیں ہیں مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے دن اللہ مجھ سے ان کے بارے میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ مجھے ڈر لگا کہ جرح میں میری بات ثابت نہ ہو سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔

(کتاب الخراج ص ۱۰۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز بن جوزی ص ۱۸۹)

حضرت عمر فاروق نے اعلان فرمایا:

"ومن اراد ان یسئل عن المال فلیاتنی فانّ اللہ جعلنی خازنًا وقاسمًا"

جو مال مانگنا چاہے وہ میرے پاس آئے۔ کیونکہ اللہ نے مجھے خازن اور تقسیم کرنے والا بنایا ہے۔

(سیرت عمر بن الخطاب ابن جوزی ص ۱۰۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک زبردست قحط پڑا تو عرب سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے کہا اے امیرالمومنین! ہم ایک شدید ضرورت کی بناء پر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی ہے کیوں کہ اب ہڈیاں بھی کھانے کے لئے میسّر نہیں آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی حیثیت تین میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ اللہ کے لئے ہے یا بندگانِ خدا کے لئے، یا آپ کے لئے، اگر یہ اللہ کیلئے ہے تو اللہ کو اس کی ضرورت نہیں۔ اگر بندگانِ خدا کے لئے ہے تو اسے انہیں دے دیجئے۔ اور اگر آپ کا ہے تو صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجئے۔ اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔ یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رونے لگے۔ فرمایا مال کی حیثیت وہی ہے جس کا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

تم نے ذکر کیا اور حکم دے دیا کہ ان لوگوں کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔
(التبر المسبوک فی نصائح الملوک للغزالی ص ۶۱-۶۲)

کفالت عامّہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تصوّر اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ فرماتے تھے اگر دارالاسلام کے حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لئے جوابدہ ہونا پڑے گا۔ فرمایا:

" لو مات جملٌ علیٰ شطّ الفرات لخشیتُ ان یسئلنی اللہُ عنہ "
(تاریخ طبری ص ۲۷۳۸)

اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔

حضرت عمر فرمایا کرتے تھے:۔

" اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشتی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اس کے علاج کے لئے تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔" (التبر المسبوک امام غزالی ص ۱۷)

مدینہ میں اہل حاجت کا پتہ لگانے اور اُن کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لئے راتوں میں گشت لگاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ کو کسی کی کسی ضرورت کا پتہ اسی گشت کے دوران لگا اور آپ نے فوراً وہ ضرورت پوری کی۔ (تاریخ طبری ص ۲۷۴۳)

کفالت عامّہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہ تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت کی تھی کہ ضرورت مند اہل ذمّہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ حضرت عمرؓ کا گذر کسی گھر کے دروازہ پر ہوا جہاں ایک بوڑھا آدمی جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی بھیک مانگ رہا تھا۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو تھپکا اور پوچھا "تم کس مذہب کے اہل کتاب ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا "تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا؟ اس نے جواب دیا کہ میں ضرورت مندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے کچھ دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور فرمایا "اس کا اور اُس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو۔ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ وصول کریں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔ (کتاب الخراج ابو یوسف ص ۱۵۰)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اہلِ جمیر کے ساتھ جو عیسائی تھے، معاہدہ کیا تو اس میں ایک دفعہ یہ رکھی کہ :

"میں نے اُن کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے، یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آپڑے، یا جو آدمی پہلے مالدار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اُس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا اس کے اور اُس کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔

ان دوسری ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھانے کا اہتمام کرتی تھی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ لوگ لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔ آپ ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت نے یہود کی زبان سُریانی لکھنا اور پڑھنا سیکھی تھی۔ بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ صُفّہ کی اسلامی درس گاہ میں شریک ہونے والے قرآن کریم اور تعلیمات دینی کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عُبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے بعض لوگوں کو لکھنا بھی سکھایا تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے حضرت سعید بن العاص کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔

(ابو داؤد کتاب العلم۔ طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۲۲)

حضرت عمر بن عبد العزیز نے حُکّام کو ایسے مسافر خانے بنوانے کا حکم دیا تھا جہاں مسافروں کو قیام و طعام مفت فراہم کیا جائے۔ بعض آثار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کو شادی کرنے کے لئے بیت المال سے امداد دی جاتی۔ حضرت عمر بن عبد العزیز نے گورنر زید بن عبد الرحمٰن بن عمر بن الخطّاب کو لکھا کہ بیت المال کے فالتو مال میں سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے جنہوں نے شادی کی ہو اور اُن کے پاس نقدی نہ ہو۔ (کتاب الاموال ص ۲۵۱)

غذا، لباس، مکان اور تعلیم کی جن بنیادی ضروریات کی تکمیل کو ہم نے اسلامی ریاست کی ذمّہ داری قرار دیا ہے۔ اُن کے سلسلہ میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اُن کی وُہ کم از کم مقداریں کیا ہیں جن کی فراہمی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لئے ضروری سمجھی جائے گی۔ اس سوال کا اصولی جواب یہ ہے کہ غذا، لباس اور مکان کی ضرورتیں کم سے کم اس حدّ تک پوری کی جانی چاہئیں کہ بھوک پیاس سردی یا گرمی کی شدّت اور بارش وغیرہ کے نتیجہ میں فرد کی جان جانے کا اندیشہ باقی نہ رہے اور اس کے اندر اتنی طاقت بحال رہے کہ وہ کسبِ معاش کی جدّوجہد کر سکے۔ اس اصولی بات سے آگے بڑھ کر اشیاءِ مطلوبہ کی کیفیت کے بارے میں کوئی صراحت کرنا دشوار ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان کی تعیین احوال وظروف پر مبنی ہوگی۔ ایسا انتظام کیا جانا چاہیئے کہ محروم افراد ملک کی عام معاشی سطح کے مطابق ضروری طبّی خدمات اور دوائیں مفت حاصل کر سکیں۔ تعلیم کم از کم اتنی ہونی چاہیئے کہ ہر فرد لکھنا اور پڑھنا سیکھ لے۔ قرآن کریم کا ناظرہ پڑھنا، اسلام کی بنیادی تعلیمات سے واقفیت، جاہلیت اور اسلام کے درمیان تمیز کی صلاحیت اور عبادات کے طریقوں اور عام معاملات زندگی میں اسلامی حدود سے آگاہی ابتدائی اسلامی تعلیم کے لازمی معیار میں شامل ہیں۔

۳۔ معاشی ترقی کا اہتمام

کفالتِ عامّہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ کسی ملک کی معاشی تعمیر و ترقی اس ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط ہے۔ آج کل دفاعی قوت براہِ راست صنعتی ترقی سے وابستہ ہے۔ محفوظ دفاعی پالیسی کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ ملک اہم دفاعی سامانوں کے لئے دوسرے ممالک کا محتاج نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جدید آلاتِ حرب اور دفاعی سامان کسی ملک میں اُسی وقت تیار کئے جا سکتے ہیں جب وہ صنعتی ترقی کے ایک اونچے معیار پر پہنچ چکا ہو۔ یہ بات محتاجِ دلیل نہیں کہ کتاب وسنّت میں دارالاسلام کی فوجی طاقت اور دفاعی قوّت کے استحکام پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ

"وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ" (الانفال۔ ۶۱)

اور اُن دشمنوں کے لئے جتنی قوّت تم سے ممکن ہو سکے فراہم کر رکھو۔

اسلحۂ جنگ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ کی مختلف فوجی تیاریوں، تیراندازی، اور گھوڑ سواری کی مشق اور اسلحہ اور گھوڑے فراہم کر رکھنے پر صحابہ کرام کو برابر ابھارتے رہتے تھے۔ آج کی فوجی تیاریاں اور قوّت کے ذرائع مختلف ہیں۔ آج اسی حکم اور انہی ارشاداتِ نبوی کا منشاء یہ ہے کہ زمانہ کے معیار کے مطابق فوجی تیاریاں کی جائیں اور دفاعی قوّت پیدا کی جائے۔ چونکہ یہ مقصد صنعتی ترقی اور فولاد، ایٹمی توانائی اور بجلی کی طاقت جیسی بنیادی صنعتوں کے فروغ کے بغیر نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ اس لئے ان چیزوں کا اہتمام بھی لازم قرار پائے گا۔

اسلامی مفکّرین نے ملک کی خوشحالی کے اہتمام کو اسلامی ریاست کے صدر کی ذمّہ داری قرار دیا ہے۔ علامہ ماوردی نے امام کے فرائض گناتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"تیسری ذمّہ داری یہ ہے کہ اپنے زیرِ تسلّط ممالک کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اُس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع نقل وحمل کو بہتر بنا کر اُن ممالک کو آباد و خوشحال رکھے۔ ماوردی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں ملک کو آباد و خوشحال رکھنے کی قدر و قیمت کیا تھی۔ حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے سامنے اہل عجم کو بُرا کہا گیا تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا اور فرمایا "اُن کو بُرا نہ کہو کیوں کہ ان لوگوں نے اللہ کے ملکوں کو آباد اور خوشحال بنایا تو ان میں اللہ کے بندوں نے زندگی گذاری"۔

(ادب الدین والدنیا للماوردی ص ۸۲)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا۔ آپ نے یمن کی طرف نظر اُٹھائی اور فرمایا یا اللہ ان کے دل اسلام کی طرف مائل کر دے۔ آپؐ نے عراق کی طرف دیکھا اور یہی فرمایا۔ پھر آپ نے چاروں طرف دیکھا اور یہی جملہ دہرایا اور فرمایا "اے اللہ ہمیں زمین کی وراثت عطا فرمایا اور ہمارے مُدّ و صاع میں برکت دے"۔

(ادب المفرد للبخاری ص ۷۰)

نہریں کھودنا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں اسلامی مملکت کے مختلف صوبوں میں متعدد نہریں تعمیر کی گئیں جن کا تاریخ کی کتابوں میں تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ بصرہ کے والی حضرت ابو موسیٰؓ اشعری نے آپ کے حکم سے ایک نہر کھدوائی تھی جو نہر اُبلّہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ انبار کے زمینداروں کی فرمائش پر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے زیر اہتمام ایک نہر کی تعمیر شروع ہوئی جسے حجّاج بن یوسف نے مکمل کرایا۔ دریائے دجلہ سے نہر معقل نکالی گئی۔ عمر بن عبدالعزیز نے نہر ابن عمر کھدوائی۔ نہروں کی تعمیر کا جو سلسلہ عہد فاروقی سے شروع ہُوا تھا وہ بعد میں جاری رہا۔ نہروں کی تعمیر کے علاوہ حسبِ ضرورت سیلاب کی روک تھام کے لئے بند بھی تعمیر کرائے گئے چنانچہ حضرت عمرؓ نے مکّہ میں اس مقصد کے لئے ایک بند تعمیر کرایا۔ عراق میں دجلہ کے قریب ایک نشیبی علاقہ پانی کی کثرت سے دلدل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بڑے علاقہ کو بند باندھ کر محفوظ کر لیا گیا۔ اس علاقہ سے ریاست کو پچاس لاکھ درہم بطور خراج وصول ہونے لگے۔ (فتوح البلدان للبلاذری ص ۳۵۲، ۳۶۴)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ریاست کے زیر اہتمام متعدد بڑے بڑے شہر بسائے گئے۔ ان کا محلِّ وقوع اور اُن کی آبادی کا منصوبہ مقامی حکّام کے مشورہ سے طے کرتے تھے۔ کوفہ، بصرہ، مَوصل، جزیرہ اور مصر میں فُسطاط جیسے مرکزی شہر اسی طرح آباد ہوئے۔ قرنِ اول کی معیشت زراعت اور تجارت پر مبنی تھی۔ زرعی اور تجارتی معیشت کے لئے نہروں کی تعمیر، سیلاب کی روک تھام، سڑکوں کی تعمیر اور منصوبہ بندی کے ساتھ مرکزی شہروں کی آبادکاری، معاشی تعمیر و ترقی کے لئے جو اہمیت رکھتی ہے اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے

خلفاء کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ اشیائے ضرورت کے نرخ ارزاں رہیں۔ چنانچہ وہ مختلف علاقوں کے نرخ طے کرتے رہتے تھے اور جب انہیں یہ خبر ملتی تھی کہ نرخ ارزاں ہیں تو اطمینان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کا اظہار کرتے تھے۔ سلمہ بن قیس اشجعی کا قاصد حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ اشیاء کے نرخ کیسے ہیں۔ قاصد نے جواب دیا کہ بہت ارزاں نہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ گوشت کا نرخ کیا ہے کیوں کہ یہی اہل عرب کا اصل سہارا ہے۔ قاصد نے آپ کو گائے اور بکری کے گوشت کے نرخ الگ الگ بتائے۔ (تاریخ طبری ص ۲۷۱۹)

حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے والیوں کو تاکید کرتے تھے کہ بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی تدابیر اختیار کریں۔ آپ نے عراق کے گورنر کو یہ بھی لکھا تھا کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے کاشتکاروں کو زرعی اغراض کے لئے قرض دیئے جائیں۔ (کتاب الاموال ابوعُبَید ص ۲۵۱)

ان امور کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کو ملک کے قدرتی وسائل سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ترقی کی تمام ممکن تدابیر اختیار کرنی چاہئیں، ذرائع نقل وحمل کی توسیع، زراعت کی ترقی کے لئے موزوں اقدامات، معدنی وسائل کو ترقی دے کر کام میں لانا دریاؤں کے پانی سے بجلی حاصل کرنا اور آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر کرنا ایک اسلامی ریاست کے پروگرام میں لازماً شامل ہونا چاہیئے۔

۴۔ تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا

قرآن وسنّت اور خلافت راشدہ کے نظائر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول یہ بھی ہے کہ معاشرہ میں تقسیم دولت کے اندر جو فرق پایا جاتا ہو وہ کم ہو اور سماجی دولت کسی ایک طبقہ کے اندر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے۔

مکی دور میں ہی مسلمانوں پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ دولت مند افراد کے مال میں دولت سے محروم افراد اور ضرورت سے مجبور ہو کر دستِ سوال دراز کرنے والوں کا بھی حصّہ ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات: ۱۹)

اور ان کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا بھی حق ہے۔

پھر مدنی دور میں جب بنو نضیر نامی یہودی قبیلہ کو ان کی بدعہدی اور اسلام دشمنی کے سبب جلا وطن کیا گیا اور ان سے حاصل ہونے والے اموال کی تقسیم کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ حکم دیا گیا کہ یہ اموال ضرورت مندوں کے لئے ہیں۔ اس حکم کی مصلحت یہ بتائی گئی کہ سماج کے مال کو دولت مند افراد کے درمیان مرکوز نہیں ہونا چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا مقصد اسلامی ریاست نے تین طریقوں سے حاصل کیا۔ ہر سال زکوٰۃ اور عشر کے ذریعہ دولتمندوں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے مال کا ایک حصّہ غریبوں کی طرف منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ فَیٔ کے مال کو غریبوں کے درمیان تقسیم کیا گیا اور اصحابِ دولت کو ترغیب وتلقین کے ذریعہ اس بات پر اُبھارا گیا کہ وہ اہلِ حاجت کی مالی امداد کریں۔

جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے اور فَیٔ کا مال آیا تو آپ نے اسے عوام کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا، اور چھوٹے بڑے، آزاد، غلام، مرد اور عورت سب کو برابر حصّہ دیا۔ جب بعض لوگوں نے آپ سے یہ کہا کہ خدمتِ اسلام اور اسلام لانے میں سبقت کی بناء پر بعض افراد کو بعض سے زیادہ حصّہ دینا چاہیئے تو آپ نے اس کا یہ جواب دیا کہ :

اما ما ذکرتم من السوابق والقدم والفضل فما اعرفنی بذالک وَ انّما ذالک شیئٌ ثوابہ علی اللہ جلّ ثنائہ وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیرٌ من الاثرۃ (ابو یوسف کتاب الخراج ص ۵۰)

تم نے جو سابقیت، اولیت اور فضیلت کا ذکر کیا ہے تو میں اس سے بہت اچھی طرح واقف ہوں لیکن یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا ثواب اللہ جلّ ثناء اللہ کے ذمہ ہے مگر یہ معاملہ معاش کا ہے۔ اس میں مساوات کا برتاؤ ترجیحی سلوک سے بہتر ہے۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ :

ان ابا بکرٍ کلّمَ فی ان یفضل بین النّاس فی القسم فقال : فضائلھم عند اللہ فامّا ھذا المعاش فالتسویۃ فیہ خیرٌ (ابُوعُبید کتاب الاموال ص ۲۶۳)

ابوبکرؓ سے کہا گیا کہ وہ (فَیٔ کی) تقسیم میں بعض لوگوں کو بعض پر ترجیح دیں تو آپ نے فرمایا: ان کے فضائل کا اعتبار اللہ کے یہاں ہوگا جہاں تک اس معاشی زندگی کا سوال ہے اس میں برابر سلوک کرنا بہتر ہے۔

خلیفۂ اوّل کا یہ ارشاد اگرچہ فَیٔ کی تقسیم سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ میں آپ نے ایک اصُولی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے جس سے اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا عام رُجحان اخذ کیا جاسکتا ہے۔ یہ عام رُجحان یہ ہے کہ وسائل معاش کی تقسیم میں تفاوت کے بجائے مساوات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کے باقی دو طریقے جو عہدِ نبوی میں اختیار کئے گئے تھے عہدِ صدّیقی میں بھی نافذ رہے۔ جب بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ریاست نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کرکے ان کو اس حق کی ادائیگی پر مجبور کیا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جب حضرت عمرؓ نے مفتوحہ ممالک کی اراضی کو تقسیم کرنے کے بارے میں مشورہ کیا تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے زمینوں کی تقسیم کے خلاف رائے دیتے وقت جو بات فرمائی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود حضرت عمرؓ کو سماج میں دولت کا مرکوز ہونا ناپسند تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ زمین کی ملکیت ایک محدود طبقہ میں گھر کر رہ جائے اور باقی افراد اس سے محروم رہیں۔ حضرت معاذ کی رائے یہ تھی کہ زمین کے بڑے بڑے رقبوں کا چند افراد کے ہاتھوں میں آجانا بُرا ہے۔ اس سے آئندہ آنے والوں کی حق تلفی اور ہمت شکنی ہوتی ہے۔ حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت عبداللہ ابن عمر رضوان اللہ علیہم نے بھی زمین کو تقسیم نہ کرنے کی رائے دی تھی۔ حضرت عمر کا ان دلائل کو وزن دینا اور ان کی روشنی میں ایک اہم فیصلہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے نزدیک سماج کو دولت کے مرتکز ہونے سے بچانا اسلام کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔ (کتاب الخراج یحییٰ بن آدم ص ۴۲)

جب مصر فتح ہوا تو وہاں کی زمینوں اور عمارتوں کے بارے میں بھی حضرت عمرؓ کے حکم سے یہی پالیسی اختیار کی گئی۔

فئے کے مال کی تقسیم کے بارے میں ابتداءً عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مساوی تقسیم کی اسی پالیسی پر عمل کیا جو حضرت ابوبکرؓ نے اختیار کی تھی۔ لیکن ۱۶ھ میں جب عراق و شام کی فتح سے بہت سا مال خمس اور فئے کے طور پر حاصل ہوا تو آپ نے اپنی پالیسی تبدیل کر دی۔ آپ نے اسلام لانے میں سبقت کرنے والوں کو اور اسلام کی نمایاں خدمت انجام دینے والوں کو عام افراد سے زیادہ حصے دیئے۔ جن افراد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ میں طرح طرح کے مصائب برداشت کئے تھے۔ اسلام کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی تھی اور مدینہ کے ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ مل کر جنگیں کی تھیں ان کو آپ نے بعد میں ایمان والوں سے زیادہ حصہ کا مستحق قرار دیا۔

تقسیم فئے میں مساوی سلوک کی جگہ ترجیحی سلوک کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ آپ کو یہ کسی طرح گوارا نہیں تھا کہ جن لوگوں نے اسلام میں داخل ہونے سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگیں لڑی تھیں۔ ان کو ان لوگوں کے برابر حصے دیئے جائیں جنہوں نے ابتداء ہی سے رسول اللہ کے شانہ بشانہ کفار سے جنگ کی تھی۔

قال: لا اجعل من قاتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمن قاتل معہ۔ (کتاب الخراج ص ۵۰)

فرمایا: جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی تھی ان کو میں (تقسیم فئے میں) ان کے برابر نہیں کر سکتا جنہوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی تھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس نئے طریق کار کے حق میں جو سیاسی، معاشرتی، نفسیاتی اور دینی دلائل دیئے جا سکتے ہیں وہ واضح ہیں۔ لیکن معاشی طور پر اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ سماج کے اندر تقسیم دولت میں مزید ناہمواری پیدا ہو۔ چنانچہ آٹھ سال تک اس پالیسی پر عمل کے بعد اپنے دور خلافت کے آخری سال میں حضرت عمرؓ نے اپنی رائے پھر تبدیل کی اور آئندہ تقسیم فئے میں مساوات برتنے کا ارادہ ظاہر کیا۔

ابن سعد لکھتے ہیں:-

سمعت عمر بن الخطاب یقول: واللہ لئن بقیت الی ھذا العام المقبل لالحقنّ آخر الناس باوّلھم ولاجعلنّھم رجلاً واحداً۔
(الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۱-۳)

میں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ خدا کی قسم اگر میں اگلے سال اس موقع پر زندہ رہا تو (فئے کے رجسٹر میں درج) آخر کے لوگوں کو شروع کے لوگوں سے ملا دوں گا اور ان سب کو حصّے کے اعتبار سے) ایک آدمی جیسا کر دوں گا۔

عن زید بن اسلم عن ابیہ انّہٗ سمع عمر بن الخطاب یقول: لئن بقیتُ الی الحول لالحقنّ اسفل النّاس باعلاھم۔
(طبقات الکبریٰ ج ۳۔ ص ۳۰۱)

زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عمر بن الخطاب کو یہ کہتے سنا ہے کہ: اگر میں ایک سال اور زندہ رہا تو (فئے میں حصّے کے اعتبار سے) سب سے نیچے کے لوگوں کو سب سے اُوپر کے لوگوں سے ملا دوں گا۔

ان روایات سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم فئے میں عدم مساوات برتنے کی پالیسی سے رجوع کر کے مساوات برتنے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہ واضح نہ ہو سکا کہ آپ نے یہ فیصلہ کس وجہ سے کیا تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا روایت سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مال فئے کی کثرت اس فیصلہ کا سبب بنی تھی۔ لیکن ہمیں یہ توجیہہ کافی نہیں نظر آتی۔ سابقین اوّلین اور اسلام کی نمایاں خدمات انجام دینے والوں کا امتیاز برقرار رکھنے کا جو مقصد حضرت عمر کے پیش نظر تھا وہ اُسی وقت پورا ہو سکتا تھا۔ جب مال فئے کی کثرت کے باوجود ان افراد کے حصّے دوسرے افراد سے زیادہ رکھے جاتے۔ صرف مال فئے کی کثرت اس بات کے لئے کافی وجہ نہیں بن سکتی کہ ان کے امتیازی مقام کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سب کے حصّوں میں اضافہ کر دیا جاتا اور ممتاز لوگوں کو پھر بھی عام افراد سے زیادہ حصّے ملتے۔ مساوی تقسیم کے اس نئے فیصلہ کے لئے ضروری ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی ایسی مصلحت آئی ہو جس کو ان مصالح پر ترجیح دینے لگے ہوں جو امتیازی سلوک

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور غیر مساوی تقسیم کے وقت ان کے سامنے تھی اور آٹھ برس تک برابر سامنے رہی۔

ہمارے نزدیک یہ نئی مصلحت ان مفاسد کے ازالہ کی ضرورت تھی جو سماج کے اندر تقسیم دولت میں بڑھتے ہوئے تفاوت سے پیدا ہو رہے تھے یا آئندہ پیدا ہو سکتے تھے۔ امتیازی حصے کچھ لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار بنا رہے تھے۔ زیادہ مالدار لوگوں کے اندر معیارِ زندگی کو حدِ اعتدال سے زیادہ بلند کرنے، جائدادیں خریدنے اور جہاد فی سبیل اللہ میں کچھ سستی کے رجحانات پیدا ہوتے دیکھ کر آپ کی بصیرت نے یہ پہچان لیا ہوگا کہ ان رجحانات کو غیر مساوی تقسیم کو مزید تقویت حاصل ہوگی۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ آٹھ سال تک امتیازی سلوک کرنے کے بعد اب آپ کے نزدیک اس طریقہ کو باقی رکھنا اتنا ضروری نہ رہ گیا ہو۔ کیونکہ جن افراد کو آپ ممتاز کرنا چاہتے تھے ان کو اس طویل عرصہ میں خاصا موقع مل چکا تھا۔

نئے فیصلہ کے مطابق جن لوگوں کو زیادہ حصہ مل رہا تھا ان کے حصہ میں کمی نہیں ہوتی بلکہ جو لوگ پہلے کم حصہ پاتے تھے ان کے حصہ میں اتنا اضافہ پیش نظر تھا کہ سب کے حصے برابر ہو جائیں۔ ایسا کرنا اسی وجہ سے ممکن ہو سکا تھا کہ فئے کا مال اب پہلے سے زیادہ تھا۔ کتاب الخراج کی مذکورہ بالا توجیہہ ہمارے نزدیک فیصلہ کے صرف اس پہلو پر منطبق ہوتی ہے۔

ایک دوسری روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ مالدار لوگوں کی فاضل دولت لے کر غریبوں کے درمیان تقسیم کر دی جائے۔

عن ابی وائل قال قال عمر بن الخطّاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقراء المهاجرین۔

(المحلّٰی لابن حزم ج ۶ ص ۱۵۸)

ابو اوائل سے مروی ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: جو امور میں پہلے طے کر چکا اگر انہیں مجھے آئندہ بھی طے کرنے کا موقع ملتا تو میں مالداروں سے ان کی فاضل دولت لے کر اُسے فقرائے مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیتا۔

اپنے دورِ خلافت کے آخری سال میں عمر فاروقؓ کا یہ ارشاد واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ آپ سماج میں دولت کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری سے پریشان رہنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کی روشنی میں اپنے بعض گذشتہ فیصلوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرتے تھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور ایک راست اقدام کے ذریعہ تقسیم دولت کے اندر پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یہ روایت ہماری اس رائے کی بھی تائید کرتی ہے کہ تقسیم فئے کے بارے میں آپ کے نئے فیصلہ کی اصل وجہ گذشتہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ناہمواری اور بڑھتی ہوئی عدم مساوات تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اموال فئے کی تقسیم میں مساوات کی پالیسی پر عمل نہیں کیا۔ مزید برآں آپ نے عراق و شام کی زمینوں کو جن کا مالیہ اب تک براہِ راست کاشت کاروں سے وصول کیا جاتا تھا متعینہ خراج پر درمیانی افراد کو دینے کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ ٹھیکہ دار کاشتکاروں اور ریاست کے درمیان آ گئے۔ ریاست کو متعینہ رقم ادا کرتے اور کاشت کاروں سے مختلف شرحوں کے مطابق لگان وصول کرتے یا پیداوار میں شرکت کا معاملہ طے کر لیتے اور اس طرح خود نفع کماتے۔ اسی چیز نے آگے چل کر زمینداری اور جاگیرداری کی شکل اختیار کر لی جس کے گوناگوں مفاسد رُونما ہوئے۔ ابتداً یہ طریقہ اس لئے اختیار کیا گیا تھا کہ ریاست کو مالیہ وصول کرنے میں سہولت ہو اور وہ انتظامی زحمتوں سے بچ سکے جو لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں سے خراج وصول کرنے میں اُسے اٹھانی پڑتی تھی۔ اس طریقہ کو اختیار کرنے سے ریاست کی آمدنی بھی بڑھ گئی تھی لیکن یہ درمیانی افراد کاشتکاروں پر زیادہ دباؤ ڈالنے لگے اور اپنا نفع بڑھانے لگے۔ (الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۱۸۳)

مقررہ سالانہ وظیفوں کے علاوہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے متعدد افراد کو ان کی خدمات پر فراخ دلی کے ساتھ مزید رقمیں بھی عطا کیں۔ پھر مروان بن حکم کے بعض تصرفات کے نتیجہ میں ایک خاص طبقہ، بنو اُمیہ کو بیش از بیش مالی فوائد حاصل ہونے لگے۔

ان پالیسیوں کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر تقسیم دولت میں پایا جانے والا تفاوت بڑھنے لگا۔ متعدد اکابر صحابہؓ کو ان میں سے بعض پالیسیوں پر اعتراض تھا بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری دنوں میں آپ نے ان حضرات سے یہ کہا تھا کہ اگر ان کی رائے آپ کی پالیسی کے خلاف ہے تو وہ اس کو تبدیل کرنے کے لئے اور بعض سابق احکام کو واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کے ایماء سے آپ کی جانب سے یہ اعلان کیا تھا کہ آئندہ تقسیم مال میں مساوات برتی جائے گی۔ (تاریخ طبری ص ۲۹۴۸۔ انساب الاشراف ج ۵ ص ۹۳)

حضرت علی رضی اللہ عنہ تقسیم فئے کے بارے میں وہی رائے رکھتے تھے جو حضرت ابوبکرؓ کی تھی، لیکن آپ کا دورِ خلافت اضطراب کے عالم میں گذرا اور اس کے بعد سلاطین بنو امیہ نے نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں دولت اور آمدنی کی تقسیم میں بڑھتی ہوئی ناہمواری کو کم کرنے کی کوشش نہیں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کی بلکہ ان کی مالی پالیسی کے نتیجہ میں یہ تفاوت بڑھتا ہی گیا۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے اور آپ نے زندگی کے مختلف شعبوں کو اسلام کی اصل تعلیمات کے مطابق از سر نو منظم کرنے کی کوشش کی تو معاشی نظام میں بھی متعدد اصلاحات عمل میں لائی گئیں۔ بے جا طور پر دی گئی جاگیریں واپس لے کر ان کے اصل مالکوں کو دی گئیں۔ جن سرکاری زمینوں کو لوگوں نے ذاتی ملکیت بنا لیا تھا۔ ان کی سابق حیثیت بحال کی گئی اور آئندہ کے لئے ایسی زمینوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

(کتاب الاموال لابی عُبَید ص ۳۶۴)

بعد میں آنے والے حکمرانوں نے ان اصلاحات کو ترک کر دیا اور حکومت کی معاشی پالیسی میں دوبارہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کی مختلف شکلیں رونما ہونے لگیں۔

اس حقیقت میں کوئی شُبہ نہیں کہ قرآن و سنّت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافت راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلام کسی فرد پر کسبِ دولت کے سلسلہ میں کوئی اصُولی اور دائمی پابندی عائد نہیں کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن، سنّت نبوی، اور خلافت راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔

اس رائے کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اسلام کو معاشرہ میں عیش پرستوں اور مُترفین کے طبقہ کا ظہور سخت ناپسند ہے۔ ہم قبل ازیں پہلے باب میں یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ قرآن کریم کے فلسفہ تاریخ کی روشنی میں کسی معاشرہ میں عیش کوشی اور عیش پرستی کرنے والے طبقہ کا ظہور اور غلبہ اس معاشرہ کی ہلاکت اور بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ تقسیم دولت میں بڑھتا ہوا تفاوت اس طبقہ کے ظہور اور غلبہ کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔

اس بناء پر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی ریاست اس بات کا اہتمام کرے کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم میں روز افزوں تفاوت کا رجحان نہ جڑ پکڑ سکے۔

معاشی پالیسی کے اس رہنما اصول کی روشنی میں دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست کی ذمّہ داری ظاہر ہے۔ اس ریاست کو اس بات کی بھی فکر کرنی ہوگی کہ صدیوں کے غیر اسلامی نظامِ معیشت کی وجہ سے جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں ان کا بتدریج ازالہ کیا جائے۔ اصلاحِ حال کے لئے پہلا قدم یہ ہوگا کہ عشر و زکوٰۃ کے شرعی محاصل کو وصول کرنے اور متعینہ مدات میں صرف کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ عام اخلاقی تربیت کے ذریعہ ایک ایسی فضا بنانی ہوگی کہ اصحابِ دولت زکوٰۃ کے علاوہ بھی اپنے مال میں اہلِ حاجت کا حق تسلیم کریں اور اسے رضا کارانہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

طور پر ادا کریں۔ اسلام کے قانون وراثت کا پوری طرح نفاذ بھی اس اصول کے بعض تقاضوں کو پورا کرے گا۔ پھر سُود کی حُرمت بے جا استحصال کے بُرے دروازہ کو بند کر دے گی۔

ان اقدامات کے ساتھ اس طرف بھی توجہ کی جانی چاہیئے کہ غیر اسلامی زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے زمین کی ملکیت کا ایک طبقہ میں جو مرتکز وجود میں آگیا ہے اس کو ختم کیا جائے۔ پھر اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیئے کہ ریاست کے تعمیری اور ترقیاتی کاموں، یا رفاہ عامہ سے امور اور تعلیم، صحت وصفائی اور حمل ونقل کی سہولتوں وغیرہ خدمات کی فراہمی کا جو انتظام ریاست کی جانب سے کیا جائے، اس کے بیشتر فوائد بڑے کاروباریوں، یا مال دار لوگوں ہی تک محدود نہ ہو جائیں۔ موجودہ عدم توازن کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان خدمات سے زیادہ تر فائدہ غریبوں اور کم آمدنی والے طبقوں کو پہنچے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ریاست اس رہنما اصول کے تقاضوں کی تکمیل کے لئے اہل ثروت پر شرعی محاصل کے ماسوا مزید محاصل عائد کرنے کا طریقہ بھی اختیار کر سکتی ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۳۔ اُمّتِ مُسلِمہ

ان وضاحتوں کے بعد کہ صرف "اسلام" ہی ہر حیثیت سے جامع، کامل، سارے انسانوں کے لئے، اور آخری دین ہے نیز نجات کے لئے اس کی پیروی شرط ہے، عقل کہتی ہے کہ اسلام کو اگر یہ مخصوص حیثیت دی گئی ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص تقاضا بھی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنا چاہیئے اور برابر پہنچتے ہی رہنا چاہیئے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیئے اور پیہم ہوتی رہنی چاہیئے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیئے اور مسلسل دیا جاتا رہنا چاہیئے۔ ورنہ دنیا اسے جان پہچان نہ سکے گی۔ اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لا سکے گی، حالاں کہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلّف قرار دی گئی ہے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتی تو بدبختی کا شکار ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی کہ لوگوں کے لئے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی شریعت ایک راز بنی رہے اور انہیں بے خبری میں پکڑا جائے۔ اس لئے اگر انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی پیروی کرے۔ تو اس فرض سے پہلے اس کا یہ حق ہے کہ اسے دین سے واقف کرایا جائے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو خود اسلام پر بھی ظلم ہے کہ وہ بڑی حد تک بے مصرف بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت پر بھی ظلم ہے کیوں کہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جاتی ہے۔ جس پر اس کا مقدر موقوف ہے۔

مِلّتِ اسلامیہ کا مقصد اور منصب

جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا بلاشبہ اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا یہ حق ادا کیا مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو یہ حق اپنے ادا کئے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے اور تاقیامت کرتا رہے گا۔ اب تو کوئی نبی بھی آنے والا نہیں ہے کہ یہ حق اس کا انتظار کرے۔ بہرحال اگر اب اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے ضروری تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا تو ضروری ہے کہ وہ پورا ہو۔ کیسے پورا ہو؟ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جس کا کوئی عملی حل ہونا چاہیئے اور صرف اسلام کی زبان سے ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ اگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے فی الواقع ساری دنیا کے لئے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا گیا ہے تو ضروری ہے کہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اس مسئلے کا کوئی مقررہ حل اس کے پاس موجود ہو۔

اس ضرورت کے پیش نظر قرآن اس عظیم مسئلے کا عظیم الشان حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو بہتر (درمیانی) امّت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کیلئے (ہمارے نازل کردہ دین کے) شاھد ہو اور ہمارا رسول تمہارے لئے شاھد بنے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے کہ:

(۱) اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے اُس کے چلے جانے کے بعد وہ اُس کے پیروؤں کے ذمے ہو گیا ہے۔ اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لئے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

(۲) اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے "شہادت" (گواہی) کہہ سکیں۔

(۳) "اسلام کی شہادت" دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان ہر ممکن حد تک ٹھیک اسی طرح کریں جس طرح کہ خود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان (صحابہ) تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو امت مسلمہ ایک عام ذمہ داری کے ساتھ ایک اور ذمہ داری بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سامنے رکھا گیا ہے۔ مختصراً، یہ امت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے۔ اور بحیثیت امت اس کی زندگی کا مشن ٹھیک وہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔

امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ "ہم نے تمہیں ایک بہتر امت (یا امت وسط) بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لئے دین حق کے گواہ رہو" اس امت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے۔ مزید صراحت اس ارشاد میں ہے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" (الآیۃ) (تم ایک بہتر امت ہو جو سارے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

انسانوں (کی اصلاح) کے لئے وجود میں لائی گئی ہے)۔ ان لفظوں میں صاف نظر آجاتا ہے کہ یہ امت صرف اس طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں۔ بلکہ ایسی امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ اُمتِ مُسلمہ کی اصل قدر و قیمت بھی اسی "شہادت" پر موقوف ہے۔ وہ "امت وسط" اور "خیر امت" فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے، ورنہ ان خطابات کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی۔ کیوں کہ اس کا یہ نام صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لئے ملا ہے کہ اس کی اسلامی ذمہ داریاں دوسری امتوں کے مقابلے میں دوہری تھیں۔ سورۂ حج کے الفاظ قابل غور ہیں:

> "اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستے کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام "مسلم" رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لئے (دین حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے شاہد بنو۔ (الحج ۷۸)

اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ امتِ مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے۔ وہیں اسے اور ساری دنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اس نام اور کام کی وجہ سے اس کا وہ مشن ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً "امت مسلمہ" ہے اور اس سلسلے میں وہ خدا کے حضور جواب دہ بھی ہوگی یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی وہیں پوری امت کو ایک امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جواب دہی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ کوئی معمولی جوابدہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح کی انبیاء علیہم السلام کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی۔ کیونکہ اگرچہ امت مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔

سورۂ اعراف میں ہے:

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ (الاعراف - ۶)	پس ہم ضرور حساب لیں گے ان لوگوں سے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے اور ان پیغمبروں سے بھی حساب لیں گے۔

شہادتِ حق اسلام کی یہ شہادت کیا چیز ہے؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے جو یہاں پہنچ کر لازماً پیدا ہوتا ہے اور

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جس کا جواب ملنا خود اسلام کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اصولی طور پر اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح اسلام اور دین حق ایک متعین چیز ہے اسی طرح دین حق کی اس شہادت کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے اور یہ تعین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔

"شہادت" یا گواہی عرف عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعے یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہو دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ اس لئے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر اسلام کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اب رہا قرآن کا اصطلاحی مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت اور بلندی آگئی ہے۔ جس کی وضاحت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ کی روشنی میں یہ ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(۱) **قولی شہادت**: قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک پوری دنیا کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کئے جائیں، یہاں تک کہ یہ دین ان کے لئے بالکل کھلی کتاب بن جائے اور غیر مسلموں کے سامنے ان کے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لئے چند باتیں ضروری ہیں:

(۱) اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں، جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید، رسالت، آخرت وغیرہ پر جس زور و قوت کے ساتھ اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کئے ہیں، اس کا اتباع بنیادی ضرورت ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے احکام اور ان کی تفصیل پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔

(۲) غیر اسلام پر سنجیدہ اور مدلل تنقید کی جائے۔ اس تنقید کے لئے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر مسلم دنیا پیروی کر رہی ہے، اور جو اس وقت کے مذہب، تہذیب اور فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کئے ہوئے عملی نتائج کو بھی بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لئے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادت اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(۳) اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دل نشیں اور جدید ترین انداز میں انجام دیا جائے۔ اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز کا ہو جو آجکل کے ذہنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیوں کہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں ہے بلکہ دین حق کی تبلیغ اور توضیح کی خاطر ہے۔ قرآن نے بھی اپنی دعوت پیش کرنے کے لئے زبان، انداز، اسلوب اور طرز استدلال انتہائی مناسب، مانوس، معیاری اور واضح اختیار کیا ہے جو مخاطب کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث و مباحثہ کرو۔ (ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن)

(۴) اس تبلیغ و دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور، کوئی حریفانہ جذبہ، اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز کارفرما نہ ہو۔ بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للہیت کے ساتھ نکلے۔ اور محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیر خواہی کی بناء پر نکلے۔

(ب) عملی شہادت: عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری امت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ ان میں توحید، آخرت، رسالت اور دوسرے عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق و آداب، معیشت و معاشرت، سیاست و معاملات غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ الٰہی نقشے کے مطابق تعمیر ہو۔ "عملی شہادت" کا مرتبہ "قولی شہادت" سے مقدم ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی دعوت دے۔ کیوں کہ نتیجے کے اعتبار سے بھی اس کی کوشش زیادہ بار آور نہ ہوگی۔

اس سلسلے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ کے متعلق کچھ عرض کرنا بالکل غیر ضروری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بھی ایمان کی دعوت دی تو اس حال میں کہ پہلے خود ایمان و ایقان کے پیکر بن چکے تھے اور جب دوسروں کو اللہ کا حکم سنایا تو اس طرح کہ سر مبارک اس کے آگے پہلے جھک چکا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات "انا اول المؤمنین" (میں

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) اور "انا اول المسلمین" (میں سب سے پہلا اطاعت اطاعت کرنے والا اور سرِتسلیم خم کرنے والا ہوں) اس پر دلالت کرتے ہیں۔

انسان کی ذہنیت ایسی ہے کہ وہ پست، درماندہ اور محکوم اقوام کے طریقۂ زندگی، فلسفہ اور دین کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ علمی اور اقتصادی میدانوں میں دوسروں کے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اس وقت مسلمانوں کی درماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں جوشِ عمل اور محنت کی عادت کا فقدان ہے اور سہل انگاری، کاہلی اور کم ہمتی ان کی خصلت میں شامل ہوگئی ہیں۔ جب تک مسلمان ان خرابیوں میں گرفتار رہیں گے نہ ان کا اخلاقی معیار بلند ہوگا اور نہ دنیوی فلاح انہیں حاصل ہوگی؛ وہ پست اور درماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام رہے گا اور دوسری اقوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گا، بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن اسلام سے ہٹ کر اور راستے تلاش کریں گے۔ یہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے زہر آلود اثرات اس وقت بھی اسلامی معاشرے کو بربادی کی طرف لئے جا رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کا شاہد اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنی کوشش، ایثار اور محنت سے اپنے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے قابل ہو۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۴۔ اسلامی ریاست کی ضرورت

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لئے جو ادارے قائم کئے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرتے کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں:

"ریاست ایک منظم سماج کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے۔ جب کہ ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دوگونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا ہونا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہوگئی۔"

اجتماعی زندگی کے لئے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لئے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات معاشی لین دین اور تمدنی معاملات کی استواری کا نگراں و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقاء کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن و امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کردے جو وہ خود حاصل نہیں کرسکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون، حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کرلیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقا کی تاریخ ہے۔ اور دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نت نئی پیچیدگیوں کے راہ پاجانے کی وجہ سے ریاست کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ ریاست کا ادارہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے، اس کے قیام و ارتقاء میں انسان کی اخلاقی حس اور تصوّرِ عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر پرزہ حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے تو اس لئے کہ عدل قائم ہو قوانین بناتی یا بدلتی ہے تو اس لئے کہ وہ اصول انصاف سے زیادہ مطابقت اختیار کرسکیں۔ اخلاقی احساس کا غلبہ اس درجہ ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے مفاد کی بناء پر قانون بناتے ہیں تو ان پر بھی اصول اخلاق و انصاف ہی کا جامہ پہنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی چشم اخلاق میں کھٹکتی ہو تو جلد یا بدیر انقلاب واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل گئی۔ نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ استحکام اور صحت مند ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین و قانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اس کے نظام فکر و عمل میں اس جاہلانہ تصور کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ دین و سیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطۂ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لئے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے۔ قرآن میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شریعت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ (البقرہ - ۲۰۸)	اے ایمان والو! اسلام میں، پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

اہل کتاب جن احکام خداوندی کو اپنی خواہش و پسند کے مطابق پاتے، ان پر تو عمل پیرا ہو جاتے لیکن جو احکام الٰہی ان کی خواہش و پسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کنی کترا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تہدید کی گئی کہ

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ۔ (البقرہ - ۸۵)	کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو تو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔

پھر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ (البقرہ - ۸۵)

پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرہ سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تجیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لئے ہو جائے اور شرک کو اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ (الاعراف - ۶۵)

اے برادران قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ (یوسف - ۴۰)

(سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کیلئے نہیں۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ (الاعراف - ۵۴)

خبردار! تخلیق (کی کارفرمائی) اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لئے ہے۔

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ (الشعراء - ۱۳۱)

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبہ کی اصلاح کی جدوجہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جدوجہد پوری زندگی کی اصلاح کے لئے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خود خالق ارض و سماوات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝

اور (اے نبی) دعا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

(بنی اسرائیل۔ ۳۸) ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اے اللہ! یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ اس طاقت سے میں دنیا کے بگاڑ کو درست کر سکوں، برائیوں کے سیلاب کو روک سکوں، نیکیوں کو قائم کر سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے:

ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سدباب قرآن سے نہیں کرتا

الاسلام والسلطان اخوان توأمان لا یصلح واحد منهما الا بصاحبه فالاسلام اسس والسلطان حارس وما لا اسس له لیهدم وما حارس له ضائع۔ (کنز العمال)

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے۔

اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے۔ اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے۔ وہ تجارت اور معاملات کے لئے قانونی ہدایت دیتا ہے۔ وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و ہبہ کے لئے قوانین دیتا ہے۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل، بے کار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔

www.KitaboSunnat.com

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الٰہی کا قائم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجراء اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن ثابت ہوں گی۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہو گی، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے۔ یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

علیہ وسلم نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کا ضامن یہی نظام عمل ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویۂ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق ہو، اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ۝ (الحج - ۴۱)

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہونگے نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا کہ:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لئے میدان میں لائی گئی ہے، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

اور قیامت تک کے لئے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۰۴)

تمہیں ایک ایسی امت بننی چاہیئے، جو بھلائی کی طرف دعوت دیتی رہے، نیکی کا حکم کرتی رہے اور برائی سے روکتی رہے۔

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لئے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار اور تحکم کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست و عرض کریں گے اور برائی سے باز رہنے کی التجا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کریں گے۔ پس امر و نہی کے لئے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ صحیحین کی مشہور حدیث ہے:

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع، فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ و ذالك اضعف الایمان۔

(صحیح بخاری و مسلم)

تم میں (سے جو شخص کوئی بدی دیکھے، اس کو ہاتھ سے بدل دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

ظاہر ہے کہ "تغییر بالید" (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لئے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لئے بھی کچھ قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو تیسرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد، بعض روایات کے مطابق "ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا"۔ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے برا سمجھنا اور زشت و نیک کا بھی احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سربلندی کے لئے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لئے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔ خود پاکستان کے قیام کی جد و جہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کی ایسی ریاست ہونی چاہیئے جہاں وہ اپنے عقائد و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی زندگی گزار سکیں۔

فقہ کے ایک بنیادی مسئلہ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتب فکر اس امر پر متفق ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لئے منصب امامت لازمی ہے۔ خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیوں کہ نظم ملت، قیام امن، حصول نفع و دفع ضرر اور نفاذ احکام شریعت، امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل والنحل" میں لکھتے ہیں:-

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجية وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الامامة وان الامة واجب عليها الانقياد للامام عادل يقيم احكام الله و يسوسهم باحكام الشريعة التي اتى بها رسول الله صلى الله عليه وسلم

(الفصل ابن حزم ج ۴ ص ۸۷)

کل اہل سنت، مرجئہ، شیعہ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

اور شاہ ولی اللہؒ رقمطراز ہیں:

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔" (ازالۃ الخفاء فصل اول)

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفاصیل و جزئیات میں یا اس کے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں۔ یہ سب کی نگاہ میں لازمی اور ضروری ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں:

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لئے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لئے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روادار نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لئے سیاست کو بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لئے استعمال کرتا ہے۔

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش نفس کی اندرونی وحشت کی بناء پر یا کسی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بناء پر۔

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں "چنگیزی" رونما ہوتی ہے۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصہ پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لئے سرگرم عمل رہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۵۔ اسلام کے اصول حکمرانی

۱۔ اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر، نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی علمبردار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لئے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے، اور اس سرزمین کی حفاظت اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر لمحہ اس کے سامنے رہتی ہے لیکن اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے اور ایک ایسے اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لئے یکساں ہے۔

سورۂ حجّ اس آیت پر مشتمل ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قائم کریں گے، ادائے زکوٰۃ میں سرگرم رہیں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے (الحج۔۴۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ (الحدید۔ ۲۵)

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لئے بہت فوائد بھی ہیں تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس (کے دین) کی اور اس رسولوں کی بن دیکھے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مدد کرتا ہے۔

اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(النور - ۵۵-۵۶)

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے اس کو ان کیلئے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے، اور جو اس کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے وہ وہ فاسق ہیں اور (اے مسلمانو) نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سربلندی ہے جسے قائم کرنے کے لئے یہ وجود میں لائی جاتی ہے۔

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے۔ ریاست کلی اختیارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے اور اس کی پابند و ماتحت ہے۔ اس میں اصول اطاعت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت پر بلند و بالا ہے۔ ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النساء - ۵۹)	کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز و محور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گی جب وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ:

لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق — خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لئے کوئی اطاعت نہیں۔

۲۔ مسلمانوں کے اولی الامر یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں، مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ "مِنْكُمْ" (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

۳۔ اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرماں برداری مسلمانوں کے لئے ضروری کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام منجن و خوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی یہ اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ سننا چاہیئے اور نہ ماننا چاہیئے"

(بخاری و مسلم)

۴۔ اولی الامر سے بحث و مذاکرہ، ان سے اختلاف اور ان پر تنقید و محاسبہ کی اجازت اور ضمانت بھی یہ آیت دیتی ہے، ہمیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالآخر فیصلہ صرف خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو، لیکن یہ تنقید

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔" (مسلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریئے کو سربلند کرنا ہے اور اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے محض اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصولی اور نظریاتی ہونے سے چند امور پر مزید روشنی پڑتی ہے:

(ا) اسلام میں ریاست خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس طرح یہ فاشسٹ ریاست سے بالکل مختلف ہے، جہاں ریاست خود مقصد بن جاتی ہے اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ مواقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعے وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پورا کر سکیں۔ یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "انا اوّل المسلمین" (میں اطاعت الٰہی کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ مملکت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح ایک عام شہری پر۔

(ب) اسلامی ریاست ایک لادینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لادینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کے بجائے محض عقل و مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔ ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے۔ اسلام دنیاوی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں۔

۲۔ شورائی اور جمہوری ریاست

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ہے، اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ، نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں۔ وحدت آدم اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو پوری ملت کے معتمد علیہ ہوں۔ ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی پالیسی باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں۔ حکومت خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے۔

اسلامی جمہوریت کی پہلی بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَآءً۔ (النساء۔۱)	خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (الحجرات۔۱۳)	لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ و قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہے۔
وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل۔۸۰)	اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنا دیا۔

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم ربنا ورب کلّ شیءٍ اناشھید انّ العباد کلھم اخوۃ (احمد اور ابوداؤد)	اے ہمارے اور ہر چیز کے رب! میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی بھائی ہیں۔

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، وہ یہ تھا:

"خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔ اے لوگو! تم سب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ نسب کے لئے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور محکوم، صاحبِ امر اور مامور میں اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا۔ قانون سب کے لئے ایک ہی ہے۔ ایک بار ایک معزز خاتون کو چوری کی سزا میں قطع ید کی سزا دی جانے والی تھی۔ کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا۔ (مسلم)

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے یعنی یہ کہ ریاست کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جائیں جو اس کام کے اہل ہوں اور جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہو اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں۔ اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔" (مسلم)

ارباب امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر متفق ہیں، البتہ ان کا انتخاب کیوں کر ہو، خصوصیت سے امیر یا خلیفہ کا، اس پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شیعی نظریۂ خلافت یہ ہے کہ خاندانِ نبوت کے سوا کوئی شخص خلافت کا اہل نہیں اور امامت و خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہیں اس لئے انتخاب کا سوال نہیں۔ فرقۂ زیدیہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرہ استحقاق کو محدود رکھتا ہے۔ خوارج کا خیال تھا کہ ہر پاک سیرت مسلمان خلافت کا اہل ہے۔ البتہ عام حالات میں خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں۔ معتزلہ ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنّت عمومی خلافت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قائل ہیں البتہ خلیفہ کے لئے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ، سیاسی تدبر، فنون حرب میں مہارت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں۔ طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود تمام مکاتب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک نظر آتا ہے۔

(الاحکام السلطانیہ للماوردی)

اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے یعنی مسلمانوں کے یہ معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرماتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران-۱۵۹) (اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو)

اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ

ما رأيت احدًا اكثر مشورة لاصحابه من النبي صلى الله عليه وسلم۔ (بخاری و مسلم)	میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ-۳۸) (اور ان کے امور آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں)

خطیب بغدادی حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورہ کے لئے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔" (روح المعانی)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرے کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

"جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں۔" (صحاح ستہ)

اس نے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں:

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ان الشوریٰ ھی من قواعد الشرعیہ وعزائم الاحکام۔ (بستانی۔ جلد اول)

شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام میں سے ہے۔

مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملے اور اس کی ہر منزل کے لئے ہے۔ اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل وعقد ہوں، فہم وبصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتمد علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کرے۔ کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو شوریٰ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تجویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہریوں کے حقوق وفرائض کا تعین ہے اور ان حقوق میں در اندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی یا ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی دو قسمیں کرتی ہے: مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے۔ البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کلیدی مناصب پر فائز ہو سکیں، اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:۔

(۱) جان و مال اور ناموس کی حفاظت۔ یعنی ریاست ضمانت دیتی ہے کہ اپنے شہریوں کے جان و مال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو ڈالنے دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

فذالك المسلم الذی له ذمة الله ورسوله فلاتخفروا الله فی ذمته (بخاری)

پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ تو خبردار، اللہ کیساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله وعرضه (مسلم)

مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے، اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کے باب میں بھی اصول یہ ہے: جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے۔

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور بقول قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اصول یہ ہے کہ:

ولیس للامام ان یخرج شیئًا من احدٍ الا بحق ثابت معروف۔ (کتاب الخراج۔ صفحہ ۳۷)	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے اس کی کوئی شے نکالے

(۲) **شخصی آزادی**۔ ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہو گی اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے لئے استعمال نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے دوران ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبے کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ سوال سن کر سکوت فرمایا تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

خلوا لہ جیرانہ۔ (ابوداؤد	اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔

اسلام کا یہ اصول ہے کہ

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل (مؤطا)	اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

(۳) **رائے اور مسلک کی آزادی**۔ اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف رائے کو خوں ریزی اور فتنہ و فساد کا ذریعہ نہ بنا لے۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علیؓ نے خوارج کے مقابلے میں اختیار فرمایا جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرتے تھے۔

حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

"تم جہاں چاہو رہو، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خوں ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو۔" (نیل الاوطار جلد ۷، صفحہ ۱۳۹)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ (البقرہ-۲۵۶) | دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں۔

(۴) **قانونی مساوات**۔ یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں، یا سفید، صاحب امر ہوں یا مامور، قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا۔

(۵) **معاشرتی مساوات**۔ یعنی خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔ سب برابر ہیں۔ عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تقویٰ کی بنا پر۔

(۶) **بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف**۔ یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچائے گی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی۔

(۷) **فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق**۔ تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں۔ ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں۔

(۸) **اجتماع، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی**۔ انہیں یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ منظم و مجتمع ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوک ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں معروف میں عدم اطاعت کی روش اسلامی کے مزاج کے منافی ہے۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیر خواہی کریں۔ یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کریں جو ریاست کو نقصان پہنچانے والا ہو۔ تخریبی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر محترز رہیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں نیز یہ بھی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو ہے کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنوں کو خدا کے راستے سے ہٹنے نہ دیں، اور اگر کوئی انحراف واقع ہو تو اس کو روکیں، ہاتھ اور زبان دونوں سے۔ اسلامی ریاست کے شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور اس کی خاطر مالی اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی پیش کریں۔

مندرجہ بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قائم ہے۔

۳۔ فلاحی ریاست

اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قائم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قائم کرے، ان تمام

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے، ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام قوتیں ان انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے وقف کر دے۔ اسلام ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قائم کردہ ریاست ایک مثبت ریاست ہے جو قیام انصاف اور ادائیگی حقوق کے ایجابی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "فقر انسان کو کفر کی طرف لے جا سکتا ہے" اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ! مجھے کفر اور فقر دونوں سے محفوظ رکھ"

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک اور طیب کمائی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی و جہد کے دروازے سب کے لئے کھول دیئے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے، جسے جائز اور صحیح راستوں ہی پر صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اگر غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے گا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں۔ نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صرف کرے۔ جو دولت کو جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لئے اسے خرچ نہیں کرتے یا اس میں سے دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لئے سخت ترین وعید آئی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکوٰۃ فرض کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ:

توخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراءھم۔ (بخاری و مسلم)	ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر اسے محض ایک خیرات نہیں بلکہ "حق" قرار دیا گیا ہے۔

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ
(الذاریات - ۱۹)

ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے لئے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لئے۔

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور حقداروں تک پہنچانا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً۔
(التوبہ - ۱۰۳)

(اے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے۔

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرے جو مجبور ہوں، اپاہج ہوں، لاچار ہوں، یا رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من مات وعليه دين و لم يترك وفاء فعلىّ قضاءه ومن ترك مالاً فلورثته
(ابوداؤد)

جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے تو اس کے وارثوں کا حق ہے۔

من ترك دينًا او ضياعًا فليأتنى فانا مولاه۔
(ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے۔ میں اس کا سرپرست ہوں۔

من ترك مالاً فلورثته ومن ترك كلا فالينا۔
(بخاری و مسلم)

جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔

امام ابو یوسف "کتاب الخراج" میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان سے یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا" (کتاب الخراج ص ۷۲)

حضرت خالدؓ نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا جو کسی آفت کا شکار ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی۔
(کتاب الخراج ص ۸۵)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات واحادیث وآثار کی روشنی میں علماء کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

" اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لئے کوئی شے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لئے بھی ذمہ دار ہوگی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔"

(زاد المعاد ج ۱ ص ۵۷)

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ :

" اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فئے (بیت المال کی آمدنی) سے ان غربا کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لئے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لئے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری حاجات کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لئے گرمی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لئے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔"

علامہ ابن حزم محلیٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں :

" اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے، ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے، محض اس بناء پر کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے، تو اللہ تم ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔" (محلیٰ صفحہ ۱۵۷)

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت محض نظری دلائل ہی سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اوّل میں مسلمانوں نے اس نظام کو من وعن قائم کیا تھا اور دنیا کی پہلی فلاحی اور خادم خلق ریاست بنائی تھی۔ مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

" اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اپاہج، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی۔ ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لئے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا، اس لئے ہر شخص کے لئے اسی قدر آٹا مقرر تھا غربا و مساکین کے لئے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روز ینے مقرر کر دیئے جائیں۔"

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قائم کیا۔ اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

یہاں بھی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ

جو بڑھ کر خود اُٹھا لے
ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لئے کوئی سہارا نہیں کشمکش حیات میں اس کے لئے مٹ جانا ہی مقدر ہے۔ سعی و جہد اور مواقع کی مساوات بھی اس نظام میں معدوم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لئے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں۔ اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک منصفانہ معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر پیمانے پر گرتوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ فلاحی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اس لئے کہ یہ کفالت کی ضمانت تو دیتی ہے لیکن آزادی اور انفرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں۔ کُلّی قومی ملکیت اسلام کے مزاج کے منافی ہے۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے کے بعد توازن اور انصاف قائم کرتی ہے۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی یہ مختلف ہے کہ اس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے محض سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لئے نہیں۔ یہاں اس کا اصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور ہر حال میں پورا کرنا ہے۔ یہ سارا کام جبر اور رسہ کشی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

کے ساتھ نہیں بلکہ دلی تعاون اور جذبۂ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں صرف معیارِ زندگی ہی کو بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیارِ اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی اور دنیاوی حیثیتوں سے بہت اونچا ہے۔

۴۔ معلّم اور داعی ریاست

اسلامی ریاست کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد محض معاشی کفالت کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدّن کی ترویج بھی اس کے ذمے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں"۔ وہ ریاست جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت کرتی ہے اپنے شہریوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے، اور پوری دنیا کے لئے حق کی شاہد اور اسلام کی علم بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"طلب العلم فریضۃ علیٰ کلّ مسلم۔ (ابن ماجہ)

علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس فریضے کی بجا آوری کے لئے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ غزوۂ بدر میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض لوگوں کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجتے رہتے تھے۔ مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا۔ جسے "صُفّہ" کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا۔ یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ مدینے سے باہر کے مسلمانوں کے لئے یہ قاعدہ تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقے میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو وفود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں سے ذہین اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پر مقرر کرتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرماتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ مثلاً جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے ہدایت یہ دی کہ:

"وہ حق پر قائم رہیں جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے، اور لوگوں کو بھلائی کی خوش خبری اور بھلائی کا حکم دیں۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں۔" (سیرت ابن ہشام ج ۴ ص ۲۴۱)

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لئے سوسائٹی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا گیا اور مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے تقرر میں جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا وہ قرآن و حدیث کا علم ہے۔ پوری اسلامی قلمرو میں بے شمار افراد کو اس کام پر مقرر کر دیا گیا تھا، کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں۔ اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر، قریہ قریہ، محلہ محلہ اور گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔ اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سمجھدار کارکن میسّر آتے گئے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں۔

مسلمانوں کی پوری تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ تمام شہریوں کے لئے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔

۲۔ تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی جو دفاع دین اور قیام حیات کے لئے ضروری ہیں۔ نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی کوشش کی گئی۔

۳۔ تعلیم ہر دور میں مفت رہی مسلمانوں نے ایک دن کے لئے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا۔ علم اور اونچے سے اونچے درجے کے علم کے دروازے ہر شخص کے لئے بلا فیس کھلے رہے۔

۴۔ تعلیم کے ساتھ کردار سازی اور اخلاقی تربیت ایک جزو لاینفک کی طرح موجود رہی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پھر یہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا بندوبست کر کے مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے پیش کرتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کیلئے میدان میں لائی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور امت کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران - ۱۰۴)

تم کو ایسی امت بننا چاہیئے جو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔

اور اس امت کے ذمے شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا:۔

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (الحج - ۷۸)

تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ بنو۔

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک اور بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش بھی کرنا ہے۔ اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالمگیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطۂ نظر سے وابستہ نہیں۔ اس کی دعوت تمام انسانوں کے لئے ہے۔ اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ قیام پاکستان کے محرکات

جدوجہدِ پاکستان کی غرض پاکستان کا وجود و قیام ایک طویل تاریخی عمل کا مرہونِ منت ہے جو جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوا۔ مسلمان اپنے ساتھ ایک منظم اور منفرد ضابطۂ حیات لائے۔ چودہ صدیاں پہلے معرضِ ظہور میں آنے والے مسلمانوں کا روحانی، معاشرتی اور اقتصادی نظام جنوبی ایشیا میں رائج نظام کی ضد تھا۔ برصغیر پر قدیم زمانے سے کفر، بت پرستی اور انسانوں کے درمیان چھوت چھات کا رواج قائم تھا ہندو غالب اکثریت میں تھے اور اُن کی تہذیب و معاشرت یہاں چھائی ہوئی تھی۔ اُن میں ذات پات کی اُونچ نیچ پائی جاتی تھی۔ ایک شودر اونچی ذات کے ہندو کو چھو نہیں سکتا تھا۔ اُن کے کھانا کھانے کے چبوترہ پر نہیں چڑھ سکتا تھا تعلیم صرف اونچی ذات کے ہندوؤں تک محدود تھی۔ چھوٹی ذات کا ہندو تعلیم حاصل کرنا چاہتا تو اس کا مجاز نہ تھا۔

مسلمان پہلی صدی ہجری ہی میں عرب ممالک سے آکر بحر ہند کے آس پاس اور سندھ کے علاقہ میں بسنا شروع ہو گئے تھے۔ مسلمان تنہا نہ آئے تھے بلکہ اپنے ساتھ عقیدۂ توحید، انسانی اُخوت رحمت و شفقت اور مساوات و مُواسات کی اعلیٰ انسانی اَقدار بھی لائے تھے۔ اسلام چوں کہ دعوتی دین ہے اس لئے روز بروز مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جس کے نتیجہ میں برصغیر میں جلد ہی اُن کی ایک خاصی بڑی تعداد ہو گئی، جس نے ہندوؤں کے مقابلہ میں ایک الگ تشخص قائم کر لیا۔ مسلمانوں سے پہلے جو اقوام جنوبی ایشیا میں آئیں، یہاں کی ہندو تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئیں۔ البتہ مسلمان چونکہ ایک بہتر اور کامل نظامِ حیات ہمراہ لائے تھے اس لئے انہوں نے اپنا جُدا معاشرہ قائم کر لیا۔ معاشرتی فرق و امتیاز کی بنا پر شروع ہی سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک کش مکش جاری رہی، جس میں ہندوؤں نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت ختم کرنے کی مسلسل کوششیں کیں مگر مسلم معاشرہ اپنی جداگانہ حیثیت برابر منواتا رہا۔ جنوبی ایشیا میں ہندو مسلم کشمکش کے کئی دور آئے۔ اس کشمکش کا آخری دور انگریزوں کی آمد سے شروع ہوا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنے لئے ایک علیٰحدہ وطن قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور ایک تحریک کی کامیاب تکمیل پر انہیں یہ وطن پاکستان حاصل ہوا۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

پاکستان کے لئے جدّوجہد کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہندو مسلم کشمکش کے آخری دور میں مغربی جمہوریت کے آجانے کے بعد یہ خطرہ تھا کہ مسلمانوں کو اس برصغیر میں بنیادی انسانی حقوق بھی نہ حاصل ہو سکیں گے کیونکہ مغربی طرز حکومت غالب اکثریت والی آبادی کو کُلّی اختیارات سونپ دیتا ہے۔ جنوبی ایشیا کی ہندو اکثریتی آبادی ذات پات اور چھوت چھات کے علاوہ غیر ہندو اقوام کے خلاف انتہائی متعصبانہ رویہ رکھتی تھی۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ مسلمان انفرادی طور پر برابر کے شہری کی حیثیت سے اور اجتماعی طور پر جنوبی ایشیا میں ایک قوم کی حیثیت سے مٹ جاتے۔

مسلم قوم کا طرّۂ امتیاز، عقیدۂ توحید اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مبنی ضابطۂ حیات ہے مسلم معاشرے میں سب افراد بلاتفریق رنگ و نسل، مساوی حقوق اور مساوی مرتبہ و مقام کے حقدار ہیں۔ زندگی کے بارے میں جداگانہ عقائد کے ساتھ مسلم قوم اپنی جداگانہ حیثیت کے بارے میں بھی ایک مخصوص احساس رکھتی ہے۔ مسلم قوم "خَیْرَ اُمَّۃٍ" کی جداگانہ حیثیت کو کسی قیمت پر چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتی۔ لہٰذا پاکستان کے لئے کی جانے والی جدّوجہد درحقیقت اپنی جداگانہ حیثیت برقرار رکھنے اور اپنے اسلامی تشخص کو پروان چڑھانے کے لئے کی گئی تھی۔

جنوبی ایشیا کے مسلمان اس لئے بھی آزاد وطن اور اپنی حکومت کا قیام چاہتے تھے کہ انگریزوں نے یہاں کی حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی، جب کہ اپنے قیام کے دوران وہ یہاں ایسا نظام سیاست رائج کر چکے تھے، جس کے ذریعے ایک تنگ نظر اکثریت ہمیشہ کے لئے مسلمانوں پر مسلّط ہو جاتی۔ مسلمان تیسرے درجے کے شہری بن کر معاشرتی ناہمواری کے غار میں دفن ہو جاتے حالاں کہ اسلامیانِ ہند کی جداگانہ مسلم قومیت تاریخی اعتبار سے مستحکم تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے وسیع علاقوں میں ان کی اپنی اکثریت تھی۔ انگریزی عہدِ حکومت میں مسلمانوں کو حکمرانی کا حق صرف انہی علاقوں میں مل سکتا تھا جہاں وہ اکثریت میں تھے۔ بنا بریں پاکستان کا مطالبہ ہر لحاظ سے جائز اور درست تھا۔

پاکستان کی اساس

مسلمانانِ برصغیر کی جداگانہ تاریخی اور تہذیبی حیثیت اُن کی ایک قدیم آرزو پر منحصر تھی۔ یہ آرزو تھی مسلم معاشرے کا قیام ــــ چنانچہ اسی آرزو نے ایک اساس کا کام دیا اور مسلمانوں نے اسے اپنا نصب العین بنا لیا۔ پاکستان کی یہ اساس خود اس کے بانیوں نے قائم کی ہے۔ علامہ محمد اقبال اور محترم محمد علی جناح اس کے معمار ہیں۔ پاکستان کی اصل اساس کو جاننے کے لئے انہی کے خیالات کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبال نے خطبۂ الٰہ آباد ۱۹۳۰ء میں مسلمانانِ برصغیر کے جداگانہ وجود اور اُن کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حالت سدھارنے کے لئے ایک اسلامی ریاست کے قیام کی اہمیّت پر زور دیا۔ ان کے یہ الفاظ نہ صرف اس وقت کے مسلم ہندوستان کے مسائل کا حل لئے ہوئے ہیں بلکہ پاکستان کی اساس کی واضح نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:

" اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لئے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے لیکن شریعت کا نفاذ اور ارتقاء ایک آزاد مسلم ریاست کے بغیر اس ملک میں ممکن نہیں۔"

محترم محمد علی جناح نے پاکستان کے اس تصوّر اور اس کی اساس کو تحریکِ پاکستان کے دوران اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی متعدد بار واضح کیا۔ ان کی تقاریر کے مندرجہ ذیل دو اقتباسات قیامِ پاکستان سے پہلے کے ہیں اور تیسرا بعد کا۔ ان سے اساسِ پاکستان کی منظر کشی ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

۱۔ "مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں، جہاں وہ خود اپنے ضابطۂ حیات، اپنے تہذیبی ارتقا، اپنی روایات اور اسلامی قانون کے مطابق حکمرانی کر سکیں۔"

(اجلاس مسلم لیگ پشاور منعقدہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۵ء)

۲۔ "ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادات اور اخلاقیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم مسلمانوں کا دین، ایمان اور قانونِ حیات ہے یعنی مذہبی، معاشرتی، تجارتی تمدنی، عسکری اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔ ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اس کا بغور مطالعہ کریں تاکہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی ہدایت کا باعث ہو۔

۳۔ قیامِ پاکستان کے بعد اپنے نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"ہمارا نصب العین یہ تھا کہ ہم ایک ایسی مملکت کی تخلیق کریں جہاں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب و تمدن کی روشنی میں پھلے پھولے اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصوّر کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے۔

(حکومت پاکستان کے افسران سے خطاب، اکتوبر ۱۹۴۷ء)

قراردادِ مقاصد

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد جب بانیانِ پاکستان اس آزاد مملکت کا دستوری خاکہ مرتّب کرنے لگے تو ابتدائی مرحلے (مارچ ۱۹۴۹ء)

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی۔ یہ قرارداد مقاصد پاکستان کے دستور کا دیباچہ بھی ہے، اور اس اقرار کی تفسیر بھی جو اس مملکت کے باشندوں نے اپنے آپ سے اور اپنی آنے والی نسلوں سے کیا ہے۔ قرارداد مقاصد اس کائنات پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت تسلیم کرتی ہے اور باشندگان پاکستان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کتاب وسنّت کی تعلیمات کے مطابقت ڈھالنے کے عزم کا اعلان ہے۔ بعدازاں وضع کئے جانے والے ملکی دساتیر کی متعدد دفعات نہ صرف اسلامی نظریۂ حیات سے مطابقت رکھتی ہیں، بلکہ ان میں پاکستان کو ایک اسلامی ملک کی حیثیت سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ پاکستان کے دستور میں حکومت کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر، ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصول وتصورات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب دے جو کتاب وسنّت میں متعین ہوں۔

قراردادِ مقاصد کا متن

بانیانِ پاکستان نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ۱۲ر مارچ ۱۹۴۹ء کو ایک باضابطہ قراردادِ مقاصد منظور کی۔ یہ قرارداد پاکستان کی نظریاتی اور عملی سمت متعین کرتی ہے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر اس کا مکمل متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

★ ۔ ہرگاہ کہ تمام کائنات پر اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور ذات باری تعالیٰ نے ریاست پاکستان کو اس کے باشندوں کے ذریعے جو اقتدار اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر ودیعت کیا ہے، وہ ایک مقدس امانت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے یہ دستور ساز اسمبلی عوام پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے پاکستان کی آزاد اور خود مختار ریاست کیلئے دستور مرتب کرنے کا عہد کرتی ہے۔

★ ۔ ہرگاہ کہ ریاست اپنے اقتدار واختیارات کا استعمال عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے کرے گی جس میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور معاشرتی انصاف کے اصولوں کی اسلامی تصریحات کے مطابق مکمل تعمیل ہوگی۔

★ ۔ جس میں مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں اپنی زندگی قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی تعلیمات ومقتضیات کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنایا جائے گا۔

★ ۔ جس میں اقلیتوں کے لئے اس امر کا مناسب وموزوں اہتمام کیا جائے گا کہ وہ اپنے مذہب وعقیدے پر آزادی سے کاربند رہ سکیں اور اپنی ثقافت کو ترقی دے سکیں۔

★ ۔ جس (دستور) کے ذریعے پاکستان میں شامل یا اس سے الحاق شدہ علاقے یا وہ علاقے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

جو بعد میں پاکستان میں شامل ہوں گے یا اس سے ملحق ہوں گے وہ ایک وفاق کی تشکیل کریں گے، جس میں وحدتوں کو خود مختاری حاصل ہوگی اور ان کی سرحدوں اور کے اقتدار و اختیارات کی حدود کا تعین کیا جائے گا۔

★ - جس میں قانون اور اخلاق عامہ کی حدود کے اندر بنیادی حقوق بشمول مساوات، حیثیت و مساوی مواقع، قانون کی نظر میں مساوات اور سماجی اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادی فکر و اظہار اور آزادی عقیدہ و اعتقاد اور عبادت اور تنظیم سازی کی آزادی حاصل ہوگی۔

★ - جس میں اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کے لئے مناسب دفعات کا اہتمام کیا جائے گا۔

★ جس میں عدلیہ کی آزادی کا مکمل تحفظ ہوگا۔

★ جس میں وفاق کے علاقوں کی سالمیت، وفاق کی آزادی اور اس کے ان تمام حقوق کا، جن سے خشکی، سمندر اور فضا پر حاکمانہ اختیارات شامل ہیں، تحفظ کیا جائے گا۔

تاکہ اہل پاکستان کو خوشحالی نصیب ہو اور وہ اقوام عالم میں اپنا جائز اور باوقار مقام حاصل کر سکیں اور عالمی امن و ترقی اور تمام انسانیت کی خوشحالی کے لئے اپنا بھرپور کردار انجام دے سکیں۔

"نظریۂ پاکستان"

نظریۂ پاکستان کے چار مدارج ہیں جن سے گذر کر قوم نظریۂ پاکستان تک پہنچی۔ وہ یہ ہیں:-

(۱) مغربی سیاسی تصورات کا نفاذ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ایک نہایت کٹھن مرحلہ لایا۔ وہ یا تو برطانوی ہند کی دستوری اصلاحات کے نتیجے میں ہندو اکثریتی آبادی سے مغلوب ہو کر ہمیشہ کے لئے اپنا مستقبل تاریک بنا دینے پر راضی ہو جاتے، یا انگریز حکومت اور ہندو قوم کی ناراضی کی پروا کئے بغیر اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے جدوجہد کرتے۔

(۲) برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے اسلامی تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف جدوجہد کی راہ اپنائی، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس تیز تر تحریک کا رُخ ایک آزاد مسلم ریاست کی تشکیل کی جانب موڑ دیا۔

(۳) مفکر و معمار پاکستان دونوں کے نزدیک برصغیر کے دستوری مسائل کا حل ایک ایسی مملکت کی تخلیق تھا جہاں "ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں، جو ہماری تہذیب اور تمدن کی روشنی

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں پھلے پھولے، اور جہاں معاشرتی انصاف کے اسلامی تصوّر کو پوری طرح پنپنے کا موقع ملے"۔

(۴) قیام پاکستان کے بعد قرار دادِ مقاصد اور اس مملکت کے دستور کی متعدد دفعات مسلمانوں کو اپنی زندگیاں انفرادی اور اجتماعی طور پر ہر لحاظ سے اسلام کے ان اصولوں اور تصوّرات کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب دلانے سے متعلق ہیں، جو قرآن وسنت میں متعیّن ہیں۔

پاکستان کی اساس سے واقف ہو جانے کے بعد ہمارے لئے نظریۂ پاکستان کو سمجھنا نہایت آسان ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود برّصغیر کے مسلمان اپنا الگ تشخّص ہر دور میں عزیز رکھتے تھے۔ ان کا یہ تشخّص نہ تو ہندو اکثریت کے درمیان ہزار برس گزارنے سے مسخ ہوا، اور نہ انگریز کی حکمرانی کے دوران ہونے والے جبر و استبداد سے مٹ سکا۔ اس کے برعکس وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جداگانہ قومیت کا احساس وسیع تر اور واضح تر ہوتا گیا۔ جس کی بڑی وجہ مسلم نشاۃ ثانیہ کے لئے کوششیں تھیں۔ اس جداگانہ قومیت کی بنیاد پر مسلمانوں نے اپنا الگ آزاد وطن حاصل کیا۔ جہاں وہ اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ لہٰذا ہم نظریہ پاکستان کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"نظریۂ پاکستان کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ اس خطۂ ارض پر جسے مسلمانوں نے اپنے جداگانہ تشخّص کے بھرپور اظہار کے لئے آزاد مملکت کے طور پر حاصل کیا ہے وہ اپنے عقیدے اور دین کی روشنی میں آزادی سے زندگی بسر کریں۔ جہاں وہ اپنی تہذیب و تمدن اور ملی ورثے کو پروان چڑھائیں۔ ان کی شناخت اسی نظریے سے ہو اور وہ اپنے لئے ایک اسلامی معاشرہ قائم کریں"۔

نظریۂ پاکستان ایک طرف قوم کے وجود و بقا کا جواز ہے تو دوسری طرف افراد قوم کو اسلام بہ حیثیت اصول زندگی و ضابطۂ حیات کا پابند کرتا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر میں برطانوی حکومت کے اختتام پر یہاں کے مسلمانوں کی ایک فعال تحریک کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔ اس تحریک کے دوران حاکم کی جانب سے جبر و تشدد بھی ہوا اور ہم وطنوں کی طرف سے مذہبی تعصّبات سامنے آئے۔ ایک طرف مغربی تہذیبی اقدار سے ٹکر ہوئی تو دوسری طرف اکھنڈ بھارت بنائے جانے کا غوغا سنائی دیا۔ اس طویل اور پرعزم تحریک کے ہر موڑ پر برصغیر کے مسلمانوں کو صحیح سمت دکھانے والا ایک ہی نعرہ تھا "لا الٰہ الا اللہ" اور جب

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

مقامی آبادی کو حکمرانی سونپے جانے کا چرچا ہونے لگا تو یہی، پاکستان کا مطلب ٹھہرا۔

مختصر یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ یعنی ایک ایسی مملکت جس کا قیام اور وجود ایک نظریئے سے منسلک ہے۔ اس نظریے کی بنیاد کڑی اسلامی ضابطۂ حیات ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے سوویت یونین اشتراکی نظریہ اپنائے ہوئے ہے اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں آزاد معاشرہ اور سرمایہ داری کا نظریہ ہے۔ اسی طرح کے جداگانہ نظریات بعض دوسرے ممالک کے بھی ہیں۔ پھر ایک ہی یا ملتے جلتے نظریے کو کئی ممالک نے اپنایا ہے یعنی بعض ممالک میں ایک ہی بنیادی نظریہ ان کے مخصوص تاریخی اور جغرافیائی پس منظر میں ڈھل گیا ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ نظریہ پاکستان کی اساس قومی جذبات کا اجتماع ہے، نظریۂ پاکستان مسلمانان برصغیر کے مخصوص تاریخی رویے بتدریج ابھرا ہے۔ اس نظریہ کی ابتداء کسی ایک فرد مقام یا واقعہ سے نہیں ہوئی۔ آٹھ سو سالہ حکمرانی کے احساس زیاں، مستقبل کے لئے آزادی کی امنگ، اور برصغیر میں پھر سے اسلامی معاشرے کے قیام کی آرزو، اس نظریئے کے سرچشمے ہیں اس اعتبار سے ہم آئندہ باب میں پاکستان کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہیں، جو برصغیر میں اسلامی معاشرے کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۷۔ تاریخ تحریکِ پاکستان

۱۔ تحریک پاکستان کی تاریخ قائد اعظم نے ایک فرمایا تھا کہ پاکستان اسی روز قائم ہو گیا تھا جب پہلے مسلمان نے برصغیر کی سرزمین پر قدم رکھا تھا اور جب پہلے ہندو نے اسلام قبول کیا تھا۔ قائد اعظم کا اشارہ برصغیر کی ایک تاریخی حقیقت کی طرف تھا کیونکہ اس دن سے برصغیر کو ایک نئی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہاں اسلامی معاشرہ قائم ہوا اور سینکڑوں سال تک مسلمانوں کا سیاسی اقتدار قائم رہا۔ اس دوران مسلمانوں نے برصغیر کے لوگوں کو امن دیا، انصاف دیا، خوشحالی دی، نیا تمدن اور نئی تہذیب دی ان سب کا سرچشمہ ان کا دین تھا۔ اسی دین کی تعلیمات کو پھر سے اُجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں نے اب نئے تقاضوں کے مطابق اپنا آزاد وطن پاکستان قائم کیا ہے۔ پاکستان کا تاریخی پس منظر اس بات کا نفس مضمون ہے۔

۲۔ اسلامی معاشرے کا قیام جنوبی ایشیا کے ساتھ عربوں کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ دونوں خطوں کے درمیان بحیرۂ عرب آمد و رفت کا ایک آسان راستہ رہا ہے۔ جہاں ابتداً چھوٹے جہاز اور کشتیاں تجارتی مقاصد کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ زمانہ قدیم سے عرب تاجر جنوبی ایشیا سے تجارتی مال ان چھوٹے جہازوں کے ذریعے یمن کی بندرگاہ عدن لے جاتے، وہاں سے خشکی کے راستے یہ مال شام، مصر اور یورپ کی منڈیوں میں پہنچایا۔ یہی عرب تاجر ظہور اسلام کے بعد جنوبی ایشیا میں اسلام کے اوّلین مبلغ بنے۔ ان کے اسلامی کردار سے متاثر ہو کر ساحلی علاقوں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ابتدائی دور میں جو علاقے اسلام سے متاثر ہوئے ان میں ساحل گجرات، مالابار، کارومنڈل کا ساحل، جزائر مالدیپ اور لنکا قابل ذکر ہیں۔ لنکا کا راجہ مسلمان حکمرانوں سے بڑے خوشگوار تعلقات رکھتا تھا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں لنکا سے کچھ جہاز جن پر عازمین حج اور ان مسلمانوں کی بیویاں اور بچے بھی تھے، جو لنکا میں وفات پا گئے تھے، عرب کی طرف جا رہے تھے۔ باد مخالف کی وجہ سے وہ جہاز سندھ کی بندرگاہ دیبل کی طرف چلے گئے۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سندھ کے لوگوں نے ان جہازوں کو لوٹ لیا اور عورتوں اور بچوں گرفتار کرلیا۔

۳۔راجہ داہر کے مظالم حجاج بن یوسف کو جو اس وقت عراق کا گورنر تھا، اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنا سفیر یہاں کے راجہ داہر کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ مسلمان قیدیوں کو رہا کیا جائے اور مال و اسباب واپس کیا جائے۔ داہر نے جواب دیا کہ یہ سب کام بحری ڈاکوؤں کا ہے اور ان پر اس کا کوئی زور نہیں ہے۔ اس واقعے سے پہلے بھی داہر کے خلاف اسلام دشمنی کی بعض شکایات تھیں۔ حجاج نے اب اسے قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کیا اور محمد بن قاسم کی کمان میں مسلمانوں کی ایک فوج سندھ روانہ کی۔ اس زمانے میں سندھ کی سرحد میں جنوبی پنجاب، بلوچستان مکران کے مشرقی علاقے شامل تھے۔ انتظامی سہولت کے لئے انہیں چار صوبوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ صوبے (۱) سہوان (۲) بہمن آباد (۳) اُچ اور (۴) ملتان تھے۔ موجودہ روہڑی کے قریب اس سلطنت کا دارالحکومت اَلور تھا۔ دو سال بعد محمد بن قاسم نے راجہ داہر اور اس کے جانشین کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کرلیا۔ یوں جنوبی ایشیا کا یہ علاقہ مسلمانوں کی عظیم سلطنت کا ایک اہم جزو بن گیا۔ یہاں چند سو عرب مسلمانوں کو آباد بھی کیا گیا، اور ان کے حسن سلوک سے مقامی آبادی نے بھی اسلام قبول کرلیا اس طرح برِصغیر میں اسلامی معاشرے کی بنیاد پڑ گئی۔

شمالی پنجاب میں مسلمانوں کی باقاعدہ آمد گیارھویں صدی عیسوی کے شروع میں ہوئی۔ ان دنوں سلطان محمود غزنوی کی سرحد لاہور کے ہندو حکمران راجہ جے پال کے علاقے سے ملتی تھی جو مسلسل سرحدی خلاف ورزیاں کرتا رہتا تھا۔ وہ مقامی مسلمان باشندوں پر بھی زیادتی کر رہا تھا۔ اس نے سلطان محمود سے کئی دفعہ وعدہ کیا کہ وہ نہ سرحدی خلاف ورزی کرے گا اور نہ ہی مقامی مسلمان باشندوں پر زیادتی کرے گا لیکن ہر بار خلاف ورزی کرتا رہا۔ جے پال کی مسلسل وعدہ خلافیوں سے تنگ آکر سلطان محمود نے شمال مغرب کی طرف سے پنجاب پر کئی حملے کئے اور آخر کار اس علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اسی زمانے جنوبی ایشیا کے شمال مغربی حصے میں شیخ علی ہجویریؒ (جنہیں عام طور پر داتا گنج بخشؒ کہتے ہیں) شیخ اسماعیل لاہوریؒ، سلطان سخی سرورؒ اور دیگر صوفیائے کرام کی کوششوں سے مقامی لوگوں نے خاصی تعداد میں اسلام قبول کرلیا۔ اس طرح خیبر سے لے کر بحیرۂ عرب کے ساحل تک تمام علاقے میں اسلامی معاشرہ قائم ہوگیا۔

۴۔پہلا مسلم حکمران جنوبی ایشیا کے شمالی اور وسطی علاقے میں مسلمان حکومت کے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

قیام کا سہرا سلطان محمد غوری کے سر ہے۔ اس نے ترائن کے میدان میں ہندو حکمران پرتھوی راج کو شکست فاش دے کر شمالی حکومت کے دروازے مسلمانوں کے لئے کھول دیئے۔ اس کے ساتھ ہی دہلی اور اجمیر پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ اسی دوران اس کے نائب قطب الدین ایبک نے گجرات اور گوالیار اور اس کے ایک فوجی سردار بختیار خلجی نے بہار اور بنگالہ فتح کر کے اسلامی حکومت میں شامل کر دیئے۔ جنوبی ایشیا کا پہلا مسلمان حکمران قطب الدین ایبک تھا۔ جو ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے دہلی کو اپنا دارالخلافہ مقرر کیا اور یہاں ایک بہت بڑی مسجد قوۃ الاسلام کی بنیاد رکھی جس کا ایک مینار آج تک قطب مینار کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ہی جنوبی ایشیا پر مسلمانوں کی براہ راست حکمرانی کا ایک طویل دور شروع ہوا جو ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی معزولی کے ساتھ ختم ہوا۔

۵۔ اشاعتِ اسلام اور صوفیاء اگرچہ مسلمان حکمرانوں میں التمش جیسے صوفی اور اور ناصر الدین محمود جیسے درویش مزاج اور سادہ طبع افراد موجود تھے، مگر جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت کا کام صوفیائے کرام کی کوششوں کا مرہون منت ہے ان کے دروازے ہر ایک کے لئے خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، امیر ہو یا غریب، کھلے رہتے تھے۔

صوفیاء کا کام ہر ایک کی بہتری کے لئے "رشد و ہدایت" تھا۔ ایک ہندو کے قبول اسلام سے انہیں جتنی خوشی ہوتی اتنی ہی ایک مسلمان کے ترک گناہ سے ہوتی۔ وہ ہر ایک کو، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایک بلند تر روحانی زندگی کا پیغام دیتے۔ صوفیاء کے اسی برتاؤ سے کفار اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ اشاعت اسلام کے علاوہ صوفیائے کرام نے مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لئے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ان سے جنوبی ایشیا میں مسلمان معاشرہ مضبوط ہوتا گیا۔ اس طرح ایک طرف مسلمان حکمرانوں نے مسلمان معاشرے کے قیام کی ظاہری ہیئت قائم کی تو دوسری طرف صوفیائے کرام کی تعلیمات نے اسے پختگی دی۔ جن بزرگانِ دین نے جنوبی ایشیا میں اسلام کی اشاعت اور مسلمان معاشرے کے قیام کے لئے گراں قدر خدمات سرانجام دیں، ان میں خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ، بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ شیخ بہاؤ الدین ذکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ رکن الدین رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت رحمۃ اللہ علیہ نے ملتان، اچ اور سندھ کے علاقوں میں اشاعت اسلام کی۔

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

۶۔ مسلمانوں کا سیاسی انحطاط

جب تک مسلمان سیاسی اور روحانی طور پر مضبوط رہے، ہندوؤں کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی، مگر چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد تخت کے دعویداروں میں جو خانہ جنگی شروع ہوئی، اس نے مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بہت نقصان پہنچایا۔ رہی سہی کسر تیمور کے حملے نے پوری کر دی۔ فیروز تغلق کی وفات سے لے کر اکبر کی تخت نشینی تک اندازاً ڈیڑھ سو سال کے عرصے میں سوائے سکندر لودھی کے اٹھائیس سالہ دور حکومت کے جنوبی ایشیا میں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ سیدوں کے دور حکومت میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صوبائی حکومتیں بہت طاقتور ہو گئیں اور ہندوؤں کو بھی سر اٹھانے کا موقع مل گیا۔ پنجاب میں کھوکھروں نے تباہی مچائی اور راجستھان اور وجے نگر میں ہندوؤں نے سر اٹھایا۔ ڈیڑھ سو سال کا یہ عرصہ مسلمانوں کی اخلاقی پستی، روحانی تنزل، بے حسی، بے عمل زندگی اور بے راہ روی کا دور ہے۔ اس عرصے میں نہ تو خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے پائے کا کوئی صوفی پیدا ہوا، جو مسلمانوں کی روحانی تربیت کرتا اور نہ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ جیسا کوئی عالم پیدا ہوا، جو اپنی قوت تحریر سے ان کی سوچ بدلتا۔ ہندوؤں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ہندوؤں کے سیاسی غلبہ کو قائم کرنے کی تحریک کی قیادت جنگجو راجپوتوں نے سنبھالی۔ ایک طرف تو بھگتی تحریک کی آڑ میں مسلمانوں کے روحانی نظام کو درہم برہم کر کے ہندو مت میں ضم کرنے کی کوشش کی گئی، دوسری طرف مسلمانوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے مسلمانوں کو مرتد کرنا شروع کر دیا۔

ہندوؤں کے سیاسی غلبے کا خواب تو جنگ کنواہہ میں ظہیر الدین بابر کے ہاتھوں رانا سانگا کی شکست کے بعد ختم ہو گیا مگر ہندو مسلم بھائی بھائی کے نام پر مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کو ختم کرنے کی کوشش کو اکبر کی لبرل پالیسی سے بڑی تقویت ملی۔ اکبر نے شیخ مبارک اور اس کے بیٹوں ابوالفضل اور فیضی کے زیر اثر ایسی مذہبی پالیسی اختیار کی، جس سے مسلم تشخص کمزور ہوتا گیا۔ اس طرح ایشیا میں اسلام کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ جن لوگوں نے اکبر کی مذہبی پالیسی کی مخالفت کی، ان کو یا تو شہید کروا دیا گیا، یا پھر ملک کے مختلف حصوں میں منتشر کر دیا گیا۔ البتہ اکبر کے عہد میں ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے تھے۔ وہ خوش تھے کہ مسلمانوں نے ان جیسی رسوم اور لباس اپنا لیا ہے۔ خود بادشاہ وقت

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

اور حکومت کے عمال اس ظاہری تبدیلی میں پیش پیش تھے، جب کہ اکثریت اسلامی عبادات و معاملات سے غافل ہو چکی تھی۔

۷۔ مجدّدِ الفِ ثانی کی تحریک

ان مایوس کن حالات میں کچھ ایسے باہمت اور باغیرت لوگ بھی تھے جو احیائے شریعت کی خاطر سر پر کفن باندھ کر میدان میں نکلے۔ ان میں جونپور کے قاضی ملا محمد یزدی، قاضی بنگال میر یعقوب اور قاضی لاہور برنی کے نام قابل ذکر ہیں۔ شاہی دربار سے باہر حضرت خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ تحریک احیائے دین کے روح رواں تھے۔ اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی سے گو اسلام کو سنبھالا مل گیا، مگر اکبر کا لگایا ہوا زخم اتنا کاری تھا کہ وہ جلدی مندمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس زخم کے لئے کسی مرد حق کی ضرورت تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ کام حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی سے لیا اور ان کی اصلاحی تحریک سے جنوبی ایشیا میں اسلام کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا اور مسلمان معاشرے کو استحکام نصیب ہوا۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں، اس دور میں وحدت ادیان کی تحریکیں زور پر تھیں۔ ایک طرف اکبر نے تمام ادیان کو ملا کر دین الٰہی بنایا تو دوسری طرف بھگت کبیر، بابا نانک اور بھگتی تحریک کے دوسرے راہنما اسلام اور کفر میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک ملے جلے مذہب کی تلقین کر رہے تھے۔ وہ عوام کو تاثر دے رہے تھے کہ رام اور رحیم ایک ہی ذات کے دو نام ہیں۔ ایسی تحریکوں کا لازمی نتیجہ جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے ہندوؤں میں جذب ہونے کی صورت میں نکلتا۔ اسی طرح تصوف میں وحدت الوجود کے نظریئے کے دور رس اثرات پیدا ہوئے۔ "وحدت الوجود" پر یقین رکھنے سے کفر و اسلام کی تمیز اُٹھ جاتی ہے۔ بنیادی عقائد میں تبدیلی شرک کی طرف لے جاتی ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی مسلمانوں کو ایک الگ قوم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے مسلمانوں کو ہندوؤں میں جذب ہونے سے بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے وحدت الوجود کی جگہ مسلمانوں کے سامنے "وحدت الشہود" کا نظریہ پیش کیا۔ جسے ماننے سے ان کا جداگانہ وجود باقی رہا۔ اس کے ساتھ ہی صدیوں کا جمود اور تعطل ختم ہو کر ان میں عمل و سعی کا ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ حضرت مجدد الف ثانی نے بھٹکے ہوئے علمائے سُوا اور صوفیائے خام کے خلاف جہاد کیا اور تصوف کو غیر شرعی رسوم سے پاک کر کے مسلمانوں کی روحانی تربیت اور ترقی کے لئے راہ ہموار کی۔ انہوں نے مسلمان معاشرے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

میں غیر اسلامی عقائد، افکار اور اعمال کی نشاندہی کی اور انہیں بتایا کہ اگر وہ بحیثیت ایک قوم کے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انہیں کفر و شرک کی باتیں ترک کر کے کافروں سے ممیز ہو کر رہنا ہوگا۔

۸۔ دعوت و تبلیغ ان مقاصد کے حصول کے لئے آپ نے سب سے پہلے اکبر کے با اثر درباریوں اور راسخ العقیدہ امراء سے تعلقات بڑھائے اور انہیں ترویج شریعت کی طرف توجہ دلائی۔ دوسری طرف آپ نے اسلامی ذہن رکھنے والے مریدوں کی جماعت تیار کی جو آپ کے مشن کی تکمیل کے لئے ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ حضرت مجدد الف ثانی نے ان کارکنوں سے رابطہ قائم رکھنے کے لئے خطوط نویسی کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ کسی امیر یا مرید کے نام ایک خط تحریر فرماتے تو آپ کے مرید مل کر اس کی سینکڑوں نقلیں تیار کر کے پورے ملک میں پھیلا دیتے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لٹریچر بڑا اہم مقام ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی کے علاوہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مسلمان معاشرے کی تشکیل نو میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۔ مسلم معاشرے کے دور ثانی کا عروج و زوال

حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی سعی و کاوش کا یہ نتیجہ نکلا کہ جہانگیر کے عہد حکومت میں جنوبی ایشیا میں ایک بار پھر اسلام کا بول بالا ہو گیا۔ شاہجہان کے زمانے میں اسے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ شاہجہان خود نماز روزے کا پابند تھا اور شرع کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرتا۔

۲۔ اورنگ زیب عالمگیر کی تبلیغی مساعی پھر اورنگ زیب نے شاہی دربار سے آزاد خیال عناصر کو بالکل ختم کر دیا۔ اورنگ زیب نے ملک کا نظام شریعت کے اصولوں پر قائم کیا اور عدل و انصاف کا محکمہ علماء کے سپرد کر دیا۔ اس وقت اسلامی قوانین کے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے تدوین فقہ کا کام شروع کرایا۔ اس طرح فتاویٰ عالمگیری کے نام سے فقہ کی ضخیم کتاب مرتب ہوئی۔ اس کے عہد میں اسلامی مملکت کی سرحدیں دُور دُور تک پھیل گئیں۔ اس مملکت میں ابھی استحکام نہ آیا تھا۔ دکن میں مرہٹوں کا بڑا زور تھا جسے اورنگ زیب کے جانشین نہ روک سکے۔ ادھر جہانگیر کے زمانے میں یورپی تاجروں کی جماعتیں ملک میں اپنا کاروبار پھیلا کر با اثر ہو رہی تھیں۔ ابتداء میں تجارت کی غرض سے آنے والی کمپنیوں نے اب سیاسی اقتدار کا خواب دیکھنا

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

شروع کر دیا۔ اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہونے کی دیر تھی کہ خانہ جنگیوں اور امراء کی سازشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پورا ملک سیاسی انتشار کا شکار ہو گیا۔ دور دراز علاقوں کے خود مختاری اختیار کی اور مرہٹے بڑھتے بڑھتے دہلی تک آپہنچے۔ ایسے میں اگر احمد شاہ ابدالی بروقت انہیں پانی پت کے میدان میں شکست نہ دے دیتا تو جنوبی ایشیا پر ہندو راج ایک حقیقت بن جاتا اور مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی غلامی کا شکار ہو جاتے۔

۳۔ خانہ جنگی اٹھارویں صدی جنوبی ایشیا کی تاریخ میں مسلم معاشرتی اقدار اور سیاسی زوال پر مبنی ہنگامہ خیز صدی گزری۔ اس صدی کے خاص واقعات کا خلاصہ یوں ہے۔

مرکزی حکومت کے ارکان ایرانی، تورانی یا شیعہ سنی گروپوں میں بٹ گئے اور خانہ جنگی کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے نتیجے میں صرف پچاس سال (۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۷ء) کے عرصے میں تخت دہلی پر دس تاجدار بٹھائے اُتارے گئے۔ صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے۔ دکن میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل طاقت بن گئی۔ دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اودھ کی وزارت نے شہنشاہیت کی شکل اختیار کر لی۔ دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت اُبھری اور شمال مغرب میں سکھ جو اب تک ایک مذہبی گروہ تھے، سیاسی طاقت بن کر اُبھرے۔ ادھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی فوجی طاقت بڑھانی شروع کی اور ہندوؤں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے بنگال پر قبضہ کر لیا۔

۴۔ شاہ ولی اللہ اور مسلم معاشرے کی تشکیل نو جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اخلاقی قدروں کی اس گراوٹ کا نتیجہ تھا جو مسلمان معاشرے میں پیدا ہو چکی تھی۔ اسے حیاتِ نو دینے کے لئے ضروری تھا کہ معاشرے کا تجزیہ کیا جائے۔ اور ان عوامل کی نشان دہی کی جائے جو مسلمان معاشرے کے زوال کا اسباب بنے۔ پھر ان تدابیر کو واضح کیا جائے جن پر چل کر ہمارا معاشرہ صحت یاب ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عظیم کام کے لئے اپنے بندے حضرت شاہ ولی اللہ کو منتخب کیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے افکار

حضرت شاہ ولی اللہ بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل "فکّ کُلِّ نظام" ہے۔ یعنی ہمہ گیر اور مکمل انقلاب جو معاشرے کے معاشی، سیاسی، اقتصادی، غرض ہر ایک ڈھانچے کو بدل ڈالے۔ اصلاح کی کوئی ایک یا چند تدبیریں کارگر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

نہ ہوں گی بلکہ پرانے فرسودہ نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ نظام نو تعمیر کیا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے افکار کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے۔

(الف) سیاسیات اور نظام حکومت کا بنیادی اصول اللہ تعالیٰ کی حاکمیت سے وابستہ ہے۔ سارے انسان برابر ہیں اور کسی حاکم کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔

(ب) بنیادی حقوق میں ہر کسی کے لئے روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ خاندان کی کفالت ہو سکے ضروری ہو۔ اسی طرح عدل و انصاف، جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت، حق ملکیت اور حقوق شریعت میں یکسانیت، ہر باشندہ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(ج) اقتصادی اصول میں دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لئے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لئے دفاعی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ جو پیداوار یا آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو خلاف قانون ہے۔ ایسا کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقے میں محدود کر دے ملک کے لئے تباہ کن ہے۔

(د) قرآن و حدیث کی تعلیم ہر کسی کے لئے عام کی جائے اور اسے لوگوں کی زبان میں سمجھایا جائے۔

جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دور حکومت میں دفتری اور تعلیمی زبان فارسی تھی۔ بہت کم لوگ عربی جانتے تھے۔ چنانچہ عام تعلیم یافتہ مسلمان بھی قرآن مجید سے جو ہدایت کا سرچشمہ ہے، ناواقف ہوتے جا رہے تھے۔ شاہ صاحب نے لوگوں کو سمجھایا کہ کلام اللہ کے نازل ہونے کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ مقامی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر آپ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا پھر مقدمہ فی ترجمۃ القرآن میں قرآن مجید کے مترجموں کی رہنمائی کے لئے کارآمد ہدایتیں درج کیں۔ آپ نے حدیث کے بارے میں اہم کتابیں تصنیف کیں اور عوام کے لئے بھی مختصر احادیث کی کتابیں مرتب کیں جن میں "چہل حدیث" بہت مشہور ہے۔

مسلم اقتدار کا خاتمہ

جنوبی ایشیا کا مسلمان معاشرہ اس قدر تنزل پذیر ہو چکا تھا کہ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے پیروکاروں کی تدابیر بھی مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ شاہ صاحب کے پیروکاروں نے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سید احمد رحمۃ اللہ اور شاہ اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ کی سرکردگی میں سرحد میں سکھوں کے خلاف جہاد کیا اور بالاکوٹ کے مقام پر کفر کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اسی طرح بنگال میں سراج الدولہ اور دکن میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی تمام تر کوششیں غداروں کی وجہ سے بار آور نہ ہو سکیں۔ انگریز بنگال میں اپنے قدم مضبوط کرنے کے بعد آہستہ آہستہ تخت دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ اور ایک وقت وہ آگیا جب مغل بادشاہ کی حکومت دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی۔ سب کچھ جاتا دیکھ کر مسلمان انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے مگر اب نہ ان کے پاس قیادت تھی اور نہ انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے طاقت۔ نتیجہ ظاہر تھا، جو غیرت مند تھے، لڑتے ہوئے مارے گئے، جو بچ گئے ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ اور یوں ۱۸۵۷ء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان تقریباً آٹھ سو سال حکومت کرنے کے بعد خود محکوم ہو گئے۔

مسلمانوں کو سیاسی طور پر تباہ کرنے کے باوجود انگریز مسلمانوں سے خائف تھے وہ انہیں اپنی سلطنت کے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ساتھ ہی مسلمانوں کو معاشی طور پر تباہ و برباد کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی جائیدادیں اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں، ملازمتوں کے دروازے ان پر بند کر دیئے گئے۔ جب کسی دفتر میں کوئی جگہ خالی ہوتی تو اشتہار میں کہا جاتا کہ مسلمان اس اسامی کے لئے درخواست نہیں دے سکتے۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ چپڑاسی کی اسامی کی توقع کر سکتے تھے۔ فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دے کر تمام پڑھے لکھے مسلمانوں کو بے کار کر دیا گیا۔ سر ولیم ہنٹر اپنی کتاب "OUR INDIAN MUSALMANS" میں لکھتا ہے کہ "آج سے ایک سو ستر سال پہلے کسی عالی نسب مسلمان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ کبھی مفلس اور بدحال ہو۔ لیکن اب ایسے شخص کے لئے ناممکن ہے کہ وہ خوشحال رہ سکے۔ مسلمان گھرانوں میں فاقہ کشی کا دور دورہ ہے، وہ قرض کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں، کوئی ہندو قرض خواہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو فوری طور پر ان کی جائیداد ضبط ہو جاتی ہے۔

۶۔ مسلم ثقافت کی بربادی مسلمانوں کے ثقافتی مراکز کو انگریزوں نے جی بھر کر لوٹا۔ کتب خانوں کی نادر کتابیں انگلستان بھیج دیں۔ جن میں سے اکثر آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ کسی قوم کو تباہ کرنے کا سب سے مہلک طریقہ یہ ہے کہ اس کے نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کو تباہ کر دیا جائے۔ انگریزوں نے مسلمان مدرسوں کے ساتھ ملحقہ املاک ضبط کر لیں۔ یہ مدرسے معاشی بدحالی کا شکار ہو کر بند ہونے لگے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان جو کبھی معاشرے میں معزز و محترم تھے،

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے۔

مسلمانوں میں سے جنہوں نے انگریزوں کے خلاف زبان کھولی، انہیں عبرت ناک سزائیں دی گئیں مختصر یہ کہ مسلمان بد دل ہو گئے، ان پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی اور اس کے ساتھ ہندو، جنہیں انگریز کی سرپرستی حاصل تھی، دن دگنی رات چوگنی ترقی کرنے لگے۔

غرض مسلمان جو برصغیر میں فاتح کی حیثیت سے آئے تھے ایک طویل عرصے تک کامرانی کے ساتھ پھلے پھولے لیکن پھر اپنی نادانی اور انگریز کی ہوشیاری سے سیاسی اقتدار بھی گنوا بیٹھے اور معاشرتی برتری بھی باقی نہ رہی۔

نوٹ :۔ چونکہ یہ کتاب فارغ التحصیل طلبہ کے لئے تحریر کی جا رہی ہے۔ اس لئے تحریک پاکستان کی باقی تفصیل اختصار کے پیش نظر قلم انداز کر دی گئی ہے۔

۱۔ نظریۂ پاکستان اور اس کے تقاضے

سرزمین پاکستان کے لئے اقامتِ دین ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں دین کو بحیثیت مجموعی نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ انفرادی مساعی کافی نہیں ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے متحدہ ہندوستان میں سے پاکستان کے نام کا ایک الگ خطۂ زمین کاٹ کر حاصل کرنے کے لئے جو لڑائی لڑی تھی وہ تمام دنیا کے سامنے ڈنکے کی چوٹ یہ کہہ کر لڑی تھی کہ ہم ایک جداگانہ تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم ہیں۔ متحدہ ہندوستان میں غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ایک مشترک نظام زندگی ہم نہیں بنا سکتے۔ ہمیں اپنے نظام زندگی کے مطابق کام کرنے کے لئے ایک علاقہ چاہیئے۔ جہاں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن اور اور اپنے قوانین حیات کے مطابق کام کر سکیں۔ اب ایک سخت لڑائی لڑنے کے بعد جب وہ پاکستان ہمیں حاصل ہو گیا جس کے لئے ہم نے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے تو یہ ایک عجیب حرکت ہو گی کہ ہم یہاں اسی تہذیب و تمدن اور نظام زندگی سے منہ موڑ لیں جس کا ہم نے نام لیا تھا۔ اور وہی سب کچھ کرنا شروع کر دیں جو متحدہ ہندوستان میں بھی بآسانی کیا جا سکتا تھا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمام دنیا کے سامنے اپنے آپ کو ایک جھوٹی اور مکار قسم کی قوم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ آخر دنیا یہ نہ کہے گی کہ یہ عجیب قوم ہے کہ جس مقصد کا نام لیکر یہ لڑائی لڑی تھی، اُس میں کامیاب ہو کر اسی مقصد کو فراموش کر بیٹھی اور جو کام وہ لڑے بغیر کر

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سکتی تھی وہی اس نے جان و مال اور آبرو کے بے شمار نقصانات اٹھانے کے بعد کرنا شروع کر دیا۔

۲۔ پاکستان کے بقاء و استحکام کے لئے اقامتِ دین کی اوّلین ضرورت و اہمیت یہ ہے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اگر ایک مسلمان قوم کا نظریہ اسلامی نہ ہو تو اور کیا ہو سکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ ہمارے خیالات اسلامی ہوں۔ ہمارے سوچنے کا انداز اسلامی ہو۔ معاملات پر ہم اسلامی نقطۂ نظر ہی سے نگاہ ڈالیں۔ اپنی تہذیب و تمدّن سیاست و معیشت اور اپنے پورے نظامِ زندگی کو اسلام کے طریقے پر چلائیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو آخر کس بناء پر ہم اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے حق دار ہو سکتے ہیں۔ مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی کرنا اور پھر اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں کسی غیر اسلامی نظریہ پر کام بھی کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ یا تو ہم منافق ہیں اور دل سے مسلمان نہیں ہیں۔ یا پھر ہم جاہل ہیں اور اتنا شعور بھی نہیں رکھتے کہ مسلمان ہونے کے کم سے کم تقاضے کیا ہیں۔

۳۔ تیسری چیز اس سلسلہ میں یہ ہے کہ پاکستان مختلف عناصر سے مرکّب ہے اور جن عناصر سے یہ مرکّب ہے اُن کے درمیان آج تک اپنی جداگانہ خصوصیات نمایاں طور پر موجود ہیں۔ ان کے اندر حقیقت میں کوئی ایسا امتزاج نہیں ہو سکا ہے جو ان عناصر کو بالکل یک جان اور یک رنگ کر چکا ہو۔ ان کی زبانیں مختلف ہیں۔ لباس، عادات، طرزِ معاشرت مختلف ہے۔ نسلیں مختلف ہیں۔ ایک بڑی حد تک ان کے مفاد بھی نہ صرف مختلف بلکہ متصادم ہیں۔ ان کے اندر جدا جدا ہونے کا احساس نہ صرف موجود ہے بلکہ زندہ اور متحرک ہے اور ایک ذرا سے اشارے پر بہ آسانی اُبھر آتا ہے۔ سب سے زیادہ یہ کہ پاکستان جغرافیائی حیثیت سے ایک وطن بھی نہیں ہے ان مختلف اجزاء کو جوڑنے والی طاقت صرف اسلامی نظریہ ہے۔ یہ طاقت کسی وقت بھی کمزور پڑ جائے تو اس کے حصے بخرے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

۴۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ مشرقی پاکستان جو مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھا اسی رشتۂ اتحاد کے کمزور پڑنے سے ۱۹۷۱ء میں ہم سے الگ ہو گیا اور اس کو دوبارہ جوڑنے کا کوئی ذریعہ بظاہر نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں حصّے الگ الگ تھے۔ ان میں بسنے والی قومیں ایک دوسری سے بالکل الگ الگ تھیں۔ ان کی زبان طرزِ معاشرت تہذیب ثقافت ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ دونوں کے درمیان وجہ اتصال اور ذریعۂ اتحاد صرف یہ نظریہ تھا کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مسلمان ہندوؤں سے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

الگ ایک قوم ہے جس کی اپنی ایک تہذیب ہے اور جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتی اسی کا نام نظریۂ پاکستان ہے اور یہی نظریہ پاکستان کا موجب بنا۔

۵۔ بدقسمتی سے مشرقی و مغربی پاکستان کے مسلمانوں کو نظریۂ پاکستان سے آگاہ نہیں کیا گیا۔ خصوصاً مشرقی پاکستان میں ہندو اساتذہ کے ذریعہ سے اس نظریہ کو مسلم نونہالوں کے ذہنوں سے بالکل نکال دیا گیا۔ چنانچہ ہندوؤں نے مغربی پاکستان سے علیٰحدگی کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں نے جو نظریۂ پاکستان کو فراموش کر چکے تھے ان کا ساتھ دیا۔ اس کے نتیجہ میں تقریباً نصف ملک جس کی آبادی مغربی پاکستان سے بھی زیادہ تھی کٹ کر الگ ہو گیا اس لئے کہ پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے والی قوت سوائے اسلام کے کوئی نہیں۔ محض سیاسی نظام کی وحدت کوئی چیز نہیں کیا اسی طرح کی وحدت آسٹریا اور ہنگری میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت عثمانی سلطنت میں نہ تھی؟ کیا اسی طرح کی وحدت برٹش ایمپائر میں نہ تھی؟ اس وحدت کے بل پر مختلف الجنس عناصر کو ایک "بنیان مرصوص" نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے لئے زبان کی وحدت مدد گار ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا یہاں کوئی امکان نہیں۔ اب سوائے ایک عقیدے اور دین کی وحدت اور اصول اخلاق و تہذیب کی وحدت کے اور کیا چیز ہے جو پاکستان کے مختلف عناصر کو جوڑ کر رکھ سکتی ہو؟

۶۔ بدقسمتی سے علیٰحدگی کے یہ رجحانات مشرقی پاکستان کی جدائی کے ساتھ ختم نہیں ہو گئے بخلاف ازیں مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی بے دین عناصر کے لئے زندہ مثال ہے اس امر کی کہ پاکستان کے باقی صوبے بھی کیوں نہ اتحاد کے بندھنوں سے آزاد ہو جائیں۔ جب کہ مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی کے جو اسباب تھے وہ یہاں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں یہ سرگرمیاں پورے عروج پر ہیں۔ کہیں لسانی فتنہ کو ہوا دے کر علیٰحدگی کا جواز تلاش کیا جا رہا ہے تو کہیں پختونستان کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ اس ذہن کے لیڈر باہم صلاح مشورے کر رہے ہیں۔ تفرقہ پسندی کی یہ تحریکات بڑی سازگار فضا میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اس لئے کہ پاکستان کے مختلف و متضاد عناصر کو جوڑنے والی قوت یعنی نظریۂ پاکستان کے تحفظ و بقاء کے لئے کچھ نہیں کیا جا رہا۔

۷۔ سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ملک کی عظیم مسلم اکثریت جو دراصل پاکستان کی بانی ہے اور اس نظام سے بہتر دوسرا کوئی نظام نہیں ہے۔ جن لوگوں کا اصلی عقیدہ یہ نہیں ہے جو محض مسلمان گھرانوں میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے مسلمان بنے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے عقائد خیالات اور نظریات کے اعتبار سے غیر مسلم ہو چکے ہیں۔ ان کا معاملہ تو دوسرا ہے

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

وہ تو بلاشبہ یہی چاہیں گے کہ ہم اپنے ساتھ بس مسلمان کا نام لگائے رکھیں مگر کام کسی غیر اسلامی نظریہ پر کریں گے۔ لیکن ایسے لوگ آخر ہماری آبادی میں ہیں کتنے؟ بمشکل ان کا تناسب دس پانچ فی لاکھ ہوگا۔ آخر عقل و منطق یا جمہوریت کے کس قاعدے سے اس چھوٹی سی اقلیت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ یہاں کوئی نظام زندگی اس کے نظریات کے مطابق اختیار کیا جائے۔

۸۔ اس میں شک نہیں کہ بے دین اور بے عمل لوگوں کی یہی چھوٹی سی اقلیت ہمارے ہاں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہی ہے۔ لیکن یہ حالت خواہ کتنی ہی پریشان کن ہو بہرحال اسے کوئی حقیقی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے کہ ملک میں ایسی اقلیت کے برسر اقتدار ہونے کی حیثیت ایک اجنبی قوم کے برسر اقتدار ہونے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ انگریز بھی جب اس ملک پر حکومت کر رہا تھا تو اس کے کارکنوں کی تعداد اس ملک میں اس سے زیادہ نہ تھی۔ اگر وہ اجنبی اقتدار یہاں مستحکم نہ ہو سکا تو یہ اجنبی اقتدار یہاں کیسے مسلط رہے گا۔ پاکستان کے باشندوں کی عظیم اکثریت کے جذبات و احساسات اس چھوٹی سی اقلیت کے منصوبوں سے ہمیشہ متصادم ہوتے رہیں گے۔ تصادم کی وجہ سے یہ ملک ایک انچ بھی ترقی کے راستے پر آگے نہ بڑھ سکے گا۔ بلکہ جو کچھ پہلے کا بنا ہوا ہے وہ بھی بگڑتا چلا جائے گا۔ قوم کا دلی تعاون جس طرح بدیسی اجنبیوں کو کبھی حاصل نہ ہو سکا اسی طرح ان دیسی اجنبیوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہو سکے گا۔

۹۔ ان ہم وطن اجنبیوں کی حیثیت بالکل ایسی ہی رہے گی جیسے کوئی شخص ایک ایسے گھوڑے پر سوار ہو جو اسے سواری نہ دینا چاہتا ہو اور سواری اور سوار میں مسلسل کشمکش جاری رہے۔ اس حالت میں کسی نظریہ کے مطابق بھی ہماری زندگی کا کوئی مسئلہ حل نہ ہو سکے گا۔ نہ اسلامی نظریہ کے مطابق اور نہ غیر اسلامی نظریہ کے مطابق۔ جو کچھ حکمران چاہیں گے قوم کا عدم تعاون اس کو چلنے نہ دے گا۔ جو کچھ قوم بنانا چاہے گی حکمرانوں کی جبری اور بعض حالات میں مسلح مزاحمت اس کو نہ چلنے دے گی۔ اس کشمکش کو کسی کا جی چاہے تو جب تک چاہے طول دیتا رہے۔ آخر کار پاکستان کی تعمیر کے لئے اگر کوئی کام ہو سکے گا تو اسی وقت ہو سکے گا جب کہ قوم اور اس کے حکمرانوں کا مقصد ایک ہو اور وہ اسلام اور صرف اسلام ہی ہو۔

(غلام محمد حریری عفی عنہ)
ڈی۔ پیپلز کالونی فیصل آباد
۱۰ فروری ۱۹۸۷ء

17254
محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

www.KitaboSunnat.com

سوالات متعلقہ باب پنجم

(۱) اسلام کے تصورِ معیشت پر ایک مقالہ قلمبند کیجئے۔

(۲) اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں کیا ہیں تفصیلاً تحریر کیجئے۔

(۳) کفالت عامہ سے کیا مراد ہے۔ دلائل کی روشنی میں تحریر کیجئے۔

(۴) اسلامی ریاست کی ضرورت و اہمیت پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردِ قلم کیجئے۔

(۵) اسلام کے اصول حکمرانی دوسری حکومتوں سے کس حد تک مختلف ہیں تفصیلاً لکھئے۔

(۶) قیام پاکستان کے محرکات کیا تھے تفصیلاً لکھئے۔

(۷) تحریک پاکستان کی مختصر تاریخ بیان کیجئے۔

(۸) نظریۂ پاکستان اور اس کے تقاضے کیا ہیں مفصل لکھئے۔

---

www.KitaboSunnat.com

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کریگا اس سے وہ دین ہرگز قبول کیا جائیگا

پولیمر سلیکیشنز اُردو بازار۔ لاہور فون: ۵۸۶۶۶